KHAWATEEN KE AFSAANON MEIN TANEEESI TA
KA TANQEEDI TAJZIYA

THESIS

Submitted In Partial Fulfillment of

Award of the Degree of

Doctor of Philosophy

In Urdu

By

SHAZIA TAMKEEN

Enrollment No. 15-01-01-01-04 (

Under The Supervision of

Prof. ABUL KALAM

Department of Urdu

School of Languages, Linguistics

MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERS

Gachibowli, Hyderabad - 500032

DECLARATION

I, do, hereby, declare that this "KHAWATEEN KE th
AFSAANON MEIN TANEESI TASAWWURAAT KA
TAJZIYA" an original research carried out
been published or submitted to any other
any Degree/Diploma.

Research Scholar

Place: Hyderabad Enrolment N

Date: .... Roll No. A1

CERTIFICATE

This is to certify that the thesis entitled **"KHAWATEEN KE AFSAANON MEI[N] TANEESI TASAWWURAAT KA TANQEEDI TAJZIYA"** submitted for the award of the degree of Doctor of Philosophy (Ph.D.) i[n] ... Languages, Linguistics & Indology, **Maulana Azad National Urdu** ... **Hyderabad**, is the result of an original research ... **Ms. SHAZIA TAMKEEN**, Enrolment No **15-01-01-01-04 (A160889)**, under my supervision ... best of my knowledge and belies, the work embo... dissertation/thesis/project already submitted ... Degree/Diploma.

1: ....

Research Supervisor

(Prof. Abul Kalam) **Prof. Shamsul Hoda Dar(y...**

Dept. of Urdu, MANUU

3: ....

Dean

(Prof. Aziz Bano)

School of Languages, Linguistics and ...

MANUU, Hyderabad

Place: Hyderabad

Date: ....

فہرست ابواب

☆ پیش لفظ 4

☆ اظہار تشکر 6

باب اوّل: تانیثیت 8 - 48

1) تانیثیت: تعریف معنی و مفہوم 10

2) تانیثیت کے اہم موڑ 17

3) تانیثی تنقید 33

☆ حوالہ جات 47

باب دوم: عورت: ایک نظری پس منظر 49 - 101

1) ہندوستان میں عورت کا تصور اور مقام 51

2) مذہب اسلام میں عورت کا تصور اور مقام 67

3) ہندوستانی آئین اور اس کے تحت رو بہ عمل اسکیمیں (حقوقِ نسواں) 83

☆ حوالہ جات 100

باب سوم: مرد اور عورت کے مابین مختلف سطوح پر افتراقات اور اشتراکات 102 - 173

1) حیاتیات 105

2) نفسیات 116

3) معاشرت 138

4) معیشت 160

☆ حوالہ جات 172

باب چہارم: خواتین کے افسانوں میں تانیثی تصورات کا موضوعاتی تنقیدی تجزیہ 174 - 267

1) عورت اور معاشرت 178

2) عورت اور مذہب 189
3) عورت اور ہندوستانی قانون 200
4) عورت اور تعلیم 210
5) عورت اور معیشت 220
6) عورت اور سیاست 231
7) عورت اور صحت 238
8) خواتین انجمنیں 246
9) تانیثیت کے زیر اثر بے راہ رو عورت 251
☆ حوالہ جات 263

باب پنجم: خواتین کے افسانوں میں تانیثی تصورات کا فنی تنقیدی تجزیہ 268 - 365
1) پلاٹ 270
2) کردار نگاری 286
3) زماں و مکاں اور آفاقیت 301
4) تکنیک 315
5) عنوان اور نقطۂ نظر میں رشتہ 331
6) زبان و بیان 345
☆ حوالہ جات 361

☆ **حاصل مطالعہ** 366

☆ حواشی 381
☆ اشاریہ 383
☆ کتابیات 388

تلخیص

خواتین کے افسانوں میں تانیثی تصوّرات کا تنقیدی تجزیہ

مقالہ نگار

شاذیہ تمکین

اندراج نمبر: 15-01-01-04 (A160889)

نگراں

پروفیسر ابوالکلام

شعبۂ اردو

اسکول برائے السنہ، لسانیات اور ہندوستانیات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد 500032

تلخیص

موجود دُنیا کی معنویت ذاتِ انسان کی موجودگی پر منحصر ہے۔ یہی انسان دو اصناف یعنی مرد اور عورت میں منقسم ہے۔ دُنیا کا نظام ایسا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے نہ ہونے سے دُنیا کا حُسن درہم برہم ہو جائے گا۔ دونوں اپنے منفرد وجود کے باعث مختلف فطری قوانین و فرائض کے دائرے میں سرگرداں رہتے ہیں۔ دونوں کا وجود بنی نوع انسان کی بقا کے لیے ناگزیر ہے۔ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود اور اس کی تکمیل ناممکن ہے۔

مگر جب ہم انسانی تاریخ پر پڑے دبیز پردے کو ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں تو اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ عورت کے تئیں ناانصافی ہر دور میں ہوتی رہی ہے اور مرد نے ہمیشہ انہیں بنیادی حقوق سے نابلد رکھا ہے اور زیادہ تر اس کا استعمال اپنے مفاد کی خاطر کیا ہے۔ پدرسری نظام میں ہر طبقے، علاقے اور مذہب میں مردوں کے مقابلے عورتوں کی حیثیت ہمیشہ حاشیائی رہی ہے۔ بظاہر خانگی معاملات میں مرد نے اس کی اہمیت کو بادلِ ناخواستہ قبول کیا ہے، لیکن دیگر معاملات چاہے وہ معاشی ہوں کہ سیاسی، سماجی ہوں یا تہذیبی، خواتین ہمیشہ دوسرے درجے پر رہی ہیں۔

سیمون دی بوا کا نظریہ یہ ہے کہ دورِ قدیم کے مردوں کو وحشی جانوروں سے اپنے گروہ کو بچانے کے لیے کافی جدوجہد کرنی پڑتی تھی، مختلف خطرات کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اس کام میں عورت کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کے اسی عمل نے مرد کو حیوانی سطح سے بلند کر دیا۔ پیدا کرنے والی جنس یعنی عورت ایک جانور کے مانند اپنے جسم ہی میں بند رہی۔ انسانی زندگی کو لاحق مختلف خطرات سے تحفظ کے باعث مرد نے عورت پر اختیار حاصل کر لیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ استحصال کے طریقے بھی بدلتے گئے۔ کبھی اپنی انا کی خاطر اسے زندہ درگور کیا تو کبھی اپنی جنسی تسکین کے لیے اسے دیوداسی بنایا، کبھی اسے اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ ستی ہونا پڑا تو کبھی مرد کی رنگین مزاجی کے سبب اسے رقاصہ بننا پڑا۔ عورت کے ساتھ مرد کے وحشیانہ سلوک کی داستان کافی طویل اور خون آلود ہے۔ پتاح حوتپ (Patahhotep)، جسے دنیا کا سب سے پہلا معلمِ اخلاق کہا جاتا ہے، اپنی کتاب "The Maxims of Patahhotep" پدرسری خاندان کی صراحت کرتے ہوئے اب سے ساڑھے چار ہزار برس پہلے دولتمند مردوں کو بیٹا حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے، صاحبِ حیثیت مرد کو اپنا گھر بنانے اور گھر میں اپنی بیوی کو محبت کرنے کا درس دیتا ہے، جس کی وہ مستحق ہے، کیونکہ وہ اپنے مالک کے لیے سودمند زمین (کھیتی) ہوتی ہے۔

مختلف معاشرتی عناصر مثلاً بچوں کو بہلانے والی لوریاں، زندگی کو منظّم بنانے والی تعلیم، زندگی کو معنی فراہم کرنے والے رشتے، دنیا کی خوبصورتی سے محظوظ ہونے کے لیے تندرست صحت، اپنی عصبیت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنائے گئے جرائم وغیرہ کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی اگر عورت کی حالت کا جائزہ لیا جائے تو وہاں بھی عورتوں کی زندگی دگرگوں نظر آئے گی۔ کہیں کہیں جرائم کے زُمرے میں مرد بھی خواتین کی انتہا پسندی اور ان کی شاطرانہ چال کا شکار نظر آتے ہیں۔ مگر عورتوں کے دگرگوں حالات باشعور ذہن کو غور و فکر کرنے پر آمادہ کرتے ہیں جس کا نتیجہ ہے کہ آج حالات کچھ بہتر ہو رہے ہیں۔

اگر اس پدر شاہی نظام پر غور کریں تو شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ مرد اور عورت کے عضویاتی نظام کو بنیاد پر مردوں کے ہاں احساس برتری پایا جاتا ہے۔ مرد اور عورت میں موجود عضویاتی اشتراک کی پہلو پر بات کریں تو اندرونی اور بیرونی جسمانی اعضا زیادہ تر ایسے ملیں گے جن میں بجز کوئی فرق نہیں پایا جاتا بجز تولیدی نظام کے۔ ان دونوں کے تولیدی نظام تکمیلی ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ دیگر حصّوں میں جو بھی فرق دکھائی دیتا ہے اس کی نوعیت اس طرح کی ہے کہ اسے بنیاد بنا کر کسی کو کمتر یا کسی کو برتر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ مرد اور عورت کے تولیدی نظام اپنی منفرد خاصیت کے ساتھ ہیں جو دونوں کو جنسی اعتبار سے ایک دوسرے سے الگ ضرور کرتے ہیں مگر یہ انفرادیت کمتر یا برتر کے زمرے میں رکھ کر نہیں دیکھی جا سکتی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔ جتنی ساری صفتیں عورت کو عورت بناتی ہیں انہیں ہی بنیاد بنا کر اسے کمزور ثابت کیا جاتا ہے۔ عورت کے وجود سے وابستہ یہ خصائص اس کی کمزوری کو نہیں بلکہ اس کی انفرادیت اور طاقت کو ظاہر کرتے ہیں۔

دونوں جنسوں کے تئیں برتے جانے والے امتیازی سلوک ان معاشرتی رویوں کی پیداوار ہیں جو عام طور پر دونوں جنسوں کی ذات کے ساتھ منسلک کر دیے گیے ہیں۔ ان امتیازات کے پیچھے نہ کوئی حیاتیاتی، نہ نفسیاتی اور نہ ہی مذہبی منطق موجود ہے۔ جس برتر اور کمتر نفسیات کا ذکر زبان زد عام ہے وہ اسی معاشرے کے پیدا کردہ ہیں نہ کہ خداداد۔ معاشرہ دونوں کے بارے میں مخصوص انداز سے سوچتا ہے۔ آدمی تو پیدا ہوتا ہے انسان بننے کے لئے مگر معاشرتی رویے کی کاریگری جس طرح اسے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی بناتی ہے اسی طرح اسے مرد اور عورت کی حیثیت سے پہچان دیتی ہے، جنس کے اعتبار سے زندگی جینے کے طور طریقے سکھائے جاتے ہیں اور انہیں یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ انہیں مرد کی طرح جینا ہے یا عورت کی طرح۔ اس طرز زندگی میں سیکھنے والے کی مرضی جاننے کا کوئی تصور ہی نہیں پایا جاتا، انہی طریقوں پر انسان مرتے دم تک چلتا رہتا ہے۔ یہی طریقے مرد کو مردانہ اور عورت کو عورتانہ اوصاف سے مزیّن کرتے ہیں۔ بچپن سے ایسی تربیت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ براہِ راست سبق پڑھانے والوں میں ہمارے والدین، بہن، بھائی، گھر کے دیگر رشتہ دار پھر گھر سے باہر دوست آشنا اور تعلیمی اداروں میں اساتذہ اہم رول ادا کرتے ہیں، پھر سوشل میڈیا، ٹیلیوژن، ریڈیو، کتابوں، اخباروں، رسالوں میں نشر ہونے والے یا تحریر کیے جانے والے مواد کے ذریعہ انسان کی نفسیاتی ذہن سازی کی جاتی ہے۔ ایسے انسان سیکھتا ہے کہ اسے مرد بنے رہنے اور عورت بنے رہنے کے لیے کس کس طرح کے اوصاف کا حامل ہونا چاہیے۔ مرد مردانہ رویئوں سے ہمکنار ہوتا ہے، مثلاً بہادر، حوصلہ مند، محنتی، فولادی طبیعت رکھنے والا، مضبوط ارادوں کا حامل، حکومت کا جذبہ رکھنے والا، اپنے گھر کی کفالت کرنے والا، اپنے بیوی بچوں، ماں باپ، بھائی بہنوں کا محافظ، خود اعتماد وغیرہ اور عورتوں میں عورتانہ احساس پیدا کیے جاتے ہیں مثلاً جذباتی، حساس، محبت کرنے والی، قربانیاں دینے والی، دوسروں کی خدمت کا جذبہ رکھنے والی، حالات کے ساتھ مطابقت کرنے والی، جاں نثاری کے جذبے سے لیس، دکھ جھیلنے والی محکومیت کی فطرت سے معمور، سگھڑ، کفایت شعار، شوہر کی فرمابردار، محنتی، جفاکش وغیرہ۔ سیمون دی بوا عورت کے متعلق کہتی ہیں کہ وہ پیدا نہیں ہوتی بنا دی جاتی ہے۔ آدمی اپنی انفرادیت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے جبکہ معاشرہ اسے اپنے رائج طریقوں کی بنیاد پر کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔

قدیم دور جہالت کا دور تھا۔ مرد نے اپنے زورِ بازو سے خاتون کو انسانیت کے زمرے سے خارج کر دیا۔ مگر جوں جوں زمانہ ارتقاء کے مدارج طے کرتا گیا جہالت و تاریکی دور ہوتی گئی۔ سائنسی و صنعتی انقلابات نے معاشرے کو بدل کر رکھ دیا نتیجے میں مرد کے ساتھ ساتھ عورت بھی روشن خیال ہونے لگی۔ علم کی روشنی نے آنکھ پر بندھی روایتی اقدار کی پٹی کھول کر نئی قدروں سے انسان کو واقف

کروایا۔ نتیجتاً آزادی، مساوات، انصاف، صنفی برابری اور عورتوں کے حقوق کی صدائیں بلند ہوئیں۔ مردانہ بالادستی والے سماج میں صدیوں پر محیط ظلم و تشدد کے ردِّعمل کے طور پر تانیثیت کا تصور وجود میں آیا۔

تانیثیت (feminism) انیسویں صدی میں ابھرنے والا اہم سیاسی، سماجی اور ادبی رجحان ہے۔ حقوقِ نسواں کی تحریک کے تحت اٹھنے والے مطالبات سے اس تحریک کا آغاز ہوا۔ فیمنسٹ نظریات تو پہلے سے موجود تھے مگر فیمنزم کی اصطلاح بعد میں سامنے آئی۔ یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے مخصوص معنی متعین نہیں کیے جاسکتے۔ ملک، تہذیب، مذہب، ذات اور طبقہ کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اس کی تعریف بھی بدل جاتی ہے۔ مرد حاوی معاشرے کی شکار عورتوں کی زندگی سے وابستہ مختلف امور کا انسلاک اس لفظ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس کی کوئی ایک تعریف متعین نہیں کی جاسکتی اس لیے تانیثیت متعدد تعریفوں کا مجموعہ ہے۔

Sociologydictionary.o میں لفظ فیمنزم کی اس طرح تعریف پیش کی گئی ہے:

1-The idea that women and men should have equal ri
and self determination.

۱-تانیثیت ایک ایسا نظریہ ہے جس کی رو سے عورتوں اور مردوں کو یکساں حقوق، جنسی آزادی اور خودارادیت ملنی چاہیے۔

2-A social movement that advocates for economic, pc
between women and men.

۲-تانیثیت ایک ایسی سماجی تحریک ہے جو مردوں یا عورتوں کے درمیان معاشی، سیاسی اور سماجی مساوات کی وکالت کرتی ہے۔

3-A theoritical perspective stating women are uni
oppressed and that challenges the idea of gender a

۳-تانیثیت ایک نظریاتی پس منظر ہے جو یہ بیان کرتا ہے کہ عورت انوکھے اور منظم طریقے سے مظلوم ہے اور جو صنفی اور جنسی رول کے تصور کو چیلنج کرتا ہے۔

معاشرے میں عورت کی محکومانہ حیثیت کا احساس ہی فیمنزم کی تاریخ ہے جس کی ابتدا انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سطوت ریحانہ صاحبہ تحریکِ آزادیٔ نسواں کی ابتداء John Locke کے تحت کے نظریات کی تفصیل کے بیان میں لکھتی ہیں: یورپ میں تحریکِ آزادیٔ نسواں کا نقطۂ آغاز فرانسیسی ماہرِ قانون خاتون Christine De Pizan (1365-1430) کی تحریروں کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس نے نہ صرف اپنی تحریروں کے ذریعہ حقوق نسواں کی بحالی کے لیے جدوجہد کی بلکہ اس سلسلہ میں باضابطہ مباحثے کے ذریعے رائے عامّہ کو ہموار کرنے کی کوشش کی۔ مذکورہ مباحثوں کو فرانس کی تحریکِ آزادیٔ نسواں کی تاریخ میں Querelle des femmes کے نام سے شہرت ملی۔ ان مباحثوں کا بنیادی محور حقوق نسواں کو فلسفیانہ اساس فراہم کرنا تھا۔

مگر میری وول اسٹون کرافٹ (Mary Wollstonecraft) انگلینڈ کی پہلی خاتون ہیں جنھوں نے اٹھارویں صدی میں خواتین کے مسائل کے بارے میں لکھنا شروع کیا۔ 1792ء میں ان کی کتاب A Vindication Of The Rights of Women شائع ہوئی۔

کوئی باقاعدہ تنظیم نہ ہونے کی وجہ سے یہ تحریریں زیادہ کارگر ثابت نہیں ہو پائیں۔اس سلسلے کی باضابطہ شروعات انیسویں صدی کے آخری حصّے میں ہوئی۔مغربی ادب میں تانیثیتی تحریک کی دوسری علمبردار ورجینیا وولف (Virginia Woolf) ہیں جن کی کتاب "A Room of One's Own" 1929ء میں شائع ہوئی۔تانیثیت کی تیسری بڑی معتبر آواز سیمون دی بووا (Semon De Beauvoir) ہیں جن کی کتاب The Second Sex (1949ء) کو ایک منفرد اور باغیانہ تحریر کا درجہ ملا اور جسے تانیثیتی تنقید کا بائبل بھی کہا جاتا ہے۔یہی وہ کتابیں ہیں جو تانیثیتی تحریک کے وجود میں آنے کا سبب بنیں۔اس کے بعد کیٹ ملیٹ (Kate Millett) کی کتاب Sexual Politics مطبوعہ 1969ء اور ایلین شوالٹر (Elaine Showalter) کی کتاب A Literature of Their Own مطبوعہ 1977ء تانیثیت کی تفہیم اور فروغ میں سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔اس طرح تانیثیتی رجحان کا دائرہ دھیرے دھیرے وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔اس کا عین مقصد خاتون کو ظلم و زیادتی سے نجات دلا کر سماج میں ایک معتبر زندگی سے ہمکنار کرنا اور اس کو اس کے تمام حقوق فراہم کرانا ہے۔

اس طرح مختلف رجحانات اور تحریکات کے مانند اس رجحان نے بھی ادب کو بے حد متاثر کیا۔چاہے وہ عالمی ادب ہو یا ہندوستانی ادب اس کی گونج ہر طرف سنائی دینے لگی۔تانیثیتی نقطۂ نظر سے جب ہم اردو ادب کو پرکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نظم کے مقابلے نثر میں اس تحریک کے عناصر زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کیے گیے ہیں۔خصوصاً اردو کے افسانوی ادب پر اس کے اثرات بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں لاشعوری طور پر کہیں کہیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔یہ دور ایسا دور تھا جس میں رومانی تحریک کے پہلو بہ پہلو حقیقت نگاری کی تحریک کے زیرِ اثر بھی ادب تخلیق کیا جارہا تھا۔بیسویں صدی میں اس کا واضح عکس پریم چند، سدرشن، اعظم کریوی، علی عبّاس حسینی وغیرہ کی تحریروں میں صاف جھلکتا ہے۔برِّ صغیر کے روایتی معاشرے میں جہاں خاتون کو اظہار کی کوئی آزادی نہیں تھی، اس کے باوجود بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ادب کی جس صنف نے خواتین کو اظہارِ خیال کے مواقع فراہم کیے اور مرد ادیبوں کے مقابل قابلِ قدر ادبی سرمایہ اکٹھا کرنے کا ذریعہ بنا، وہ افسانہ ہے۔شروع سے لے کر اب تک کئی خواتین نے اپنے افسانوں کے ذریعہ مرد حاوی روایت کے خلاف عورتوں کے اندر پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو موضوع کے طور پر اپنایا ہے۔ایسے سیکڑوں افسانے ملتے ہیں جن میں عورت کے اندر اپنے حقوق کے تئیں پنپنے والے احتجاجی لہجوں کو آواز فراہم کی گئی ہے۔

خواتین کے افسانوں میں تانیثی تصورات کا موضوعاتی اور فنّی تنقیدی تجزیہ میرے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے کا موضوع ہے۔مذکورہ مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلے اور دوسرے باب میں تین ذیلی ابواب ہیں۔''تانیثیت'' عنوان کے تحت پہلے باب میں تانیثیت: تعریف معنی و مفہوم، تانیثیت کے اہم موڑ اور تانیثی تنقید پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔''عورت: ایک نظری پس منظر'' عنوان کے تحت دوسرے باب میں ہندوستان میں عورت کا تصوّر اور مقام، مذہبِ اسلام میں عورت کا تصور اور مقام اور ہندوستانی آئین اور اس کے تحت روبہ عمل اسکیمیں (حقوقِ نسواں) پر جامع گفتگو کی گئی ہے۔''مرد اور عورت کے مابین مختلف سطوح پر افتراقات اور اشراکات'' عنوان کے تحت تیسرا باب چار ذیلی ابواب، حیاتیات، نفسیات، معاشرت اور معیشت پر مشتمل ہے۔

چوتھے اور پانچویں باب میں خواتین کے افسانوں کا تانیثی تصورات کے تحت موضوعاتی اور فنّی تنقیدی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔چوتھے باب کے ذیلی عنوانات اس طرح ہیں، عورت اور معاشرت، عورت اور مذہب، عورت اور ہندوستانی قانون، عورت اور تعلیم، عورت اور معیشت، عورت اور سیاست، عورت اور صحت، خواتین انجمنیں، تانیثیت کے زیرِ اثر بے راہ رو عورت۔جن میں ان موضوعات کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کے تحت خواتین کے افسانے شامل کیے گئے ہیں اور ایسے افسانوں کا انتخاب کیا گیا ہے جن

میں ان موضوعات سے متعلق نظریات کو ہی بنیاد بنا کر اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی ہے۔ پانچویں باب کے ذیلی عنوانات اس طرح ہیں؛ پلاٹ نگاری، کردار نگاری، زماں و مکاں اور آفاقیت، تکنیک، زبان و بیان اور عنوان اور نقطۂ نظر میں رشتہ۔ اس باب میں بھی ایسے افسانوں کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں تانیثی تصورات کے تحت مندرجہ بالا فنون کے عمدہ اور بہترین نقوش ملتے ہیں۔

شروع سے اب تک تانیثی تصورات پر مبنی خواتین کے افسانے لاتعداد ہیں۔ اس مقالے میں سبھی افسانہ نگاروں کو یا سبھی افسانوں کو شامل کرنا ناممکن ہے، اس لیے مقالے کے تقاضوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے کل 4 9 افسانہ نگاروں کو شامل کیا گیا ہے۔ موضوع کے تحت کل 7 7 افسانے اور فن کے تحت کل 6 3 افسانے زیر بحث لائے گئے ہیں۔ جتنے افسانوی مجموعے مجھے ملے ہیں ان تمام کو میں نے پڑھا ہے، ایسے افسانے کم ہی ملے جن میں تانیثی تصورات کو مدنظر رکھتے ہوئے ''سیاست'' اور ''خواتین انجمنیں'' موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہو۔ اس لیے ان دو عناوین کے تحت صرف چار چار افسانوں کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مقالے کا ایک ذیلی باب ''صحافت اور خاتون'' بھی تھا، لیکن مجھے ایسا کوئی افسانہ نہیں ملا جس میں اس پیشے کے تحت خواتین کے حقوق کے تئیں کوئی کارنامہ انجام دیا گیا ہو، سوشل میڈیا، پرنٹ میڈیا یا ٹیلی ویژن کے استعمال سے خواتین پر ہو رہے ظلم کے خلاف آواز بلند کی گئی ہو یا پھر خواتین کردار ایسی ہوں جنھوں نے بحیثیت صحافی خواتین کے حق کی لڑائی لڑی ہو۔ دو ایک افسانے ایسے ملے جن میں صحافت کا ذکر تو ملتا ہے لیکن اس طرح سے نہیں مثلاً غزال ضیغم کا ایک افسانہ ''سوریہ ونشی چندر ونشی'' کا مرکزی کردار روحی آل انڈیا اسٹوڈنٹ فیڈریشن کی لیڈر بن کر نظام سرمایہ داری کے خلاف اخبار میں مضامین لکھنا شروع کرتی ہے۔ بس اس کا ذکر دو تین جملوں تک ہی محدود ہے۔ شائستہ فاخری کا افسانہ ''خشک پتوں کی موسیقی'' کا مرکزی کردار حجاب درّانی صحافت کے پیشے سے منسلک رہی، یہاں صرف اس کی نوکری کے متعلق قاری کو ایک خبر دی گئی ہے، اس پیشے کو پلاٹ فارم بنا کر اس سے کوئی ایسا کام سرزد نہیں کروایا گیا جس میں خواتین کے حق کی لڑائی سے متعلق کوئی عناصر ملتے ہوں۔ آشا پربھات کا افسانہ ''ٹھیس'' کی سوما طلاق کے بعد صحافت کے کورس میں داخلہ لیتی ہے۔ ''صحافت'' موضوع کے تحت مذکورہ افسانے ایسے اہم نہیں لگے جن کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا جاتا۔ اس لیے اس ذیلی باب کو مقالے کی فہرست سے ہٹا دیا گیا۔ مستقبل قریب میں اگر ایسے افسانے ملتے ہیں تو انہیں اپنی کتاب میں ضرور شامل کروں گی۔

جن خواتین کے افسانوں کو چوتھے اور پانچویں باب میں شامل کیا گیا ہے ان کے نام اس طرح ہیں، صدیقہ بیگم، رشید جہاں، عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر، شائستہ اختر سہروردی، قرۃ العین حیدر، واجدہ تبسم، صالحہ عابد حسین، جیلانی بانو، قمر جمالی، رفیعہ منظور الامین، ذکیہ مشہدی، رفیعہ شبنم عابدی، مسرور جہاں، شمیم نکہت، رینو بہل، سلمیٰ صنم، نگار عظیم، ثروت خان، قمر جہاں، نعیمہ جعفری پاشا، افشاں ملک، تبسم فاطمہ، غزالہ قمر اعجاز، ترنم ریاض، بانو سرتاج، سیدہ نفیس بانو شمع، افروز سعیدہ، غزال ضیغم، کہکشاں پروین، صبیحہ انور، کہکشاں انجم، زنفر کھوکھر، شیخ طاہرہ عبدالشکور، انجم قدوائی، ثریا صولت حسین، شائستہ فاخری، صادقہ نواب سحر، زرین تاج، انور نزہت، قمر جہاں، انجم آرا انجم، کشور سلطانہ، ڈاکٹر اشرف جہاں، ڈاکٹر شائستہ انجم نوری، نسرین بانو، آشا پربھات، نکہت افلاک، نکہت پروین۔

اس کے بعد حاصل مطالعہ میں جملہ نتائج پیش کئے گئے ہیں۔ اس مقالے میں شامل سارے ابواب میں جن موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے ان سے متعلق نقاط نظر پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد اشاریہ پیش کیا گیا ہے۔ ہر باب کے آخر میں مذکورہ باب سے متعلق حوالہ جات پیش کیے گئے ہیں۔ آخر میں کتابیات درج کی گئی ہے۔ جس کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک بنیادی ماخذ جس میں خواتین کے افسانوی مجموعے درج کیے گئے ہیں، دوسرا ثانوی ماخذ جس میں ان تحقیقی و تنقیدی کتابوں کو درج کیا گیا ہے جن سے اس

مقالے کے لکھنے میں استفادہ کیا گیا ہے۔تیسرے حصّے میں ان انگریزی اور ہندی کتابوں کو درج کیا گیا ہے جو اس مقالے کے لکھنے میں معاون ثابت ہوئی ہیں۔اور آخری حصّے میں ان ویب سائٹس کو درج کیا گیا ہے جن میں درج مواد سے اس مقالے کی تحریر میں استفادہ کیا گیا ہے۔

اس مقالے کے پہلے، دوسرے اور تیسرے ابواب کے عناوین پر اوپر مختصر گفتگو ہو چکی ہے اب چوتھے اور پانچویں باب کے متعلق بات کرنے سے پہلے مختلف ادوار کے تحت خواتین افسانہ نگاروں کے ارتقائی سفر کا جائزہ لیتے ہیں۔ابتداء میں مرد افسانہ نگاروں کے شانہ بشانہ جب خواتین نے افسانہ لکھنے کی ابتداء کی تو ان کے سامنے ڈپٹی نذیر احمد کے اصلاحی ناول موجود تھے جن میں سے زیادہ تر ناولوں میں طبقۂ نسواں کے کسی نہ کسی مسئلے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ابتدائی افسانہ نگاران سے متاثر تھیں۔ابتداء میں افسانہ نگار خواتین نہ تو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں اور نہ ہی وسیع تر مطالعے اور مشاہدے کی حامل تھیں۔مغربی اور انگریزی ادب سے ان کی واقفیت نہ کے برابر تھی۔اس کے باوجود اردو افسانے کی ابتدائی نشو ونما میں ان خواتین افسانہ نگاروں کا حصّہ قابلِ تحسین ہے۔خورشید زہرا عابدی کے خیال میں اردو میں خواتین کی افسانہ نگاری کا آغاز ادب میں زندگی کی نئی حقیقتوں کی ترجمانی کا مظہر تھا۔اور وہ صغریٰ ہمایوں مرزا کو اردو کی پہلی خاتون افسانہ نگار مانتی ہیں۔

ان حقیقت اور اصلاح پسند خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں میں ایک طرف جہاں خاتون کی بے بسی، مجبوری اور اس کے استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے وہیں دوسری طرف اس کی تعلیم اور آزادی کے لیے نیز رجعت پسندی کے خلاف احتجاجی آواز بلند کی گئی ہے۔ان میں سے کسی کے ہاں موضوعات کا تنوع اور رنگا رنگی موجود ہے تو کسی کے افسانے زبان و بیان کے اعلیٰ معیار پر فائز نظر آتے ہیں۔کسی نے رسومِ باطلہ اور نئی تہذیب کی خرابیوں کو موضوع بنایا تو کسی نے اس نئی تہذیب کی خوبیوں سے اثر قبول کر تعلیم اور آزادی کی حمایت میں علم بلند کیا۔ان میں سے کئی افسانہ نگاروں نے روایت سے انحراف کر کے اپنی تحریروں میں جدّت و ندرت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ابتدائی خواتین افسانہ نگاروں مثلاً صغریٰ ہمایوں مرزا، عباسی بیگم، محمدی بیگم، طاہرہ دیوی شیرازی، نذر سجّاد حیدر، آصف جہاں، انجمن آراء، امت الوحی، خاتون اکرم، زبیدہ زری، آمنہ نازلی، شائستہ اختر سہروردی، رابعہ سلطان بیگم، خیر انساء بیگم، سیدۃ النساء، نسیم ایوب، زبیدہ سلطان، عزیز النساء وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جن کے افسانوں میں اپنے ہی سماج اور معاشرے کی حقیقت پسندانہ عکاسی نظر آتی ہے اور جنھوں نے افسانوی روایت کے ارتقا میں اپنی شمولیت کا لوہا منوایا ہے۔

افسانوی ادب میں رومانی تحریک کلاسکیت اور تعقل پسندی کے خلاف ایک ردّ عمل کہی جا سکتی ہے جو کلاسیکی روایت اور سر سید کی اصلاحی تحریک کے خلاف احتجاج کی شکل میں نمودار ہوئی۔1920ء میں اس نئی رومانی لہر کی اوّلین نمائندہ نسوانی آواز راحت آرا بیگم کے افسانوں کی صورت میں ظاہر ہوئی۔مگر خواتین افسانہ نگاروں میں مسز عبدالقادر اور حجاب امتیاز علی نے باقاعدہ اور باضابطہ طور پر رومانی طرزِ فکر کو افسانوی جامہ پہنایا۔ان دونوں افسانہ نگاروں نے رومان کے پر اسرار ماحول کے زیرِ سایہ سماج میں پنپتے ہوئے مختلف مسائل کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا جن کے زمرے میں خاتون کا مظلوم طبقہ اور اس کا ردِّ عمل بھی موجود تھا۔مگر عام طور پر انہوں نے ان ہی رجحانات اور موضوعات کو عملی شکل دی جو مرد ادیبوں کا تخلیقی شعار تھا۔

مگر جوں جوں وقت بدلتا رہا مختلف انقلابات رونما ہوتے رہے، خواتین کی تخلیق میں بھی فکری اور فنّی اعتبار سے نمایاں بدلاؤ آتے رہے۔ترقّی پسند تحریک نے خواتین افسانہ نگاروں کو عورت کے وجود کی شناخت کے تئیں جھنجوڑ کر رکھ دیا۔اپنی ذات کے عرفان

اور اپنی قابلیت کے اظہار کے نتیجے میں فیمنزم کے رجحان کی باقاعدہ شروعات ہوئی۔ لیکن جہاں تک اس رجحان کا تعلق 1932ء میں افسانوی مجموعہ ''انگارے'' کی اشاعت نے آئندہ کے لیے اس کی راہ ہموار کی۔ ''انگارے'' کی اشاعت کے بین السطور میں کوئی باقاعدہ تانیثیتی تحریک کا نصب العین تو موجود نہیں تھا مگر اس مجموعے کے بے باک، باغیانہ اور جذباتیت سے پُر افسانے آگے آنے والی تانیثیتی تخلیق کاروں کے لیے سنگِ میل ثابت ہوئے۔ اس مجموعے میں شامل افسانہ نگاروں میں رشید جہاں بھی تھیں جن کو معاشرے کے نام نہاد سماجی ٹھیکیداروں اور مولویوں کی روایتی شدّت پسندی اور طنز کا سب سے بڑا نشانہ بننا پڑا جبکہ ان کے افسانے ''دلّی کی سیر'' میں ایسی کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں تھی۔ مگر اصل وجہ یہ تھی کہ پہلی بار کسی مسلم خاتون نے ایک ایسا افسانہ لکھا تھا جس کے نسائی کردار نے مرد کی لاپرواہی اور بدنظری کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت کی تھی جو مرد حاوی معاشرے کو قبول نہیں تھا۔

تجریدی اور علامتی کہانیوں کا دور (1960 کے بعد) خواتین افسانہ نگاروں کو اپنے حلقے میں شامل کرنے میں اس حد تک کامیاب نہیں ہو پایا جس حد تک مرد لکھنے والوں کو اس نے متاثر کیا۔ اس لیے اس صف میں چند ہی خواتین افسانہ نگار کھڑی نظر آتی ہیں؛ مثلاً زاہدہ حنا، نزہت نوری، شمیم صادقہ، نزہت پروین وغیرہ۔ کہانیوں میں بیانیہ کی واپسی سے ترسیل وابلاغ میں آسانیاں پیدا ہوئیں۔ کہانی پن کی واپسی نے قاری کو ایک بار پھر اپنی طرف متوجّہ کیا۔ موضوع، ہیئت اور تکنیک کے ساتھ ساتھ مصنّف نے عام قاری کی سمجھ وشعور کی رسائی کا خیال رکھتے ہوئے اپنی کہانی کو پیش کیا 1980 کے بعد سے اب تک اچھی خاصی تعداد میں خواتین کے افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ان میں سے اکثر وبیشتر مجموعوں نے اپنی انفرادیت کے سبب دورِ حاضر کے بڑے بڑے نقّادوں کو اپنی طرف متوجّہ بھی کیا ہے۔ ان مجموعوں کے اکثر افسانوں میں دورِ حاضر کی عورت کو چیلنج کرتا سماج اور اپنے وجود کو منواتی عورت۔ پہلے کے افسانہ نگاروں میں بھی یہ موضوعات کثرت کے ساتھ ملتے ہیں مگر آج کی افسانہ نگاروں کا اندازِ پیشکش قدرِ مختلف ہے۔ احتجاج کی پُر زور آواز جس شدّت کے ساتھ آج کے افسانوں میں سُنائی دیتی ہے پہلے کے افسانوں میں ناپید تھی۔ مرورِ ایّام کے ساتھ ساتھ صنفی مسائل میں جو تبدیلیاں درآئیں آج کا افسانہ بڑی حد تک ان مسائل کی پیچیدگیوں اور ان کے ردِّعمل کا ترجمان نظر آتا ہے۔

خواتین کے افسانوں میں عورتوں کو درپیش معاشرتی مسائل اور ان کے خلاف خواتین کا جو ردّعمل پیش کیا گیا ہے ان میں واجدہ تبسم کا افسانہ ''آیا بسنت سکھی'' میں اپنے بھائی بہنوں کے مستقبل کو مرکز ومحور بنا کر اپنے ہی ارمانوں کے خلاف احتجاج کرنے والی رجّی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس افسانے میں رجّی بڑی ہمت اور حوصلے کے ساتھ اپنے اندرون سے لڑائی لڑ کر اپنے مقصد کو حاصل کرتی ہے۔ نکہت افلاک کا افسانہ ''احساس کے جھروکے سے'' میں لگ بھگ ایسے ہی مسئلے اٹھائے گئے ہیں، اس میں کوئی آپا تو موجود نہیں ہے مگر ہاں اپنی غریبی کی وجہ سے کئی ایک مسائل سے دوچار ہوتی ہوئی کئی شیتل موجود ہیں جہیز کے بغیر جن کی شادی نہیں ہو پاتی لہٰذا شدید قدم اٹھانے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ ایسے مسائل سے جوجھنے والی ایک حوصلہ مند بیوہ ماں ہے جس کے سر بن بیاہی تین بیٹیاں موجود ہیں۔ عصمت چغتائی کا افسانہ ''بے کار'' میں ہاجرہ بی کی راہوں کو خاردار بنانے والی اس کی ساس موجود ہے جس کے سامنے ہاجرہ بی خاموشی کی چادر اوڑھے ہوئے زندگی کا گزارا کرتی ہے مگر جب معاملہ انتہا کو پہنچتا ہے تو پھر اسے بالآخر بغاوت کا پرچم لہرانا پڑتا ہے۔ عصمت کے ایک اور افسانے ''بچھو پھوپھی'' کی بچھو پھوپھی شوہر کے ہوتے ہوئے بیوہ رہنا اس لیے پسند کرتی ہیں کہ ان کے شوہر نے ان کے ہوتے ہوئے ایک مہترانی سے پینگ لڑا لی تھی۔

صادقہ نواب سحر کا افسانہ ''خدا کی دنیا بہت وسیع ہے'' میں ایک ایسے مرد شیراز کی کہانی پیش کی گئی ہے جس کی ازدواجی زندگی ماں

اور بہنوں کی گھریلو اور گندی سیاست سے برباد ہو جاتی ہے۔ پہلی بیوی کو مار دیا جاتا ہے اور دوسری بیوی اسے چھوڑ کر خود کفیلی کی راہ پر نکل پڑتی ہے۔ وہ روشن خیال ہونے کے باوجود اپنی ماں بہنوں کے سامنے کوئی بھی ٹھوس قدم اٹھانے سے قاصر رہتا ہے۔ ثروت خان کا افسانہ ''ترشنا'' میں ایک ایسی لڑکی کی ارتقا پذیر کہانی پیش کی گئی ہے جو خوبصورت نہیں ہے اس لیے مختلف طرح کے طعنوں کا شکار ہوتی ہے، اور بات آ کر یہیں ختم ہوتی ہے کہ کون اس سے شادی کرے گا۔ مگر وہ اپنے اسی لمبے قد، معقول صورت اور تیز ذہانت کو ہتھیار بنا کر مس ورلڈ کا خطاب جیت لیتی ہے۔ آشا پربھات کا افسانہ ''سلاخوں کے پیچھے'' اور نکہت پروین کا افسانہ ''انگیٹھی'' اور مسرور جہاں کا افسانہ ''مات'' میں لگ بھگ ایک ہی موضوع کو اپنایا گیا ہے۔ تینوں افسانوں کی مرکزی کرداروں نے اپنے اپنے شوہروں کی زندگی میں آنے والی دوسری عورتوں کو خاموشی سے جھیلنے کے بجائے موقع و محل کی مناسبت سے اپنائے گئے بے باک فیصلوں سے اپنے شوہروں کے منہ پر طمانچہ جڑنے کی جسارت کرتی ہیں۔ سیدہ نفیس بانو شمع کا افسانہ ''واپسی'' میں ایک منفرد موضوع کو اپنایا گیا ہے جس میں ایک طوائف کی بیٹی اپنی روشن خیال ذہنیت سے تین مردوں کی وحشیانہ فطرت کو بدلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

مذہبی موضوع پر تحریر کردہ افسانوں میں عصمت چغتائی کا افسانہ ''باندی'' کو لیا گیا ہے جس میں نواب زادے چھمن میاں کے ہاتھ سے اس روایتی نوابانہ طرز پر کاری ضرب لگایا گیا ہے، جس میں شادی سے پہلے نواب زادوں کی عیاشی کے لیے باندیاں منتخب کی جاتی ہیں اور جسے مذہبی اعتبار سے بھی جائز قرار دیا جاتا ہے۔ غزالہ قمر اعجاز کا افسانہ ''دُھند'' میں مسلمانوں کے اس رویے کو موضوع بنایا گیا ہے جس کے سبب وہ کسی بھی مثبت تبدیلی کو بہت جلد اور آسانی سے قبول نہیں کرتے علاوہ ازایں اس رویے کے بھی برے نتائج کو بھی سامنے لایا گیا ہے۔ صادقہ نواب سحر کا افسانہ ''ہزاروں خواہشیں ایسی'' میں بھی ایک ایسے موضوع کو لیا گیا ہے جس میں شادی کے لیے منتخب کیے گئے رشتے پر شمع اعتراض کرتی ہے تو اس کی ماں اسے مذہب کا سہارا لے کر ہزاروں صلواتیں سناتی ہے جبکہ مذہب نے بھی کھلے طور پر اجازت دے رکھی ہے کہ لڑکا ہو یا لڑکی ان کی مرضی کے بغیر شادی نہیں کی جانی چاہیے۔ شوہر مجازی خدا ہوتا ہے اس لیے اس کی دلجوئی میں اگر اس کی غلام بھی بننا پڑے تو شمع کو درگزر نہیں کرنا چاہیے، مگر شمع اس کا احتجاج کرتی ہے۔ زرین تاج کا افسانہ ''حلالہ'' کی تانیہ بلال سے اس بنا پر حلالہ کرتی ہے کہ اس کے شوہر جنید نے ایک غلط فہمی کی بنا پر اسے طلاق دے دی تھی اور اب وہ اسے اپنانا چاہتا ہے مگر تانیہ حلالہ کے تحت کی گئی شادی کو ہی مستقل بنا دیتی ہے۔ انور نزہت کا افسانہ ''موسموں کے رنگ'' کی راوی ہندوستانی کلچر میں لعنت تصور کیے جانے والے عمل کو خالص اسلامی طریقے کی پیروی کرتے ہوئے جائز بنانے کی سعی کرتی ہے۔ وہ اپنی بوڑھی ماں کی تنہائی کے ازالے کے طور پر اس کی شادی کروانا چاہتی ہے مگر بیٹا راہ کی رکاوٹ بن جاتا ہے۔

قمر جہاں کا افسانہ ''گنہ گار'' کی نغمہ اپنی مجبوریوں کے باعث ایک شادی شدہ مرد سے شادی کر کے اس کی پہلی وفا شعار بیوی کی زندگی برباد کر دیتی ہے، لیکن احساس اس وقت ہوتا ہے جب اس کی زندگی میں بھی سوتن وارد ہونے کے امکانات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ کہکشاں پروین کا افسانہ ''داتا'' میں سرمایہ زمین داری نظام کے خلاف آواز اٹھاتی ہے تو سلمیٰ صنم کے افسانے ''پانچویں سمت'' میں ''نیوگ'' جیسے غلط رواج کے خلاف رجنی آواز بلند کرتی ہے۔ شمیم نکہت کے افسانے ''بھاگیہ'' میں بچہ شادی جیسی لعنت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس رواج کی وجہ سے مہوہ بچپن ہی میں بیوہ ہو جاتی ہے۔ اس کا چچازاد بھائی اسے اس نرک سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ انجم آرا انجم کا افسانہ ''میرے گرو نے میرے چہرے پر تیزاب ڈال دیا'' کا موضوع اس کے عنوان سے واضح ہو جاتا ہے جس میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی گرو کے جال میں پھنس کر غلط طریقوں کے خلاف آواز اٹھانے کی کوشش کرتی ہے تو اس پر تیزابی حملہ کر دیا جاتا ہے۔

ہندوستانی قانون کے پس منظر میں لکھے گئے افسانوں میں شمیم نکہت کا افسانہ ''انصاف'' ایک مجبور ماں کی دردناک کہانی بیان کرتا ہے جہاں قانون نے یہ فیصلہ سنایا ہے کہ وہ صرف پانچ سال تک اپنے معصوم بیٹے کے ساتھ رہ سکتی ہے کیوں کہ اتنے چھوٹے بچے کو ماں کی ضرورت ہوتی ہے پھر اسے بچے کو باپ کو سونپنا ہوگا۔غریبی سے تنگ آ کر اپنی نابالغ بچیوں کو بیچنے کے عمل کے خلاف ملک میں بنائے گئے قوانین سے متعلق عصمت چغتائی کا افسانہ ''باندی'' میں ذکر ملتا ہے۔انجم آرا انجم کا افسانہ ''انصاف'' کی پُشپ ،اچودھری کے بیٹے کی ہوس کا شکار ہو کر انصاف حاصل کرنے کے لیے قانون کا سہارا لیتی ہے۔ان کے ایک اور افسانے ''صلیب'' کی انیتا جہیز نہ لانے کے سبب آگ کے حوالے کر دی جاتی ہے،اپنے جھلسے ہوئے جسم کے ساتھ وہ انصاف کے لیے قانون کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے مگر نہ پشپا کو انصاف مل پاتا ہے اور نہ ہی انیتا کو۔

مسرور جہاں کا افسانہ ''سچ کے سوا'' کی پونم ملہوترا دولت کے لالچی شوہر کے ہاتھوں اپنی بیٹی کی عزت کا سودا نہیں ہونے دیتی ،اپنے شوہر کو گولی مار کر عدالت میں اپنی کہانی پیش کرتے ہوئے انصاف طلب کرتی ہے۔مسرور جہاں کا ایک اور افسانہ ''بٹوارہ'' میں فیملی کورٹ کے فیصلے کے تحت علیحدگی اختیار کرنے والے شوہر بیوی کے درمیان بچوں کا بٹوارہ ہو جاتا ہے جس سے بہت ہی برے نتائج نکلتے ہیں بالآخر دونوں پھر ایک ہو جاتے ہیں۔بانو سرتاج کا افسانہ ''گل چاندی کے منڈوے'' میں چوبیس سال کی عمر میں چاروں بچوں سمیت شوہر کی ٹھکرائی حبیبہ خانم اپنے مہر اور بچوں کے گزارے کے لیے عدالت کا سہارا لیتی ہے۔بانو سرتاج کا ایک اور افسانہ ''ایک گھونٹ زہر'' کا کردار انسپکٹر قانون کے نفاذ سے وابستہ رہنے کے باوجود اپنی بیوی کی عصمت دری کے بعد قانون کی کریہہ شکل کی وجہ سے قانون ہی سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے۔شائستہ فاخری کا افسانہ ''ٹھکانہ'' کا مرکزی کردار اپنے لاپرواہ شوہر سے تنگ آ کر عدالت کا سہارا لے کر ایک معقول اور متوازن طریقے سے علیحدگی اختیار کر لیتی ہے۔کشور سلطانہ کا افسانہ ''موڑ'' کی قدسیہ زیدی بھی کچھ اسی طرح کا قدم اٹھانا چاہتی ہے،مگر بیٹی کی ناگفتہ بہ حالت دونوں شوہر اور بیوی کو آپس میں صلح کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

تعلیم کے تحت منتخب افسانوں میں رضیہ سجاد ظہیر کا افسانہ ''ایک کونہ بھی نہیں'' میں ذہین کردار سونا صرف اس وجہ سے پڑھائی چھوڑنا چاہتی ہے کہ غربت کی وجہ سے دو کمرے والے چھوٹے سے مکان میں آٹھ لوگوں کی موجودگی میں اسے پڑھنے کے لیے ایک کونہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔صادقہ نواب سحر کا افسانہ ''نوٹس'' کی بینا اپنے والد جو کانگریس ضلع ادھیکش ہیں، کی مرضی کے خلاف تعلیم حاصل کرتی ہے۔آشا پربھات کا افسانہ ''دھُند'' کی کردار سونا اپنے شہوت پرست حیوان شوہر سے طلاق لے کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے دلّی چلی جاتی ہے۔صدیقہ بیگم کا افسانہ ''تارے لرزے ہیں'' میں ایک ایسے موضوع کو اپنایا گیا ہے جس میں ایک ہی گھر میں بیٹیوں کو تو تعلیم دلائی جاتی ہے مگر بہوؤں کے لیے تعلیم حاصل کرنے کے راستے بند کر دیے جاتے ہیں،جس کے سبب اس گھر کی بیٹی کے ذہن میں اس رواج کے خلاف احتجاج پیدا ہوتا ہے۔

قمر جمالی کا افسانہ ''پاداش'' میں حادثے کا شکار ہوئی ایک بیوہ اپنی بیٹی نائلہ کو تعلیم دلانے کی خاطر حویلی کی مالکن پاشاہ کی تاعمر غلامی اختیار کر لیتی ہے۔نگار عظیم کا افسانہ ''حصار'' کی زاہدہ اپنی بیٹی شاہدہ کے ساتھ وہ سب دُہرانے نہیں دیتی جو خود اس کا ہولناک ماضی تھا۔اس کی پڑھائی کے لیے وہ سب سے لڑ جاتی ہے۔یہی جذبہ کچھ بڑے پیمانے پر رینو بہل کا افسانہ ''شاخوں پر سانپ'' کی دلت طبقے سے تعلق رکھنے والی دولتی میں دکھائی دیتا ہے۔اپنے جذبوں سے پورے گاؤں کے نظام کو ہی بدل دیتی ہے۔نسرین بانو کا افسانہ ''گرود کشنا'' میں عصر حاضر کے ایک اہم موضوع کو اپنایا گیا ہے جہاں تعلیم کا شوق رکھنے والی معصوم لڑکیوں کو رنگین سپنے دکھا کر

پروفیسر حضرات اپنی نگرانی میں لے لیتے ہیں اور پھر ان کا استحصال شروع کرتے ہیں۔ اس افسانے کی نادرہ اسی صورتحال کا سامنا کرتی ہے اور اسے اپنی تھیسس کے لیے بہت بڑی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ بانو سرتاج کا افسانہ ''احساس کی آنچ'' میں لڑکیوں کے ہاسٹل میں وارڈن کے ذریعے ہونے والی جنسی خرافات کو وہاں رہنے والی طالب علموں کے ذریعے بے نقاب کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اشرف جہاں کا افسانہ ''احتساب'' میں جدید دور میں لڑکیوں کی تعلیم اور پیشے سے متعلق مصروفیات کے سبب رشتوں کے درمیان پیدا ہونے والی دوریوں کو موضوعِ افسانہ بنایا گیا ہے۔

معیشت کے تحت منتخب افسانوں میں رضیہ سجاد ظہیر کا افسانہ ''مرد عورت'' میں معاشی اعتبار سے عورت کی خود مختاری کو موضوع بنایا گیا ہے جس میں مرد کے سامنے ایک خاتون اس بات پر بحث کرتی ہے کہ وہ نوکری نہیں چھوڑے گی مرد چاہے تو کسی اور سے شادی کر سکتا ہے۔ غزال ضیغم کا افسانہ ''بے دروازے کا گھر'' کی روبی اپنے باپ کی دوسری بیوی کی اولاد ہونے کی وجہ سے اپنے ہی گھر میں ناسازگار حالات کا سامنا کرتی ہے۔ باپ اور سوتیلے بھائیوں کے آگے سر نہ جھکا کر ایک کالج میں نوکری کر کے خود کفیل بن جاتی ہے۔ رینو بہل کا افسانہ ''تاریک راہوں کے مسافر'' کی چترا اور سہاسی اپنے گھر کی کفالت کے لیے شراب خانے میں رقص کے پیشے کو اپنا لیتی ہیں اور اپنے پاک کردار سے دنیا کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ دیگر پیشوں کی طرح یہ پیشہ بھی عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے کے لائق ہے۔ صادقہ نواب سحر کا افسانہ ''پہاڑوں کے بادل'' میں پروانہ کی ماں اپنے شرابی اور جواری شوہر اور بیٹے سے تنگ آ کر اپنے گھر کی کفالت کے لیے گھر سے کئی میل دور ایک نرسری میں پانچ ہزار کی تنخواہ پر کام کرتی ہے۔

افروز سعیدہ کا افسانہ ''کربِ مسلسل'' میں ایک ایسے موضوع کو اپنایا گیا ہے جس میں مرد تو خود اپنی پسند سے نوکری پیشہ لڑکیوں سے شادی کرتے ہیں مگر بچوں کی پرورش میں وہ خاتون کا ساتھ دینا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ دوہری ذمے داریوں کا بوجھ صحیح طرح سے نہ اٹھا پانے کے سبب بچے لاپرواہی کا شکار ہو کر غلط راہ پر چل پڑتے ہیں۔ افروز سعیدہ کا ایک اور افسانہ ''وقت کی کروٹ'' حسین بیوہ شاداب اپنی خوبصورت بیٹی مہتاب کے ساتھ مل کر اپنے آپ کو معاشی اعتبار سے مضبوط بنانے کے لیے کمپیوٹر اور ٹائپ رائٹنگ انسٹی ٹیوٹ کھولتی ہے۔ دونوں ماں بیٹیوں کو اپنی خوبصورتی کے سبب ہوس پرست دنیا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ترنم ریاض کا افسانہ ''تعبیر'' کا مرکزی کردار بھی اپنے مقصد کے حصول میں ہار مانے بغیر اسی طرح کی پریشانیوں کا سامنا بھرپور حوصلے کے ساتھ کرتا ہے۔ ترنم ریاض کا ایک اور افسانہ ''مرار خت سفر آنسو'' کی مسز نا گپال، جوئے کی لت میں مبتلا اپنے شوہر کی بربادی کے بعد گھر کی معاشی حالت کو بہتر کے لیے گھر سے باہر نکلتی ہے اور اپنے شوہر کے شک کا نشانہ بنتی ہے۔ سلمیٰ صنم کا افسانہ ''یہ طفیلیاں'' کی نکّی ایک ناکارہ شوہر کے ساتھ اپنے مجبور رشتے کو ڈھو رہی ہے۔ اسے نوکری کرتے دیکھ کر اس کا شوہر اپنی نوکری چھوڑ دیتا ہے اور عیاشی شروع کر دیتا ہے۔ سلمیٰ صنم کا ایک اور افسانہ ''تھکی ہوئی ناری'' کیریر بنانے کی دھن میں مبتلا آج کی دوہری زندگی جینے والی عورتوں کے تلخ تجربات پر مبنی ہے، جہاں بچے لاپرواہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

سیاست کے تحت منتخب افسانوں میں غزال ضیغم کا افسانہ ''مشتِ خاک'' کی انپڑھ مگر بے باک پھلوا سیاست میں قدم رکھتے ہی گاؤں کے حکمرانوں کو کڑی چنوتی دیتی ہے۔ شائستہ فاخری کا افسانہ ''منگلا کی واپسی'' کی جوگن منگلا جس نے سیاست میں قدم رکھتے ہی مرکزی حکومت تک کی کرسی ہلا دی مگر پھر اسے بھی گندی پالیٹکس کا نشانہ بننا پڑا۔ سلمیٰ صنم کا افسانہ ''کٹھ پتلی'' کی آسیہ اپنے شاہوکار شوہر شجاع کی کٹھ پتلی بن کر سیاست کے میدان میں اُترتی ہے، اور سیاست کی باگ ڈور شجاع کے ہاتھ ہی میں رہتی ہے مگر جب گندہ پانی سر

سے اوپر چلا جاتا ہے تو ناخواندہ آسیہ اپنے شوہر کے خلاف کھڑی ہو جاتی ہے۔سلمیٰ صنم کا ایک اور افسانہ ''نارسیدہ آرزو'' کا مرکزی کردار یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ سیاست میں اپنی پہچان بنانا تو چاہتی ہے مگر عین وقت پر اپنے شوہر کے فریب کا نشانہ بن جاتی ہے۔

صحت موضوع کے تحت شامل افسانوں میں مسرور جہاں کا افسانہ ''رِستے زخم'' کی گلابو اپنے چھٹے بچے کی پیدائش میں ملکی دائی کی ناتجربہ کاری کے چلتے اللہ کو پیاری ہو جاتی ہے کیوں کہ اس کے بیمار جسم میں سکت نہیں تھی کہ وہ چوتھے بچے کے بعد اور بچہ پیدا کرے۔اسی موضوع پر لکھا گیا رشید جہاں کا افسانہ ''آصف جہاں کی بہو'' میں دائی کے ہاتھوں گھر ہی پہ بچے کی پیدائش کا ہولناک منظر پیش کیا گیا ہے۔عورتیں گھر والوں کی لاپرواہی اور دائیوں کی حفظانِ صحت کے منافی (Unhygi) طریقوں سے مختلف طرح کے امراض میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔عصمت چغتائی کا افسانہ ''امر بیل'' میں حکومتی انتظامات کی طرف اس بات کے اشارے ملتے ہیں کہ حکومت کی کامیاب پالیسیوں کے سبب عورتوں میں موت کی تعداد نہ کے برابر ہوگئی ہے۔ڈاکٹر انجم آرا انجم کا افسانہ ''مجھے جینا ہے'' کی بملا اپنے شوہر اور ساس کے ظلم کا شکار ہو کر ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے، مگر اپنی حوصلہ مندی سے موت کے منہ سے نکل آتی ہے۔نسرین بانو کا افسانہ ''ٹوٹتی کڑیاں'' کی ریما اپنے شوہر کی لاپرواہی کا نشانہ بن جاتی ہے۔چھٹے بچے کی پیدائش میں دکھ اور تکلیف کا پہاڑ نہ ڈھو پانے کی وجہ سے خود کو موت کے حوالے کر دیتی ہے۔نسرین بانو کا ایک اور افسانہ ''تیتری'' کی نغمہ اپنے سادیت زدہ (Sadist) شوہر کی ہوس کا شکار ہو کر کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔شمیم نکہت کا افسانہ ''ثروت آپا'' بھی اپنے شوہر اور سسرال والوں کا عتاب سہتے سہتے ہزار مرض اپنی جان سے لگا لیتی ہے۔تبسم فاطمہ کا افسانہ ''کتھا'' کی رشو بھی اپنے شوہر نامدار کے ہوس کو پورا کرتے کرتے ہڈی کا ڈھانچہ بن جاتی ہے۔

خواتین انجمنوں کے تحت شامل کیے گئے افسانوں میں قمر جمالی کا افسانہ ''پاداش'' کی نائلہ شاذو بابا کے فریب میں مبتلا ہو کر انصاف کی طلب میں ایک این جی او کا سہارا لیتی ہے۔انجم قدوائی کا افسانہ ''صدف رائگاں'' میں ساٹھ سالہ بڈھے کی چنگل میں پھنسی تیرہ سالہ معصوم انیسہ اپنی اسکول ٹیچر، جواب این جی او سے وابستہ ہے، کے ذریعہ فرار حاصل کرنا چاہتی ہے مگر چند مجبوریاں اس کے پاؤں کی بیڑی بن جاتی ہیں۔انور نزہت کا افسانہ ''عورت کا گناہ'' کی شانتی اپنے شوہر کی نامردی کو اپنی قسمت مان لیتی ہے مگر جب وہ سنیاسی بننے کا بہانہ تلاش لیتا ہے تو پھر وہ ایک ڈاکٹر کے عشق میں مبتلا ہو کر ایک بچے کو جنم دینے والی ہوتی ہے۔اس وقت این جی او سے وابستہ دوسری ڈاکٹر اسے گاؤں والوں کے عتاب سے بچاتی ہے۔نکہت پروین کا افسانہ ''Women's'' کی سبزی فروش جس ہمت سے ایک مرد کو فیمنسٹ خواتین کے حوالے کرتی ہے اسی ہمت سے اپنے شرابی ناکارہ شوہر کے روبرو کھڑی ہو کر اس کی خامیاں گنوانے کے ہوڑ میں اس کی وحشت کا نشانہ بن جاتی ہے۔

تانیثیت کے زیر اثر بے راہ روی موضوع پر لکھے گئے منتخب افسانوں میں قرۃ العین حیدر کا افسانہ ''پت جھڑ کی آواز'' میں ایک ایسے موضوع کو زیر بحث لایا گیا ہے جس میں شریف اور پردہ نشین گھرانوں کی پروردہ لڑکیاں گھر سے نکل کر ہاسٹل میں قیام کے دوران میں کس طرح بڑے شہروں کی رونقوں میں خود کو فراموش کر کے اپنے خاندانی وقار اور اپنے والدین کے اعتماد پر کالک پوتتی ہیں۔قرۃ العین حیدر کا ایک اور افسانہ ''نظارہ درمیان ہے'' میں پیرو جادستور کے ذریعہ مشرقی اذہان کی مغرب پرستی کے تئیں اہل یورپ کے نظریے کی واضح تصویر پیش کی گئی ہے۔غزالہ قمر اعجاز کا افسانہ ''ہار'' کی راوی اپنی شادی سے زیادہ آزادی کو ترجیح دے کر اپنی اور اپنی بیٹی کی زندگی کو اجیرن بنا دیتی ہے۔نعیمہ جعفری پاشا کا افسانہ ''واپسی'' کی پھوئی اپنے والد بشارت علی بیگ کی دی ہوئی آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے

ہوئے اپنی زندگی کو لے کر ایسے ایسے فیصلے کرتی ہے جس سے گھر والوں کا اعتماد یکسر ٹوٹ جاتا ہے۔کشور سلطانہ کا افسانہ ’’لمحوں کے قیدی‘‘ میں ایک ایسے موضوع کو قلم بند کیا گیا ہے جس میں اپنی بیوی انجنا سے والہانہ محبت کرنے والا ستیش اپنی بیوی کی لاپرواہی کا شکار ہو کر پرانی کلاس فیلو روما کی دوستی میں سکون تلاشنے لگتا ہے۔ڈاکٹر شائستہ انجم نوری کا افسانہ ’’کچھ تو ہے‘‘ میں بھی دو مظلوم مردوں کے حالات بیان کیے گیے ہیں جو کہیں نہ کہیں اپنی عزت اور دیگر رشتوں کی خاطر اپنی آزاد خیال اور خود پرست بیویوں کو جھیلنے پر مجبور ہیں۔شائستہ فاخری کا افسانہ ’’خشک پتوں کی موسیقی‘‘ میں جدید تہذیب کی پروردہ حجاب دُرّانی شادی کو اپنی آزادی میں رُکاوٹ تصور کرتے ہوئے مجرد تو رہ جاتی ہے مگر عمر کے آخری پڑاؤ میں اس کی تنہائی اسے اپنے فیصلے بدلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔بانو سرتاج کا افسانہ ’’بجوکا‘‘ میں ایک منفرد موضوع کو اپنایا گیا ہے۔افسانے کی بے راہ رو کردار شادی کے بغیر ہی ماں بننا چاہتی ہے۔رینو بہل نے اپنے افسانے ’’بیگم بادشاہ غلام‘‘ میں ایک نئے موضوع کو پیش کیا ہے۔اس افسانے میں جدیدیت کی ہوڑ میں آزادی کی غلط تفہیم کی پیروی کرنے والی مشرقی دولت مند خواتین مشرقی تہذیب کو طاق پہ رکھ کر اپنی ہوس کی تکمیل کے لیے نوجوان لڑکوں کو رکھیل رکھتی ہیں۔نگار عظیم کا افسانہ ’’گہن‘‘ ایک ایسے موضوع پر مبنی ہے، جس میں نازش اپنی تنہائی سے تنگ آ کر زنانہ ہم جنس پرستی (L e s b i a n i s m) جیسے غیر فطری عمل میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ترنم ریاض کا افسانہ ’’ساحل کے اس طرف‘‘ میں ایک ایسے موضوع کو اپنایا گیا ہے جس میں عورتوں کی انتہا پسند فطرت سے ایک غیر متوقع مستقبل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ اگر اسی طرح اپنے جائز حقوق کے ساتھ ساتھ انتہا پسند تقاضے اور غیر فطری حرکتوں کو بھی منواتی رہیں تو نسل انسانی کا مستقبل مشکوک ہوگا۔

افسانے کا فن ایک مرکب مظہر ہے۔کئی اجزا کے امتزاج سے اس کا وجود مکمل ہوتا ہے جنہیں فن کے عناصر ترکیبی بھی کہتے ہیں۔جن میں پلاٹ، کردار نگاری، تکنیک، زماں و مکاں اور آفاقیت، عنوان اور نقطۂ نظر میں رشتہ، زبان و بیان وغیرہ افسانے کے اہم اجزا ہیں۔

اس مقالے کے پانچویں باب میں تمام مشمول افسانوں کا فنی تنقیدی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔افسانہ چند ایسے واقعات کا امتزاج ہوتا ہے جو آپس میں ایک منطقی ربط کے ساتھ منسلک رہتے ہیں، منطقی اعتبار سے یہی مربوط واقعاتی نظام پلاٹ کہلاتا ہے۔پلاٹ کے زُمرے میں رضیہ سجاد ظہیر کا افسانہ ’’نیچ‘‘، غزال ضیغم کا افسانہ ’’سوریہ ونشی چندرونشی‘‘، کہکشاں پروین کا افسانہ ’’چندریکا‘‘، ترنم ریاض کا افسانہ ’’ہم تو ڈوبے ہیں صنم‘‘، صدیقہ بیگم کا افسانہ ’’اندرسبھا‘‘، جیلانی بانو کا افسانہ ’’کلچرل اکیڈمی‘‘، صبیحہ انور کا افسانہ ’’واپسی‘‘، کہکشاں انجم کا افسانہ ’’تقدیر سے پہلے‘‘، غزالہ قمر اعجاز کا افسانہ ’’سپرنگ‘‘، زنفر کھوکھر کا افسانہ ’’سیکنڈ ہینڈ‘‘، نگار عظیم کا افسانہ ’’فرض‘‘ کو شامل کیا گیا ہے جو بہترین پلاٹ کے اعتبار سے عمدہ افسانے ہیں۔

کردار نگاری افسانے کا ایک اہم جُز ہے۔یہاں کردار سے مراد کسی فن پارے میں چلتے پھرتے بولتے افراد ہوتے ہیں جو موضوع کے مختلف پہلوؤں کو جنبش عطا کرتے ہوئے اسے متحرک بنائے رکھتے ہیں۔ایک کامیاب کردار کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ قاری کے ذہن کو اپنی طرف سے ہٹنے نہ دے، پورے افسانے پر اس کا غلبہ نظر آتا ہے، اس کا غالب ہونا افسانے کی پستی کا نہیں بلکہ اس کے عروج کا ضامن بنتا ہے۔کردار نگاری کے زُمرے میں رفیعہ منظور الامین کا افسانہ ’’آتش کدہ‘‘، ذکیہ مشہدی کا افسانہ ’’حصار‘‘، عصمت چغتائی کا افسانہ ’’باندی‘‘، شمیم نکہت کا افسانہ ’’ثروت آپا‘‘، شیخ طاہرہ عبدالشکور کا افسانہ ’’فیصلہ‘‘، ترنم ریاض کا افسانہ ’’مہاوٹیں‘‘، ترنم ریاض کا ایک اور افسانہ ’’میرا پیا گھر آیا‘‘، شائستہ اختر سہروردی کا افسانہ ’’آزاد چڑیا‘‘، انجم قدوائی کا افسانہ ’’ٹوٹتی دیواریں، جیلانی بانو کا افسانہ ’’نئی

عورت'' کوشامل کیا گیا ہے۔

کہانی میں زماں و مکاں کا تصور بس اتنا ہی ہے کہ کہانی کس عہد میں لکھی جا رہی ہے اور کہانی میں پیش کیا جانے والا واقعہ کس زمانے سے متعلق ہے اور کس جگہ کی عکاسی کر رہا ہے۔زماں و مکاں کے ساتھ آفاقیت کا تصور اس لیے ایک ساتھ لایا جاتا ہے کہ کبھی کبھی کہانی میں پیش آنے والا واقعہ اپنی عالم گیری صفات کی بدولت مخصوص وقت اور جغرافیائی دائرے سے نکل کر ہر دور اور پوری دُنیا کی آواز بن جاتا ہے جو ادب پارے کی بہت بڑی خاصیت ہے۔زماں و مکاں کے زُمرے میں کہکشاں پروین کا افسانہ ''ریزہ ریزہ''، کہکشاں پروین کا ایک اور افسانہ ''ایک لمبی مسافت''، ثریہ صولت حسین کا افسانہ ''کالا برقعہ''، کہکشاں انجم کا افسانہ ''اپنا دامن اپنا گریباں'' اور شائستہ فاخری کا افسانہ ''درد شور انگیز'' کا تجزیہ کیا گیا ہے۔وہیں آفاقیت کے زمرے میں شائستہ اختر سہروردی کا افسانہ ''نصف بہتر''، انجم قدوائی کا افسانہ ''اللہ کے نام پر''، جیلانی بانو کا افسانہ ''Specimen Box''، سلمیٰ صنم کا افسانہ ''پانچویں سمت''، نگار عظیم کا افسانہ ''فرق''، کہکشاں انجم کا افسانہ ''شیشہ اور کرچیاں'' شامل ہیں۔

'تکنیک' ایک یونانی لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں ''فن یا طریقۂ کار''۔ادب میں لفظ تکنیک کو عموماً ''طریقِ عمل'' یا ''موضوع و مواد کو آگے بڑھانے کا حربہ'' کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔گویا تکنیک تخلیقی عمل میں ایک طریق کی حیثیت سے موضوع کی مناسبت سے وقوع پذیر خیالات و واقعات کو وجود بخشنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔تکنیک کے زُمرے میں رینو بہل کا افسانہ ''دروپدی جاگ اٹھی''، رفیعہ شبنم عابدی کا افسانہ ''کہو قبول ہے؟''، جیلانی بانو کا افسانہ ''ایمان کی سلامتی''، سلمیٰ صنم کا افسانہ ''تکمیل''، سلمیٰ صنم کا ایک اور افسانہ ''پُل''، صدیقہ بیگم کا افسانہ ''بھنور''، جیلانی بانو کا افسانہ ''روز کے قصّے''، نگار عظیم کا افسانہ ''بیاہ''، ثروت خان کا افسانہ ''مردانگی''، قمر جہاں کا افسانہ ''یادوں کی پروائیاں'' اور رشید جہاں کا افسانہ ''مرد و عورت'' کوشامل کیا گیا ہے۔

دُنیا میں وقوع پذیر واقعات و حادثات گردشِ زمانہ کا پرتو ہیں جن کے وجود ہی سے ارتقائے زمانہ کا معیار اور سمت و رفتار طے ہوتا ہے۔اس معیار و سمت و رفتار سے متاثر ہونے والے اذہان اپنے آپ کو کس درجے تک پہنچا پاتے ہیں، ان واقعات و حادثات سے اخذ کیے گئے تاثرات کس شکل، کس درجے اور کس پیرائے میں مادۂ اظہار بنتے ہیں، کس کا تخلیقی ذہن کس طرح سے ان کے ظہور میں حصّہ لیتا ہے، یہ ذہانت سے منسلک جمالیاتی اقدار، جذبات و خیالات کی گہرائی و گیرائی، فصاحت و بلاغت کا معیار، تفحص و تراکیبِ الفاظ، اظہار کی دلکشی، افکار کے مخصوص طرز پر منحصر ہے۔ان سب کا امتزاج ہی اسلوب کو جنم دیتا ہے اور یہی اسلوب مخصوص شخصیت کو وجود بخشتا ہے، اسے صاحب اسلوب بناتا ہے۔زبان و بیان سے مراد افسانے کا اسلوب ہے۔زبان و بیان کے زُمرے میں عصمت چغتائی کا افسانہ ''چوتھی کا جوڑا''، نعیمہ جعفری پاشا کا افسانہ ''چوتھی کا ایک اور جوڑا''، عصمت چغتائی کا افسانہ ''عشق پر زور نہیں''، رشید جہاں کا افسانہ ''سودا''، جیلانی بانو کا افسانہ ''موم کی مریم''، رفیعہ منظور الامین کا افسانہ ''چادر''، افشاں ملک کا افسانہ ''اُفتادہ اراضی''، صالحہ عابد حسین کا افسانہ ''دلدل''، تبسم فاطمہ کا افسانہ ''مُجرم''، کہکشاں افلاک کا افسانہ ''تقسیم کی روٹی'' کوشامل کیا گیا ہے۔

عنوان اور نقطۂ نظر میں ایک مضبوط اور گہرا رشتہ ہوتا ہے جو کہانی کی کامیابی میں اہم رول ادا کرتا ہے۔افسانے کا عنوان فنکارانہ طور سے کہانی کے مرکزی خیال کی طرف اشارہ کرتا ہے مزید کہانی کے ساتھ ایک نامیاتی رشتہ محسوس کراتا ہے۔یہ سب ممکن تبھی ہو پاتا ہے جب افسانہ نگار اپنے افسانے کے عنوان کے دورانِ انتخاب میں اپنی کہانی میں مضمر نقطۂ نظر کو مدِ نظر رکھتا ہے۔عنوان اور نقطۂ نظر میں رشتہ کے زُمرے میں جیلانی بانو کا افسانہ ''آ گہی''، عصمت چغتائی کا افسانہ ''سونے کا انڈہ''، غزالہ قمر اعجاز کا افسانہ ''کھوکھلے رشتے''،

ترنم ریاض کا افسانہ ''ناخدا''، ترنم ریاض کا ایک اور افسانہ ''باپ''، ثروت خان کا افسانہ ''میں مرد مار بھلی''، بانو سرتاج کا افسانہ ''صلیب پر ٹنگی عورت''، سیدہ نفیس بانو شمع کا افسانہ ''حرام زادہ''، نگار عظیم کا افسانہ ''روشنی''، افروز سعیدہ کا افسانہ ''تاریک راہوں کے مسافر'' کا تجزیہ شامل ہے۔

المختصر آج کے دور میں عورت جہاں زندگی کے ہر شعبے میں مرد کی برابری کرتی نظر آتی ہے وہیں خواتین افسانہ نگاروں نے اپنے قلم کی آزادی کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے معاشرے سے متعلق تمام پہلوؤں کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ انسانی زندگی وقت کی ڈگر پر اپنی طے شدہ راہیں عبور کرتے ہوئے منزل تک رسائی حاصل کرتی ہے۔ زندگی کے ارتقائی مراحل کو صفحۂ قرطاس پر نقش کرنے میں خواتین افسانہ نگاروں نے مردوں کے شانہ بشانہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں، شعور کی پختگی اور فہم و بصیرت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی پرجوش شرکت کے سبب افسانوی میدان کا وسیع کینوس بڑے ہی جوش و خروش کے ساتھ عورتوں کا خیر مقدم کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

بالآخر یہ کہنا ضروری خیال کرتی ہوں کہ خواتین کے افسانے لاتعداد ہیں۔ ہر ایک کو شامل کرنا ممکن نہیں تھا۔ جن افسانوں کو شامل کیا گیا ہے وہ میرے مقالے کے مفروضات کی پیمائش پر کھرے اُترتے ہیں۔ ابتدا میں خواتین افسانہ نگاروں کی تعداد کم تھی مگر دور جدید نے اپنی روشن خیالی کے سبب بے شمار خواتین افسانہ نگاروں کو پیدا کیا ہے۔ جب میں نے اس موضوع کو اختیار کیا تھا تب میں اس غلط فہمی کا شکار تھی کہ خواتین لکھنے والیاں انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا تعجب کی حد تک فہرست میں اضافے ہوتے گئے، چوں کہ میرا کام نسائیت کے صرف ایک رُخ یعنی تانیثیت پر مبنی ہے، اس لیے صرف انہی خواتین افسانہ نگاروں کو شامل کیا گیا ہے جن کے افسانوں میں تانیثی لہجے کو صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ایسے گمنام افسانہ نگاروں کو بھی شامل کیا گیا ہے جن کے افسانوں نے مخصوص موضوع اور فن کے سبب میرے شعور کو جھنجھوڑا اور مجھے مجبور کیا کہ میں انہیں اپنے مقالے میں شامل کروں لہذا شامل کر کے مقالے کے تقاضے کے مطابق تجزیہ کیا گیا ہے۔

شاذیہ تمکین
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

بابِ اوّل: تانیثیت

1 :-تانیثیت :تعریف، معنی ومفہوم
2:-تانیثیت کے اہم موڑ
3:-تانیثی تنقید

"تحریک جمود کی ایک رنگی کو توڑ کر ہمہ رنگی اور تنوع پیدا کرنے کا عمل ہے۔" 1

انسان جو اشرف المخلوق ہے، ایک ارتقاء پذیر جاندار ہے۔اس کے اسی وصف نے کبھی اُسے ایک جگہ منجمد رہنے کی اجازت نہیں دی۔اس نے ہمیشہ اپنے اردگرد کے جمود کو توڑا ہے اور اپنی تحرکی فطرت کو ثابت کیا ہے۔جمود سے مراد یہ نہیں ہے کہ سانس جسم کا ساتھ چھوڑ دے یا جسم حرکت کرنے سے ہی محروم ہو جائے۔بلکہ جمود ایک ہی سمت میں ایک طرح کی لے کے سہارے لحنِ مقررہ کی تھاپ پر محو رقص کا نام ہے۔ایک طویل مدّت تک اس ایک ہی تکنیک پر رقص کرتے رہنے کے بعد ارتقا پذیر انسانی شعور میں ایک نئی تلاش کی کرید پیدا ہوتی ہے، یہی تلاش جمود کی ایک رنگی کو توڑ کر ایک نئی منزل کی تکمیل میں متعین کردہ راہ پر نئی تازگی کے ساتھ چلنے کا محرّک بن جاتی ہے۔اس طرح ایک زمانے میں تر و تازگی کے ساتھ وقوع پذیر ہونے والی تحریک طویل آلودگی زمانہ کی چپیٹ میں آ کر جمود کا شکار ہو جاتی ہے، اس کے زیر سایہ زندگی ایک ہی پٹری پر چلتے چلتے یا تو تھک جاتی ہے یا بیزار ہو جاتی ہے یا پھر بپھر جاتی ہے۔یہ بپھرنا، یہ بیزاری، یہ تھکان اس کی ارتقا پذیر فطرت، جو جمود کا نہیں تحریک کا ضامن ہے، کا نتیجہ ہوتے ہیں ان کی موجودگی جمود کی انتہا کی طرف اشارہ کرتی ہے، جو اپنی صلاحیت کے برعکس اس قدر قوتِ ارادی رکھتے ہیں کہ مسلسل جمود کے خاتم بن جاتے ہیں پھر ایک نئی تحریک کی بنیاد پڑتی ہے۔

انسانی زندگی میں وقوع پذیر ہونے والی دیگر تحریکوں کی طرح تانیثی تحریک بھی خواتین کی زندگی پر کئی صدیوں تک غاصب رہنے والے مرد اساس معاشرتی قوانین کی جمود کے خلاف وجود میں آئی۔مرد اساس معاشرہ جو اپنی ظلم و بربریت کی انتہائی نقطے پر پہنچ کر روشن خیال مرد و زن کے شعوری جمود کو توڑنے کا خود ہی محرک بنا۔شروع میں رجحان کی شکل میں پیدا ہونے والی یہ تحریک اپنے عالم گیری وصف کے سبب بہت جلد رجحان کے محدود دائرے کو توڑ کر تحریک کے وسیع ساگر میں مستغرق موتیوں کی تلاش میں محو ہو گئی۔مذکورہ باب میں اس تحریک سے متعلق ساری اہم تفصیلات کا احاطہ کیا گیا ہے۔آیئے اس تحریک کے جدو جہد ماضی، نتیجۂ حال اور ممکنات مستقبل پر روشنی ڈالتے ہوئے، اس کے وجود سے ادب میں وارد ہونے والے اثرات کی وضاحت کرتے ہیں۔

تانیثیت: تعریف، معنی و مفہوم

"The history of women is solely a history of thier rights, and this history says: men have oppressed wome
__Marianne Adelaide Hedwing Dohm (german feminist and

جب تاریخ کے پنوں میں جھانک کر عورت کی حالات کا جائزہ لیا جاتا ہے تو Hedwing کی طرح ہم بھی اس حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں کہ انسان ہونے کے باوجود کسی بھی دور میں اس کے انسانی وجود کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ اسے انسانی حقوق سے محروم رکھا گیا۔ مرد اساس سماج نے جنسی اعتبار سے اسے ثانوی درجے میں رکھا اور اس کے تشخص کو پامال کر دیا۔ یونیورسل ہیومن لبرلیزم نے بھی کس طرح مرد اور عورت کے مابین امتیازات کو برقرار رکھتے ہوئے انہیں ثانوی درجہ عطا کیا، اس پر دیوندر اسر لکھتے ہیں:

''آفاقی انسانی لبرلیزم نہ صرف عورت اور مرد کے مابین اساسی افتراقات کو نظر انداز کرتا ہے بلکہ آفاقیت، انسانیت اور لبرلیزم کے نام پر عورت کی منفرد شناخت کو ختم کر کے اسے مرد غالب معاشرہ میں دوسرے درجے کا شہری بھی بنا دیتا ہے اور اسے دائرۂ اقتدار سے باہر کر دیا جاتا ہے۔''[2]

معاشرے کے ذریعے تشکیل کردہ صنفی افتراقات کو ختم کرنے کے احساسات نے عورت کے تئیں ایک خاص رجحان کو جنم دیا۔ عورت کے تشخص کی بحالی کے محرک تصورات نے تانیثیت کو جنم دیا۔ اس طرح سے تانیثی رجحان نے تانیثی شکل اختیار کر کے اس مظہر کو رجحان سے تحریک میں تبدیل کیا۔ حقوقِ نسواں اور آزادیٔ نسواں کے نظریات بہت پہلے سے موجود تھے مگر اس عالمی تحریک کے لیے لفظ "Femi... اور اس کے علم برداروں کے لیے "Femi... لفظ کی اصطلاح بہت بعد میں سامنے آئی۔ ڈاکٹر سطوت ریحانہ صاحبہ تحریکِ آزادیٔ نسواں کی ابتدا اور John... کے نظریات کی تفصیل اس طرح بیان کرتی ہیں:

''یورپ میں تحریکِ آزادیٔ نسواں کا نقطۂ آغاز فرانسیسی ماہرِ تعلیم خاتون Christi...n (1365-1430) کی تحریروں کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس نے نہ صرف اپنی تحریروں کے ذریعہ حقوق نسواں کی بحالی کی جد و جہد کی بلکہ اس سلسلہ میں باضابطہ مباحثے کرا کے رائے عامہ کو ہموار کرنے کی کوشش کی۔ مذکورہ مباحثوں کو فرانس کی تحریکِ آزادیٔ نسواں کی تاریخ میں Querelles Des Femmes کے نام سے شہرت ملی۔ ان مباحثوں کا بنیادی محور حقوقِ نسواں کو فلسفیانہ اساس فراہم کرنا تھا۔''[3]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس تحریک کے ابتدائی نقوش کی زیریں لہریں چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں پیدا ہو چکی تھیں انیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے وسیع سے وسیع تر ہوتی گئیں۔ زیادہ تر مفکرین اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ انیسویں صدی میں "Femi... لفظ کی اختراع Charles F... نے کی:

"In 1837, radical Franch philosopher Charles Fourier
writing about the undelible link between women"s stat
_____posted by Cristen Conger, january,2015.[4]

اپنے اس مضمون میں لفظ Feminist کی وضع کے متعلق لکھتی ہیں:

"In september 1896, Eugenie Potonie-Pierre also clai
"feminism". [5]

مگر مختلف محققین نے سب سے پہلے لفظ فیمنزم کی ایجاد کا سہرا Charles F کے سر ہی باندھا ہے۔ شہناز نبی اس طرح رقم طراز ہیں:

”محققین کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے فیمنزم لفظ کا استعمال فرانسیسی فلاسفر چارلس فوریر (Charles نے 1837ء میں کیا تھا۔“ 6

Charles Fourier حقیقی معنوں میں فیمنسٹ نہیں تھا پھر بھی صحیح معنوں میں ”آزادی“ کا مطلب بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتا ہے:

"Liberty, unless enjoyed by all, is unreal and illus

Charles Fourier کے مطابق جب تک صنفی اور جنسی امتیازات کو بالائے طاق رکھ کر سبھوں کو برابری کا حق نہیں ملتا تب تک آزادی کا مطلب بے معنی ہے۔ بنی نوع انسان کی ارتقاء صنفی مساوات کے بین السطور میں ہی مضمر ہے۔ 1890ء کے آس پاس Women-led activism for equalit کے معنوں میں لفظ ”فیمنزم“ عام طور پر استعمال ہونے لگا۔ اکتوبر 1894ء میں مذکورہ لفظ فرانس سے منتقل ہو کر انگریزی زبان میں ”لندن ڈیلی نیوز“ اخبار کے مضمون میں استعمال ہوا۔ Nee Tondon لکھتی ہیں:

"It was the 'London Daily News', that coined the term
France, automatically branded it as dangerous."[8]

پہلی مرتبہ لفظ Feminist 1871ء میں فرانسیسی طبّی متن میں استعمال ہوا۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں لفظ Feminism کا استعمال 1895ء اور Feminist کا استعمال 1896ء بالترتیب ہونا درج ہے۔ اس طرح اس لفظ کا استعمال برطانیہ میں 1890ء اور امریکہ میں 1910ء میں کیا گیا۔ Jane Freedman لکھتے ہیں:

"The term 'Feminist' seems to have first been used 18
Text to describe a cessation in development of the
characteristics in male patients, who were perceived
'Feminization' of their bodies(Fraisse 1995)."[9]

Jane Freedman آگے وضاحت کرتے ہیں کہ فرانس کے ہی ایک تخلیق کار ری پبلکن اور اینٹی فیمنسٹ Alexandre Dumas Files نے اپنی ایک چھوٹی سی کتاب میں، جو ایک پامفلیٹ کی شکل میں تھی، فیمنسٹ اصطلاح کا استعمال 1872ء میں کیا تھا۔ یہ کتاب Adul کے موضوع پر تھی اور یہ لفظ ایسی عورتوں کو خطاب کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا جن کا سلوک مردانہ طریقے پر مبنی تھا۔ ہم نے دیکھا کہ شروع میں فیمنسٹ لفظ ایسے مردوں کے لیے استعمال کیا گیا جن میں نسوانی خصوصیات پیدا ہو گئی تھیں۔ پھر ایسی عورتوں کے لیے استعمال کیا گیا جن کا برتاؤ مردانہ طریقے پر مبنی تھا۔ لیکن بعد میں اس اصطلاح کو ان افراد کے لیے استعمال کیا گیا جو فیمنزم نظریات کے ماننے والے تھے۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں ’فیمنسٹ‘ کا مطلب اس طرح ہے:

"an advocate or supporter of the rights and equality

لفظ ’فیمنسٹ‘ تانیثی تحریک اور اس کے نظریات سے منسلک ہے۔ اس تحریک کے ماننے والے ہی فیمنسٹ کہلاتے ہیں۔ جوڈتھ ایم بارڈوک نے لفظ Feminist کی تین اقسام بتائی ہیں: Conservative جو گھریلو ذمہ داری کی

مساوی اور منصفانہ تقسیم اور کام میں مساوی معاوضہ کے حق میں آواز اٹھاتا ہے Mainstream Feminist جو قانون میں تبدیلی لانا چاہتا ہے، جو مرد اور عورت دونوں کے لیے مساوی ہے۔ Radical Feminist جو معاشرے کی بنیاد کو ہی بدل دینا چاہتا ہے، ان کا ماننا ہے کہ چند ایک بدلاؤ سے عورتوں کی آزادی ممکن نہیں ہے۔ مجموعی طور پر آج وسیع تر معنوں میں فیمنسٹ لفظ ان افراد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو جنسی افتراقات کے باوجود عورت اور مرد دونوں کے لیے سماجی، سیاسی اور اقتصادی مساوات کا نظریہ رکھتے ہیں اور دونوں اصناف (Gender) کے انسانی وجود کو مساوی طور پر قبول کرتے ہیں۔ ایسا نظریہ رکھنے والا چاہے وہ مرد ہو یا عورت فیمنسٹ کہلائے گا۔ فیمنسٹ کا تعلق Feminism سے ہے جو ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا کوئی مخصوص معنی متعین نہیں کیا جا سکتا۔ ملک، تہذیب، مذہب، ذات اور طبقہ کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اس کی تعریف بھی بدلتی ہے۔ مرد غالب معاشرے کی شکار عورتوں کی زندگی سے جڑے ہوئے مختلف ایشوز کا انسلاک اس لفظ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس کی کوئی ایک تعریف متعین نہیں کی جا سکتی اس لیے تانیثیت متعدد تعریفوں کا مجموعہ ہے۔ دیویندر اسر اپنے ایک مضمون ''تانیثیت: تشخص کی تشویش اور لبریشن کا جشن'' میں لکھتے ہیں:

> ''تانیثیت ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے مخصوص معنی متعین کرنا ممکن نہیں۔ یہ ایک غیر معین کثیر المعنی تصور ہے جس میں مختلف النوع ایشوز اور رویے شامل ہیں۔ مرد غالب معاشرہ اور پدری نظام سے لے کر معاشی استحصال، جنسی جبر اور دہشت تک، غیر مساوی حقوق، سماجی ناہمواری، قانونی عدم تحفظ، متضاد (منافقانہ) اخلاقی اقدار اور فرسودہ خاندانی/ازدواجی رشتوں سے لے کر کاروبار اور سیاسی اقتدار تک۔ اور ان سب کے مرکز میں تشخص کا مسئلہ جو ایسا محور ہے جس کے گرد یہ سارے مسائل مسلسل گردش کر رہے ہیں۔''[10]

ایک مغربی نقاد Cornell Drulla کا ماننا ہے کہ فیمنزم کوئی ایک تحریک یا نظریہ نہیں بلکہ مختلف تحریکات اور نظریات کا مجموعہ ہے۔ اپنی کتاب ''At the heart of freedom: feminism, sex and equal'' میں لکھتی ہیں:

> "Feminism is discourse that involves various movem
> philosophies which are concerned with issues of gende
> equality of women and campaign[11] for women rights and i

مذکورہ دونوں عبارتیں فیمنزم کی مختلف سمتوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس تحریک کی مختلف خصوصیات جو وقت اور زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی ہیں، لامحدود ہیں جنھیں کسی ایک دائرے میں مقفل نہیں کیا جا سکتا۔ اس تحریک کے بین السطور میں کوئی مخصوص نظریۂ حیات یا کوئی منظم جد و جہد موجود نہیں ہے۔ ہر گروہ، ہر طبقہ، ہر فرد فیمنزم سے متعلق اپنا ذاتی تصور رکھتا ہے۔ سب سے پہلے مختلف لغات میں موجود اس لفظ کے معانی پر غور کرتے ہیں۔

"The belief and aim that women should have the sa
oppertunities as men." (oxford advanced learner's D
English)

1-The beleif that men and women should have equal rig
2-organized activity on support of women's rights an
(The new Britanica-webster Dictionary & reference gu

"The policy, practice or advocacy of political, econ
women."(The new Lexicon Webster Dictionary of the eng

"Feminism is the theory of political, economics and s
(Merrium-Webster online dictionary, 2008)

"Feminism is the belief in the importance of gender
(Collins Dictionary and the sources, 2006)

"Feminism is a doctrine suggesting that women ar disadvantaged in women society and advocating equal o and women."

(penguine Dictionary of sociology)

مذکورہ لغات نے ایک ہی نقطے پر اپنے نظریے کو فوکس کیا ہے کہ تانیثی تحریک کے وجود میں آنے کا مقصد عورت کو زندگی کے ہر شعبے، چاہے وہ سیاسی ہو یا سماجی، معاشی ہو یا تعلیمی، میں مردوں کی طرح یکساں مواقع حاصل ہوں کہ وہ بھی اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کھل کر کر پائے۔ معاشرے نے اسے وہ موقع نہیں دیا جس کی وہ حقدار ہے۔ ہمیشہ اسے ہر معاملے میں پیچھے رکھا گیا۔ شروع سے ہی اس کی آنکھیں اور ذہن دونوں کھلے ہوئے تھے مگر ان میں احتجاج کا حوصلہ پیدا نہیں ہو پا رہا تھا۔ اسے کسی مضبوط سہارے کی ضرورت تھی جو اس تحریک کی شکل میں ملی۔ اس لیے آج وہ اس مرد بالا دست معاشرے میں مساوی حقوق کی دعویداری کر رہی ہے جو اس کا بنیادی حق ہے۔

اب مختلف انسائیکلو پیڈیاز میں اس کی تعریف پر نظر ڈالتے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا آف فیمنزم میں تانیثیت کی تعریف اس طرح موجود ہے:

"It is the advocacy of women's rights based on a be sexes, and in its broadest use the word refers to ev and seeking to end women's sub-ordination in any reason....Feminism originates in the perception that with society's treatment of women."

اسٹانڈفورڈ انسائیکلو پیڈیا آف فلاسفی میں فیمنزم کی تعریف اس طرح پیش کی گئی ہے:

"Feminism is the both an intellectual commitment and that seeks justice for women and the end of sexism i

انسائیکلو پیڈیا آف سوشیالوجی میں تانیثیت کی تعریف کچھ اس طرح سے ہے:

"Feminism: a movement that attempts to institute so political equality between men and women in society a relationship between men and women."

انٹرنیشنل انسائیکلو پیڈیا آف سوشیالوجی میں ''تانیثیت'' لفظ کی تعریف یوں رقم کی گئی ہے:

"The women's movement is a social movement whose age obtaining equal right and status for women in a ma Among its goals are that women be free to decide wha pursue and what life they want to adopt."

sociology dictionary.org میں لفظ فیمنزم کی اس طرح تعریف پیش کی گئی ہے:

1-The idea that women and men should have equal righ and self determination.

2-A social movement that advocates for economic, p equality between women and men.

3-A theoritical perspective stating women are unique oppressed and that challenges the idea of gender and

مختلف انسائیکلوپیڈیاز میں فیمنزم سے مراد مرد بالادست سماج میں صدیوں سے ظلم وجبر کا سامنا کررہی عورت جو آج اپنے وجود کے تشخص کے لیے بغاوت کا پرچم اٹھائے معاشرے کے ذریعہ معین کردہ حدود کو فلانگ کر چہار دیواری سے باہر نکل آئی ہے، اس کا یہ فیصلہ سماج کے منظم نظام کے لیے نہایت ہی ضروری ہے۔ کیونکہ معاشرے کی بنیاد مرد وعورت دونوں کے سبب قائم ودائم ہے۔ اسے انسانیت کے زمرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ اگر معاشرہ اپنا تشخص چاہتا ہے تو وہ برابری کے طریقے اور غیر جانبدارانہ رویے کو اپنائے۔ اگر یہ طریقہ شروع سے ہی روا رکھا گیا ہوتا تو آج ماحول ہی کچھ اور ہوتا جس کا تصور ہی آج کے دور میں ناممکن ہے۔ معاشرہ جسے مرد نے ہی قائم کیا تو اس پر سوال اٹھایا ہی نہیں جا سکتا کہ ایک صنف کے تئیں جانبداری کیوں برتی گئی۔ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ اپنے وجود کو بہتر وبرتر ثابت کرنے کے لیے خود غرضی کا رویہ اپنایا گیا۔ اور عورت کے تئیں ناانصافی برتی گئی۔ جب ظلم حد سے بڑھتا ہے تو اس کے خاتمے کے لیے فطرت کسی نہ کسی شکل میں اس کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے۔ قدرت کے بنائے ہوئے نظام کے ساتھ کھلواڑ کرنا اور اس کے بنائے گئے اصولوں میں اپنے فائدے کے مطابق تحریف کر کے ایک ایسا نظام پیدا کر دینا جو ایک کا رفیق اور دوسرے کا حریف بن جائے تو انجام کار ایسی تحریکات کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ جس کا مطلب ہے کے جس صنف کے ساتھ صدیوں سے ناانصافی برتی گئی ہے اس کے تشخص کی بحالی ہو۔ اسے زندگی کے ہر میدان میں برابری کا درجہ دیا جائے۔ اسے اپنی زندگی اپنی طرح سے جینے کی آزادی دی جائے۔ اسے قانونی تحفظ فراہم کیا جائے۔ اسے تعلیم کے ذریعہ اس لائق بنایا جائے کے وہ خود کفیل بن جائے نہ کہ اسے ایک ایک پیسے کے لیے مرد پر انحصار کرنا پڑے۔ ایسے معاشرتی قوانین جو دونوں صنفوں کے مساوی زندگی کے حق میں انصاف نہیں کر پا رہے ہیں، انہیں یکسر بدل دینا چاہیے۔ اور ایسا قانون رائج ہونا چاہیے جو برابری کا طریقہ روا رکھے اور دونوں کو بہ حیثیت انسان زندگی جینے کے مواقع فراہم کرے۔

اب 'تانیثیت' پر مختلف محققین اور مفکرین کے آراء پر نظر ڈالتے ہیں۔ فیمنزم کی ابتداء اور تعریف کے متعلق June Hannam لکھ رہے ہیں:

"The word 'feminism' meaning women's emancipation, w
political debates in late nineteenth century France
proclaim herself a feminist was the french women's
Hubertine Auclert."[12]

K. Ra... Kiutnij ... k"an نے اپنی کتاب "Feminism and ..." میں فیمنزم کی تعریف اس طرح کی ہے:

"Faminism is known as the movement 'of women, by wome
to achieve women's rights....The feminist make us b
stands for gender equality, independence and empowe
sexual freedom, reproductive rights, equality of opp
goals,"[13]

فیمنزم کی واضح تعریف پیش کرتے ہوئے مارگریٹ ایل اینڈرسن اپنی کتاب "Thinking about sociological perspectives on sex a میں لکھتے ہیں:

"Feminism begins with the premise that women's and
society are the result of social, not natural or bi
takes womens interests and perspectives seriously, be
not inferior to men....Although feminists do not beli
like men, they do believe that women's experiences,
as valuable as those of men and should be treated wi

and respect."[14]

فیمنزم کے بنیادی تصورات پر بحث کرتے ہوئے Chaman Lal نے لکھا ہے:

"I define Feminism as a mode of existance in which t
dependence syndrome. There is dependence syndrome whet
father, the community or a religious group. When wome
of the dependence syndrome and lead a normal life,
materializes."[15]

Dame Rebecca West نے معاشرے میں خود کی وجودی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے تانیثیت کا مفہوم اس طرح پیش کیا ہے:

"I myself have never been able to find out precisely
know that poeple call me a feminist whenever I expr
differentiate me from a doormat and a prostitute."[1

تانیثیت کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے قاضی افضال حسین اس تحریک کی تعریف یوں پیش کر رہے ہیں:

''معاشرے کی تشکیل کے لیے عورت اور مرد دونوں ضروری ہیں لیکن ان کے درمیان ربط کی نوعیت ایک مخصوص معاشرے کی معاشی اور تہذیبی ضرورتوں سے متعین ہوتی ہے۔ بیش تر معاشروں میں مرد اور عورت کا یہ تعلق ترجیحی نوعیت کا ہے۔ یعنی مرد ایک طاقتور، فاعل، حاکم اور معاشرے میں اقتدار کا ماخذ اور منصرم ہے جب کہ عورت کمزور، محکوم اور معاشرے کی مرکزی ضرورتوں کو پورا کرنے والی مفعول یا معروض ہے۔ تانیثیت کی سیاسی اور سماجی تحریکات کے لیے یہ غیر مساوی معاشرتی، معاشی نظام ہی ان کی جدوجہد کا اصل موضوع ہے۔''[17]

فہمیدہ ریاض نے فیمنزم کی جامع تعریف اس طرح پیش کی ہے:

''فیمنزم ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا مطلب لوگ اپنی اپنی طرح سے سمجھتے رہے ہیں۔ مگر میں نے جب بھی اسے استعمال کیا ہے یا کہا ہے کہ میں 'فیمنسٹ' ہوں تو ہر بار میرے ذہن میں اس کا یہی مطلب رہا ہے کہ عورت کے مکمل انسانی وجود کو تسلیم کیا جائے اور اس کے کسی بھی پہلو کو کچل کر نابود کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔''[18]

اپنے اسی لکچر میں عورت کے مکمل انسانی وجود کی وضاحت بھی کرتی ہیں جس کے ساتھ مختلف توقعات کا اطلاق ہوتا ہے جیسے جس معاشرے میں وہ رہ رہی ہے وہاں اسے ملکیت کا حق نہیں مل رہا۔ اسے کمانے لائق نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی محنت کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور نہ ہی محنت کا کوئی معاوضہ ملتا ہے۔ اسے ذہانت، دور اندیشی، تدبر جیسی انسانی صلاحیتوں سے مبرّا تصور کیا جاتا ہے۔ معاشرہ ان ساری چیزوں کا اطلاق مرد کے وجود کے ساتھ کرتا ہے مگر عورت بقول معاشرہ چونکہ مکمل انسان نہیں ہے اس لیے اسے بے وقوف، کم عقل، کمزور سمجھا جاتا ہے۔ جہاں مرد کو حاکم، مقتدر، منصرم اور فاعل مانا جاتا ہے وہیں اسے محکوم، معروض اور مرد کا دل بہلانے والی، اس کی ضروریات کو پورا کرنے والی مفعول سمجھا جاتا ہے۔ یہی وہ غیر مساوی نظام ہے جو تانیثی تحریک کے پیدا ہونے کا باعث بنا۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد مردوں کو ہدفِ تنقید بنانا نہیں ہے بلکہ اس بیج کو ڈھونڈ نکالنا ہے جس کی بنا پر عورتیں معاشرے میں غیر مساویانہ رویے کی شکار ہیں۔ اس لیے ان کی جنگ مردوں سے نہیں اور نہ ہی وہ مردوں کی طرح یا مرد بننا چاہتی ہیں بلکہ معاشرے اور پدرانہ سماج کے ان رویّوں، اقدار اور نظریات سے ہے جنھوں نے ان کو محکوم بنا دیا اور مجبور ثابت کر دیا۔ یہ رویے صرف مردوں ہی کے نہیں عورتوں کی نفسیات کو بھی حصار بند کئے ہوئے ہیں۔ اس

کی جڑیں بڑی گہرائی تک پیوست ہیں پھر بھی ایسی روایت کا ٹوٹنا نہایت ضروری ہے۔سماج کو چاہیے کہ وہ اس پر سنجیدگی سے غور کرے کہ ایک منظم معاشرے کی تشکیل میں عورت کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ مرد کی ہے،غور کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر عمل پیرا بھی ہو کہ عورت کو معاشرے میں برابری کا درجہ ملے کیوں کہ سماج کی صحیح معنوں میں ارتقاء تبھی ممکن ہے جب دونوں صنفیں اس میں برابر کے شریک رہیں۔مردوں کی طرح اسے بھی تعلیم کا حق دیا جائے کہ اس کے اندر مضمر صلاحیتوں کا مظاہرہ ہو پائے ملازمت کا حق بھی ملنا چاہیے کہ اس کے اندر انحصاری کا مادہ ختم ہو جائے اور وہ خود اعتماد بن پائے۔سیاست میں اسے پورا حق ملنا چاہیے کہ حکومت کی ساری سہولیات کا وہ بھی فائدہ اٹھا پائے۔جائداد میں اس کی ملکیت ثبت ہونی چاہیے کہ اس کے وجود کے تشخص کی بحالی ہو پائے۔یہ تحریک عورت کو Main Stream میں لانے والی تحریک ہے کہ وہ کھل کر سامنے آئے اور اپنے مطالبات کو دنیا کے سامنے اعلانیہ پیش کرے۔اور اپنے حقوق کے حصول کی جنگ لڑے۔

گزشتہ دو صدیوں میں فیمنزم کی تحریک نے خواتین کے لئے تعلیم اور ملازمت کے مساوی مواقع،جائیداد کی ملکیت کا موقع،ووٹ دینے کا حق،پارلیمنٹ میں نمائندگی کا موقع،برتھ کنٹرول،شادی اور طلاق وغیرہ حقوق کے حصول میں خاطر خواہ کام انجام دیا ہے۔مگر کہیں نہ کہیں آج کی جدید عورت اس تحریک کے بنیادی مقاصد بھلا کر بے راہ روی کا شکار ہو گئی ہے۔ مردوں سے جنگ یا اپنے حیاتیاتی نظام کے خلاف جا کر ان کی طرح بن جانا یا صدیوں سے ہو رہے ظلم و جبر کا بدلہ مردوں سے لینا،ان کو ان کے حقوق سے دور کر دینا،قدرت کے ذریعہ رائج کیے گئے سہولیات سے انہیں محروم کر دینا،زندگی کے ہر میدان میں انہیں کمتر اور خود کو برتر دکھانا وغیرہ اس تحریک کے مقاصد نہیں تھے۔مگر آج مساوات مرد و زن کے متعلق نام نہاد جدید خاتون کا نظریہ کہیں نہ کہیں انہی سارے عناصر سے جڑ چکا ہے۔عورت نے اپنے بدلے کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے فطری روش کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور مصنوعی طریقے کو اپنا لیا ہے جس کی بدولت خاندانی نظام تتر بتر ہو رہا ہے،بچے اپنے والدین کی محبت سے محروم ہو رہے ہیں،نوجوان پیڑھی جنسی بے راہ روی کا شکار ہو رہی ہے،مجرد رہ کر ہم جنس پرستی جیسی لعنت کو اپنایا جا رہا ہے،تولید کے فطری طریقے کو چھوڑ کر مصنوعی طریقوں کو اپنانے کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے۔شادی شدہ زندگیاں ابدی خوشیوں سے محروم ہو رہی ہیں جس کی وجہ سے معاشرے میں طلاق کی کثرت دیکھنے کو مل رہی ہے۔عورت اپنی ایسی ہی ناجائز مطالبات کو پورا کرنے کی دھن میں عقل سے عاری ہو چکی ہے۔اسے احساس بھی نہیں ہے کہ کل اس کا استحصال گھر کے اندر ہو رہا تھا اور آج گھر کے باہر ہو رہا ہے۔یہ آزادی نہیں ہے سراب کا سا دھوکہ ہے جو اس کے ارد گرد دبیز دھوئیں کی شکل میں گھیرا بنائے ہوئے ہے جس کے اس پار اسے کچھ نہیں دکھ رہا۔

مرد اور عورت دونوں ایک منظم معاشرے کے دو ستون ہیں۔کسی ایک کی بھی پامالی سے سماجی نظام ڈھے سکتا ہے۔دونوں کو چاہیے کہ قدرت کے ذریعہ متعین کیے گیے اپنے اپنے حدود کی شناخت کریں اور اس حد سے تجاوز کیے بنا اپنے تشخص کی لڑائی لڑیں۔اسی میں بنی نوع انسان کی بھلائی ہے۔نہ ہی عورت چاہ کر مرد بن سکتی ہے اور نہ ہی مرد عورت بن سکتا ہے۔دونوں صنفوں میں مختلف اشتراکات کے باوجود چند افتراقات بھی موجود ہیں۔چند ایسی صفات اور صلاحیتیں ہیں جو دونوں کے وجود کے ساتھ الگ الگ مختص کر دی گئی ہیں۔ہم اس سے منکر نہیں ہو سکتے۔بہ حیثیت انسان ایک مکمل وجود کے ساتھ سماج میں رہ کر ایک منظم معاشرے کی تشکیل کے لیے کوساں رہنا آج کے انسان کا نصب العین ہونا چاہیے۔

☆☆☆

تانیثیت کے اہم موڑ

عورت جس کے دم سے دنیا کی رونق قائم ہے، اسے ہر دور اور ہر ملک میں ذلت وخواری کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ دنیا اس کی نسوانیت کی شیدائی بنی مگر اس کی انسانیت کی منکر۔ اس کے وجود اور اس کی شخصیت کو مسخ کر دیا گیا۔ اسے ایک اضافی شئے مان کر دوسرے درجے میں رکھا گیا۔ ہر دور اور ہر ملک کی تاریخ عورت کی مظلومیت اور ہر میدان میں مرد کے غالب رجحان کی کہانی سناتی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مرد اور عورت کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا رحم مادر سے لے کر دنیا میں وارد ہونے تک کے معاملات میں دونوں کے ساتھ برابر کا سلوک روا رکھا گیا اور دونوں کے سامنے یکساں کیفیات اور حالات درپیش آئیں۔ دونوں نے ایک ہی معینہ مدت یعنی نو مہینے رحم مادر میں رہنے کے بعد اس فانی دنیا میں قدم رکھا۔ مگر دونوں کی پرورش اور پرداخت میں معاشرے کے ذریعہ پیش کردہ صنفی تضادات نے ایک کو برتر اور ایک کو کمتر درجے سے نوازا۔ مرد کو فاعل اور دہندہ (Giv) اور عورت کو مفعول اور حصولت کنندہ (Recei) کے زمرے میں رکھا گیا۔ چونکہ اس سماج میں مرد کی بالادستی ہمیشہ سے قائم رہی اس لیے رسم ورواج، قوانین، تہذیب ومعاشرت، اخلاقیات اور عورت کے لیے لائحہ عمل مرد نے اپنے مزاج کے مطابق تشکیل دی۔ جس کی بدولت عورت ان کی ملکیت اور ان کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بن کر رہ گئی۔ اس کی تذلیل اس حد تک کی گئی کہ اسے جانور صفت اور جرم کی پیداوار مانا گیا۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ جرم کی دنیا ہمیشہ مردوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے آباد رہی ہیں۔ ایم۔ عبدالرحمٰن خان لکھتے ہیں کہ:

> ''عورت مرد کی طرح زیادہ بداعمال و بدکردار نہیں ہوتی۔ قتل وغارت، زنا واغوا، ظلم وستم، غضب وسلب، شر وفساد، دجل وفریب، عداوت ومعصیت، چوری اور رشوت اور کفر ونفاق غرض یہ کہ ہر نوع کے گناہ میں مرد کا عورت سے زیادہ حصہ ہے۔'' 1

یہاں عورت کے متعلق روسو جیسے بڑے فلاسفر کا نظریہ بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے:

> ''روسو کا کہنا تھا مرد برائیوں اور خامیوں سے بھرا ہے۔ اس لیے عورت کو زیادتیاں سہنے کی عادت ڈال لینی چاہیے۔ اسے نرم خور رہنا چاہیے اور اس کے اندر ناانصافی کو برداشت کرنے کا حوصلہ ہونا چاہیے۔ اسے اپنے شوہر کی خرابیوں کو اُف کیے بغیر جھیل لینا چاہیے۔'' 2

اس کے باوجود عورت کو ہمیشہ کٹہرے میں کھڑا کیا گیا۔ خود کے ذریعہ قائم کردہ سماجی قانون کے زیر سایہ ہمیشہ اس کے ساتھ ناروا برتاؤ اور نازیبا سلوک روا رکھا گیا۔ اس کو حقیر ونجس مخلوق قرار دینا، اسے عیش کوشی کی شئے سمجھنا، اپنے خاندان کو آگے لے جانے میں یا اولاد پیدا کرنے میں صرف ایک معاون کی حیثیت دینا وغیرہ صرف عام مردوں کا نظریہ نہیں تھا بلکہ اپنے زمانے کے بڑے بڑے دانشور بھی ایسے ہی نظریات کے حامل نظر آتے ہیں۔ کسی نے اُسے شیطان کے آنے کا دروازہ کہا تو کسی نے اُسے ناپائیدار ہستی میں شمار کیا۔ کسی نے کہا اس سے بڑھ کر کوئی بھی کینہ پرور نہیں تو کسی کی نظر میں اس کی حکمرانی خدا کے لیے توہین آمیز ہے، کسی نے کمزوری کو عورت کے نام سے منسوب کیا تو کسی نے اس کو بغیر روح کے بدن قرار دیا، کسی نے کہا کہ عورت محض جنسی افعال کی تکمیل کا ذریعہ ہے تو کسی نے اس کی حقارت کو جہنم کے غصے سے بھی اعلیٰ درجہ عطا کیا۔ کسی کی نظر میں اس کی اصلاح کسی کتے کے پچھلے ٹانگوں کے چلنے کے برابر ہے، تو کسی نے کہا کہ عورت ہی وہ آخری شئے ہوگی جسے مرد مہذب بنائے گا، کسی نے اس کو خدا کی دوسری غلطی کہا تو کسی نے اس کے دو اقسام کی طرف اشارہ کیا ایک دیویاں اور دوسرا

پائیدان۔اپنے زمانے کا بڑا مفکر، دور اندیش، فلسفی داں ارسطو کا نظریہ ملاحظہ فرمائیں: ”مرد فطرتاً برتر ہے اور عورت کمتر، ایک حاکم ہے دوسرا محکوم۔“ مرد کی حکمرانی ”روح کی جسم پر اور ذہن کی اور عقلی عنصر کی جذباتی عنصر پر حکمرانی“ کے مماثل ہے۔ مرد کی فطرت ”بے حد تراشیدہ اور مکمل ہے۔“ عورت زیادہ دردمند ہوتی ہے لیکن اتنی ہی حاسد، اتنی ہی جھگڑالو اور لڑنے بھڑنے پر اتنی ہی مائل۔ اتنی شرم و حیا اور عزتِ نفس سے عاری، اتنی ہی دروغ گو، اتنی ہی دھوکے باز۔“ حیاتیاتی اعتبار سے عورت کو ناقص اور کمزور گردانتے ہوئے ارسطو کہتا ہے: عورت جیسے کہ ایک نامرد مرد ہو، کیوں کہ یہ ایک عدم صلاحیت کی وجہ سے ہے کہ عورت عورت ہے۔“ شادی کے متعلق اس کا کہنا ہے کہ: ”شادی کا مقصد اور عورت کا وظیفہ وارث مہیا کرنا ہے۔“

اس طرح سے یہ زمانے کی سائیکی بن گئی کہ عورت محکوم ہے اور مرد حاکم۔ اور اس کی حیثیت مال و اسباب کی نجی جائداد کی تھی۔ دیگر مال و اسباب کی طرح مرد اس کی بھی حفاظت اس لیے کرتا تھا کہ کہیں وہ کسی اور کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

> ”مادر سری سماج کے خاتمے کے ساتھ ہی اکثر ممالک میں عورت گائے بھینس کی طرح مرد کی ذاتی ملکیت بن کر رہ گئی۔ بردہ فروشی کے فروغ نے اسے جنسِ بازار بنا دیا۔ کنیزوں کو برسرِ عام بھیڑ بکریوں کی طرح بولی لگا کر بیچا جاتا تھا۔ سلاطین کی حرم سراؤں میں سیکڑوں منتخب کنیزیں رکھی جاتی تھیں جن کی نگرانی پر بے رحم خواجہ سرا مامور تھے۔ بادشاہ اور امراء اپنے دوستوں کو تحائف میں کنیزیں بھیجتے تھے۔ زر اور زمین کے ساتھ زن کو بھی بنائے فساد کہا جاتا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ذاتی املاک میں شامل تھی۔“[21]

مگر ہر انتہا کے بطن سے باغی پیدا ہوتے ہیں اور اس کے ہی زوال کا سبب بن جاتے ہیں۔ یہی وہ باغی جذبہ تھا جس نے عورت کو اس غیر انسانی سلوک کے خلاف آواز اٹھانے پر مجبور کیا اور آزادیٔ تحریکِ نسواں کا محرک بنا۔ تانیثیت کی باضابطہ تعریف پہلے ذیلی باب میں کی جا چکی ہے۔ یہاں تانیثی تحریک کے ارتقائی سفر پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی جائے گی۔

ظلم و جبر والے معاشرے میں صدیوں پہلے مظلوم عورت کے لیے مخفی طور پر کمتر پیمانے پر ہی سہی ظلم کے خلاف بغاوت کا جذبہ آہستہ آہستہ نمو پذیر ہو رہا تھا۔ انور سدید اپنی تصنیف ”اردو ادب کی تحریکیں“ میں فرماتے ہیں:

> ”عورت کو مرد کے مساوی حقوق دینے کی موثر آواز بیسویں صدی میں بھی اُبھرتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ذرا ماضی بعید میں جھانکیں تو معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون سے بھی دو سو برس قبل جس دانشور نے عورت کی ذہنی صلاحیتوں کو پہچانا اور انہیں بروئے کار لانے کے لیے عملی اقدام کیے وہ فیثا غورث تھا۔ مخلوط تعلیم کو بظاہر ہماری آنکھوں کے سامنے مقبولیت حاصل ہوئی ہے، تاہم فیثا غورث نے اپنے عہد میں بھی نوجوان لڑکیوں کو اپنے درس میں شامل ہونے کی اجازت دے رکھی تھی۔“[22]

مگر بقول سیمون دی بوا:

> "The first time we see a woman take up her pen in de Christine De Pizan, who wrote Epitre au Dieu d'Amour Love) in the 15th century.[23]

فرانسیسی ماہرِ خاتون Christine de Pizan (1365-1430) نے اپنی تحریروں کے ذریعہ یورپ میں تحریکِ آزادیٔ نسواں کی داغ بیل ڈالی۔ اپنی تحریروں کے علاوہ حقوقِ نسواں کے سلسلے میں ان کے ذریعہ کیے گئے مختلف مباحثوں نے بھی اس تحریک کو جلا بخشی۔ فرانس کی تحریکِ آزادیٔ نسواں میں ان مباحثوں کو "Querelles des Femmes" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سطوت ریحانہ لکھتی ہیں:

> ”تحریکِ نسواں کو Pizan کی سب سے بڑی عطا یہ ہے کہ اس نے صدیوں سے رائج ثقافتی روایت سے بر

گشتگی کی بنیاد فراہم کی۔ 24

Modesto di Pozzo اور Heinrich Cornelius Agrippa نے سولہویں صدی عیسوی میں اور Marie le Jars de Gournay, Anne Bradstreet اور Francois Poullain نے سترہوں صدی عیسوی میں اس اہم موضوع پر قلم اٹھایا۔ مغربی یورپ میں اٹھارویں صدی کے اوائل میں ہولڈ برگ (Hold Berg) اور کینڈورسٹ (Candogest) اور ہال بیک (Hal Beck) نے طبقۂ تذکیر کی طرح طبقۂ نسواں کی شہریت اور تعلیمی حقوق کا مطالبہ کیا۔ 1787ء میں امریکی پارلیامنٹ میں بھی عورت کے ووٹ دینے کے حق میں آواز اٹھائی گئی۔ جس قدر اس کی موافقت میں صدائیں بلند کی گئیں اسی زور وشور سے اس کی مخالفت بھی ہوئی۔ اس لیے یہ زیادہ کارگر ثابت نہیں ہو پائی۔ 1789ء میں خواتین کے ایک گروپ نے فرانس کی نیشنل اسمبلی میں حقوق نسواں کا ایک ڈکلریشن پیش کیا۔ چونکہ فرانس میں یہ تصور عام تھا کہ عورت کا وجود اس لیے ضروری ہے کہ وہ مرد کے لیے سودمند ثابت ہو سکے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں، اس بنا پر اس ڈکلریشن کو بھی مسترد کر دیا گیا۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہی اس موضوع پر بین الاقوامی سطح پر غور وفکر کی ابتداء کے سبب زیادہ تر مصنفوں نے نظریاتی سطح پر باضابطہ اس موضوع پر لکھنا شروع کیا۔ اٹھارویں صدی میں وقوع پذیر انقلابِ فرانس، جسے آزادیٔ نسواں کا پہلا اعلانیہ کہا جاتا ہے، نے جہاں انسانی زندگی کو مختلف طرح سے متاثر کیا وہیں تحریکِ آزادیٔ نسواں کی راہیں بھی ہموار کیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ عورت کی آزادی کے سلسلے میں سب سے پہلا مضمون ایک فرانسیسی فلاسفر نکولا دی کوندرسے نے 1790ء میں "On the Admission of women to the Rights of Citizenship" کے نام سے لکھا جس میں اس نے پہلی بار عورت کی حق رائے دہندگی کی پُرزور حمایت کی۔ 1791ء میں فرانسیسی فیمنسٹ Olympe de Gouges نے "Declaration of the Rights of Man and of the Citizen" (جو 1789ء کی ایک دستاویز ہے جسے فرانس کے نیشنل اسمبلی میں 26 اگست 1789ء کو منظوری ملی تھی) کے جواب میں "Declaration of the Rights of woman and the female citizen" لکھا۔ اس اعلان نامہ کے بین السطور میں جنسی مساوات کے سلسلے میں انقلابِ فرانس کی ناکامی کو بے نقاب کرنا Olympe de Gouges کا مقصد تھا۔ انقلابِ فرانس کے بارے میں زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

> ''انقلابِ فرانس کے موقع پر ''مساوات'' کا نعرہ لگایا گیا تھا اور اس نعرے نے عورتوں کو بہت لبھایا تھا۔ پیرس کے شہریوں کا وہ بڑا ہجوم بادشاہ اور ملکہ کو ان کے محل سے نکال کر لایا تھا ان میں اکثریت عورتوں کی تھی، لیکن انقلاب جب کامیاب ہو گیا تو ان عورتوں کو اور ان کی بے مثال قربانیوں کو بھلا دیا گیا۔'' 25

Olympe de Gouges کی اس سرکشی پر اسے طعن وتشنیع کا نشانہ بننا پڑا اور آخر کار اسے سزائے موت دے دی گئی۔ Olympe de Googes کے متعلق زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

> ''اس کا بھی گلوٹین سے سر قلم ہوا اور وہ یہی کہتی ہوئی مقتل تک گئی کہ کیا یہ وہی شاندار انقلاب ہے جس نے فرانس کی عورتوں اور مردوں دونوں پر اپنی کرنیں پھیلائی تھیں۔'' 26

اس کے بعد ایک بہت بڑی مفکر Mary Wollstonecraft جنہیں برطانیہ فیمنزم کی دادی اماں (Grandmother of British Feminism) کہا جاتا ہے، کی پہلی تحریر ایک خط کی شکل میں ہے جس کا نام "A vindication of the Rights of

جو، ایڈمنڈ برک (Edmund Burke) کی تصنیف "Reflections on the Revolution in France" (1790) ہے، کے جواب میں لکھا۔ اپنی اس تحریر میں انہوں نے شہنشاہی سلطنت پر حملہ بولتے ہوئے جمہوری سلطنت کی وکالت کی ہے۔ اپنی معرکتہ الآرا تصنیف "A Vindication of the Rights of Women" (1792) انقلابِ فرانس کے ہنگامہ خیز منظر نامے، جہاں تعلیمی اور سیاسی تھیوری میں عورت کی تعلیم کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی، کے خلاف لکھا۔ اپنی اس تصنیف میں انہوں نے قوم کے لیے عورت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بنیادی حقوق میں مردوں کے ساتھ عورتوں کی برابری کے حقوق کو بھی اجاگر کرنے کی آفاقی کوشش کی۔ اس طرح نظریاتی سطح پر تانیثیت کو فروغ حاصل ہوتا رہا اور جس نے آہستہ آہستہ عملی شکل بھی اختیار کرنی شروع کی۔

1848ء میں سیاست کے میدان میں حقوقِ نسواں کی صدا بلند ہوئی اور اس مسئلے کی صدائے بازگشت فرانس کے پارلیمنٹ میں بھی سنی گئی۔ مگر پارلیمنٹ کی دستور ساز کمیٹی نے اسے بھی کثرتِ رائے سے رد کر دیا۔ امریکی خواتین کی تحریک میں اس وقت جوش پیدا ہوا جب 1848ء میں نیو یارک کے قریب سینیکا فالز (SENECA FALLS) کے مقام پر ایک قومی کانونشن (Women Rights Convention) منعقد ہوا جس میں مرد اور عورت ملا کر سو لوگوں نے شرکت کی۔ اس کانونشن میں خواتین نے ایک مشہور و معروف "جذبات کا منشور" (Declaration of Sentiments) پیش کیا۔ جس کا خلاصہ محمد رفیق چودھری نے "اسلام اور نظریۂ مساواتِ مرد و زن" میں اس طرح پیش کیا ہے:

> "تاریخِ انسان گواہ ہے کہ عورت ہمیشہ مرد کے ظلم و ستم کا شکار رہی ہے۔ آج بھی عورت کی یہ حالت ہے کہ موجودہ جمہوری نظامِ سیاست میں اس کی کوئی آواز اور شنوائی نہیں۔۔۔۔ اسے عوامی نمائندگی کا حق حاصل نہیں۔۔۔۔ مرد اپنی مرضی سے حکومت کے اختیارات پر قبضہ کر کے عورتوں کے خلاف قانون سازی کرتا ہے اور عورتوں کے لیے لازم ہے کہ وہ مردوں کے بنائے ہوئے یک طرفہ اور من مانے قوانین کی پابندی کریں۔ ملک کے جاہل اور گنوار مردوں کو وہ حقوق حاصل ہیں جن سے تعلیم یافتہ عورتیں بھی بالکل محروم ہیں۔ معاشرے میں شادی شدہ عورت زندہ درگور ہے۔ اسے ملکیت کا حق حاصل نہیں یہاں تک کہ جو کچھ وہ خود کماتی ہے، وہ اس کا اپنا نہیں ہے۔ اس کی کمائی کا مالک بھی اس کا شوہر ہوتا ہے۔ بہ وقت شادی عورت سے یہ عہد لیا جاتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے ہر جائز و ناجائز حکم کو مانے گی۔۔۔۔ تمام اچھی ملازمتوں پر مردوں کی اجارہ داری ہے، عورتوں کو مردوں سے کم تنخواہ دی جاتی ہے۔۔۔۔ آج ایک عورت مذہبی، معلم، ڈاکٹر یا قانون داں نہیں ہے۔ اسے کالجوں میں داخلہ نہیں مل سکتا۔ وہ کسی بھی تعلیمی ادارے میں جا کر تعلیم حاصل نہیں کر سکتی۔ مذہب کا میدان ہو یا سیاست کا، عورت صرف ماتحت اور محکوم ہے۔۔۔۔ اس ملک میں ہم محسوس کرتی ہیں کہ ہمیں مذہبی و معاشرتی طور پر ذلیل و خوار کیا گیا ہے۔ ہم مظلوم ہیں ہمارا استحصال ہوا ہے۔ ہمیں ہمارے جائز حقوق نہیں دیئے گئے، اب ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ ہمیں امریکہ کے مرد شہریوں کے برابر مساوی حیثیت دی جائے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمیں اپنے مقصد کے حصول میں بہت سی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا مگر ہم ہمت نہیں ہاریں گی۔۔۔۔ جائز ذرائع اور پر امن طریقے سے اپنی جدوجہد جاری رکھیں گی۔ ہم جگہ جگہ کنونشن منعقد کر کے رائے عامہ کو ہموار کریں گی تاکہ حکومت سے اپنی جائز مطالبات منوا سکیں۔"[27]

اس منشور کے تحت طے کردہ ایجنڈے کے مطابق امریکی خواتین نے اپنی جد و جہد کو جاری رکھا اور انہیں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ یہی وہ منشور ہے جو بعد میں آزادیٔ تحریکِ نسواں کی تمام تر سرگرمیوں کی بنیاد بنا۔ اس میدان میں جرمنی اور انگلینڈ بھی پیچھے نہیں تھے۔ انگلستان میں اس تحریک کی خاصی حمایت ہوئی۔ چونکہ یہ تحریک اب عوامی تحریک بن چکی

تھی، نتیجتاً 1849ء میں بیڈفورڈ (Bedford) میں عورتوں کے لیے ایک کالج قائم کیا گیا۔ 1850ء میں ایک اور درسگاہ نارتھ لندن کالجیٹ اسکول (North London Collegiate School) کی داغ بیل پڑی۔ برطانوی فلاسفر جان اسٹوارٹ مل (John Stuart Mill) کی شہرۂ آفاق تصنیف (1869) "The Subjection of Women" تانیثی تحریک کے لیے بڑی کار آمد ثابت ہوئی۔ اس کتاب کا ترجمہ افتخار شروانی نے ''عورت کی محکومیت'' کے نام سے اور مولوی معین الدین صاحب انصاری نے ''محکومیتِ نسواں'' کے نام سے کیا۔ اپنی اس کتاب میں صدیوں سے رائج مرد حاوی معاشرے کی پیدا کردہ روایت جس میں عورت کو ایک دوسرے درجے کی، مغلوب اور تابعدار صنف کا درجہ دیا گیا تھا، اس کی مخالفت کی اور بڑے ہی بے باکانہ انداز میں زندگی کی ہر سطح پر مرد اور عورت دونوں صنفوں کی برابری کا مطالبہ کیا۔ 1867ء میں انگلینڈ کی پارلیمنٹ کے سامنے عورت کی حق رائے دہندگی کی حمایت میں Mill کی تاریخی تقریر بھی تانیثی تحریک کو استحکام بخشتی ہے۔ Mill کی بیوی Heriat اور سوتیلی بیٹی Helen Trailer جو ماں کی وفات کے بعد مل کے ساتھ رہنے لگی تھی، حقوقِ نسواں کی اشاعت میں ہمیشہ سرگرمِ عمل رہیں۔ ایک دانشور خاتون لیین ریچیر (Leon Richer) نے 1869ء میں ''عورت کے حقوق'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس کے بعد 1878ء میں اسی موضوع پر ایک بین الاقوامی کانفرنس بھی منعقد کروائی۔

انہیں مفکرین کی کوششوں کا ثمرہ تھا کہ یونائیٹڈ کنگڈم کے پارلیمنٹ میں 1870ء میں Married Women's Property Act 1870 (33 & 34 Vict. c. 93) پاس ہوا۔ جس کے سبب شادی شدہ عورتیں معاشی اعتبار سے خود کفیل ہو گئیں۔ 1870ء میں آکسفورڈ اور کیمبرج میں بھی عورتوں کے لیے درس گاہیں قائم کی گئیں۔ انگلینڈ اور امریکہ میں آزادیٔ نسواں کی تحریک کی عملی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے فرانس، جو اس تحریک کا بنیادی مرکز تھا میں 1876ء میں Union Des Femmes کے نام سے عورتوں کے لیے ایک انجمن قائم کی گئی۔ اور اسی انجمن کے ذریعہ عورتوں کے حقوق کے حق میں عملی جدوجہد کی ابتداء ہوئی۔ اور یہی وہ دور تھا جہاں عورت کی حق رائے دہی کی تحریک کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ حق رائے دہی تحریک کی سرگرم شروعات 1897ء میں قائم کیے گئے ادارہ "National Union of Women's Suffrage Societies" کے ذریعہ سے ہوئی۔ فوسٹ "Fawcett" نے دلائل کے ساتھ یہ بحث کی کہ پارلیمنٹ کے تشکیل شدہ قوانین کو مرد و عورت دونوں مانتے ہیں، عورتیں مردوں کے برابر ہی ٹیکس ادا کرتی ہیں، اسکولوں میں اچھے عہدوں پر فائض ہو کر اہم ذمّہ داریاں نبھاتی ہیں تو انہیں ووٹ دینے کے حق سے کیوں محروم رکھا گیا ہے؟ عورت کی حق رائے دہی کی تائید میں 1903ء میں Emmeline Pankhurst اور ان کی دو بیٹیوں Christabel اور Sylvia نے مل کر "Women's social and political union" کی بنیاد ڈالی۔ جس کے ماتحت خواتین کے احتجاج نے نہایت ہی باغیانہ شکل اختیار کر لیا۔ تشدد کے راستے کو اپناتے ہوئے کھلے عام جلوس نکالے گئے، چرچ اور گھروں میں آگ لگادی گئی۔ بھوک ہڑتالیں ہوئیں، پولیس پر پتھراؤ بھی کیا گیا، نتیجتاً 1918ء میں ترمیم شدہ بل Representation of the People Act کے تحت انگریز عورتوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوا۔ امریکہ میں ووٹ کا حق 1920ء میں، برطانیہ میں 1928ء میں، سوئیٹزرلینڈ میں 1971ء میں اور فرانس میں 1944ء میں ملا۔ جبکہ یو این او کی طرف سے یہ حق 1952ء میں ملا۔

تانیثی تحریک کے فروغ میں انگریزی مصنفہ Adeline Virginia Woolf کی تصنیف ''اپنا خود کا ایک مقام'' (A Room of once own) کی اہمیت قابلِ ذکر ہے۔ یہ کتاب 24 اکتوبر 1929ء کو پہلی بار شائع ہوئی۔ یہ دراصل کئی لکچرس کا مجموعہ ہے جو مصنفہ نے 1928ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے دو ومنس کالج Girton and Newnham College میں پیش کیا تھا۔ مصنفہ کے خیال میں مرد حاوی معاشرے میں عورتیں کھل کر اپنے احساسات و جذبات پیش نہیں کر پاتی ہیں۔ مرد بالادست کلچر ان کی نفسیات پر اس قدر حاوی ہو چکا ہے کہ ان کے جذبات کے مظاہرے میں مردانہ قائم کردہ آثار و کیفیات کی

جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔عورت کی کوئی پرائیویسی (Privacy) نہیں ہے۔گھر ہو یا باہر لکھنے پڑھنے کے لیے علیٰحدہ کوئی اپنی جگہ نہیں ہے۔مصنفہ عورت کے لیے ایک مخصوص مقام کی مانگ کرتی ہے جس پر مرد حاوی نظام کا غلبہ نہ رہے اور وہ آزادانہ طور پر اپنے احساسات کی ترجمانی کر پائے اور اپنی ایک پہچان بنا پائے۔وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

> ''وولف دراصل عورتوں کو ذیلی ثابت کرنے کے لیے کئی صورتیں اپناتی ہیں اور ان صورتوں میں پدری نظام کی بحث چھیڑ دیتی ہیں جو عورتوں کے ذہن و دماغ پر حاوی ہوتا ہے۔اس مضمون سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ورجینیا وولف لازماً اینڈروگائنی (Androgyny) کا تصور پیش کرنا چاہتی ہے جو ایک پیچیدہ نقطۂ نظر ہے۔مقصود یہ ہے کہ مرد کی تو الگ شناخت ہوتی ہے لیکن عورتوں کی شناخت میں دونوں جنس ہم آمیز کر دی جاتی ہیں۔یعنی کچھ حصہ ایسے جذبات کا ہوتا ہے جو عورتوں کا خاصہ ہے اور کچھ حصہ مردانہ کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔اینڈروجینس (Androgynous) یعنی ذوجنسی کیفیت عورتوں کی شناخت کی راہ بند کر دیتی ہے۔لہٰذا اس کی فکر، سوچ، صورت سبھی زد میں آجاتی ہیں۔''[28]

فرانس میں 1940ء کے بعد تانیثی تحریک کو مزید استحکام عطا کرنے میں سیمون دی بوا (Simon De Beauvoir) نے اہم کردار ادا کیا۔اس کی شہرۂ آفاق تصنیف فرانسیسی زبان میں (La Deuxieme Sex 1949) ہے جس کا انگریزی ترجمہ ''دی سیکنڈ سیکس'' (The Second Sex) کے نام سے 1953ء میں شائع ہوا۔اسے تانیثی تنقید کا بائبل بھی کہا جاتا ہے، اس نے حامیٔ تحریکِ آزدیٔ نسواں کو نئی سوچ و فکر عطا کی۔اس کتاب میں مصنفہ نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ مرد نے اپنی منفعت کے لیے عورت کو دوسرے درجے میں رکھا ہے اور اسے ثانوی جنس بنا کر رکھنا پدری نظام کا مرکزی تصور رہا ہے۔اس لیے ان کا ماننا ہے کہ عورت پیدا نہیں ہوتی بنا دی جاتی ہے۔اس میں انہوں نے اس کے وجود سے متعلق بحث کی ہے۔مثلاً عورت کیا ہے اس کا وجودی پہلو قدرتی ہے یا اضافی شئے؟ اگر عورت، مرد کے بغیر نہ کے برابر ہے تو یہ اصول مرد کے وجود کے ساتھ کیوں منسلک نہیں کیا جاتا۔صرف عورت ہی مرد کی نسبت سے پہچانی جاتی ہے مگر مرد کیوں نہیں؟ اپنی دوسری کتاب "Women: Myth and Reality" میں سیمون دی بوا نے عورت اور مرد کے روایتی تصور پر ضرب لگادی ان کے خیال میں مرد کو اپنی تذکیریت اور عورت کو اپنی نسائیت ثابت کرنے کے بجائے دونوں اپنی انسانیت کا مظاہرہ کریں تو یہ نظامِ عالم کے لیے بہتر ثابت ہو سکتا ہے۔مختلف زبانوں میں پہلی کتاب The second sex کا ترجمہ ہوا ہے۔اردو میں اب تک اس کے دو تراجم منظرِ عام پر آچکے ہیں۔کشور ناہید نے اس کتاب کے حصّہ دوم کی تلخیص اردو زبان میں ''عورت ایک نفسیاتی مطالعہ'' کے نام سے کیا ہے۔دوسرا یاسر جواد نے ''جسمانی، تاریخی، نفسیاتی، اور معاشرتی مطالعہ-عورت'' کے نام سے کیا ہے۔

تانیثی مفکر Betty Friedan کی مشہور کتاب The Feminine Mystique (1963) نے تانیثی تحریک کو ایک سمت عطا کیا۔Betty Friedan نے اپنی اس تصنیف میں ایک چہار دیواری میں قید گھریلو عورت کی خستہ حالت پر سوال اٹھایا ہے اور اس چہار دیواری کو اس کے لیے عذاب خانہ بتایا، جس میں وہ مقید رہتی ہے۔اس لیے وہ عورت کی تعلیم اور ملازمت کا مطالبہ کرتی ہے۔اس کتاب نے ایک فکر انگیز انقلاب کو جنم دیا اور امریکی معاشرے میں ہلچل مچادی۔اسی طرح امریکی فیمنسٹ Katherine Murray Millett عرف Kate Millett کی کتاب "Sexual Politics" جو ان کی Ph.D کا مقالہ تھا، تانیثی تحریک کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔Kate Millett نے عورت کی مسخ شدہ فطرت اس کی خود سپردگی کا عالم اور مختلف جنسی مسائل پر تفصیلی بحث کی ہے۔عورت کے متعلق رائج روایتی سوچ جسے مردانہ نظام نے مذہب سے منسلک کر دیا ہے، مثلاً وہ ایک ناپاک جنس ہے، تمام برائیوں کا مرکز ہے، اس کے اندر شیطانی روح بستی ہے، وہ برے فطرت کی ہوتی ہے، ان

تمام غلط نظریوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا ہے۔ دورانِ حیض اسے ناپاک سمجھ کر اس سے دوری برتنا بھی کیٹ ملیٹ کی نظر میں عورت کی تذلیل بلکہ توہین ہے۔ بچے پیدا کرنے کے معاملے میں وہ عورت کو آزاد دیکھنا پسند کرتی ہیں۔ اس لیے انہوں نے Sparm Bank سے ماں بننے کے طریقے کی وکالت کی ہے۔ عورت کی جنسی آزادی کی تائید میں بول رہی ہیں کہ وہ کوئی جائداد نہیں ہے یا اتنی بھی مجبور نہیں ہے کہ معاشی تحفظ کے لیے بہ حالاتِ مجبوری مرد سے جنسی تعلقات قائم کرے۔

اس طرح مختلف اور لاتعداد مسائل کے ساتھ تانیثی تحریک کے ذریعہ خواتین پوری دنیا میں کھل کر سامنے آئیں۔ انہی جاں باز خواتین کے بے باکانہ نظری اور عملی کارکردگیوں کے سبب آج پوری دنیا میں مکمل طور سے نہ سہی مگر اپنے وجود کو منوانے میں عورت بڑی حد تک کامیاب ہو چکی ہے۔ اپنے مقالات اور مباحثوں کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کر رہی ہے کہ زندگی کی دوڑ میں وہ مردوں کے برابر مساوی حقوق کی اہل ہے۔ جوں جوں اس تحریک کو فروغ ملتا رہا خواتین کے اندر خود شناسی اور خود اعتمادی کا مادّہ پیدا ہوتا رہا۔ ان کے ذریعہ مختلف اور متعدد مطالبات سامنے آئے۔ ان میں تین کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ تعلیمی آزادی، معاشی آزادی اور سیاسی آزادی۔ اس تحریک کے علم برداروں نے عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے پر متحرک کیا۔ جس کے ذریعہ وہ اپنی صلاحیتوں سے خود آگہی حاصل کر پائیں اور بہتر انسان بن پائیں۔ اگر انہیں تعلیم کے مواقع دیے جائیں تو وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں مردوں کی طرح بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتی ہیں۔ تحریک کے علم برداروں کی انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتداء میں یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں لڑکیوں کو لڑکوں کی طرح طرح طرح کے عصری علوم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ 1848ء کے انقلابِ جرمنی کے زیرِ اثر کالج قائم کیے گیے جہاں لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ 1870ء میں جرمنی میں ثانوی درجات تک تقریباً دوسو کالج تھے جن میں لڑکے اور لڑکیاں زیرِ تعلیم تھیں۔ 1888ء میں General Association of German Women Teachers کے نام سے جرمنی میں ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ برلن میں لڑکیوں کو کالج میں داخلہ کی تربیت دینے کے لیے ایک تربیتی نصاب مرتب کیا۔ جرمن محکمۂ تعلیم کی مخالفت کے سبب اس تربیتی نصاب میں تھوڑی بہت تبدیلیاں کر کے اسے لڑکوں کے نصاب کے مساوی کر دیا۔ اس کی کوششوں سے جرمنی کے مختلف صوبوں کی یونیورسٹیوں میں لڑکیوں کو تعلیم کے مواقع حاصل ہوئے۔ بیڈن یونیورسٹی جرمنی کی پہلی یونیورسٹی ہے جس نے 1900ء میں لڑکیوں کو میٹرک کرنے کی اجازت دی۔ 1914ء میں چار ہزار سے زائد طالبات جرمنی کی مختلف یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم تھیں۔ University of Zurich یورپ کی ایسی پہلی یونیورسٹی ہے جس نے 1865ء میں لڑکیوں کے داخلے کی اجازت دی۔ لندن یونیورسٹی نے پہلی بار 1878ء میں انگریز خواتین کو اسناد سے نوازا۔

انگلینڈ دنیا کا پہلا ملک ہے جہاں سب سے پہلے خواتین سیاسی حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ 1847ء میں Anne Knight کی قیادت میں خواتین کی رائے دہندگی کے حق کے حصول میں چند خواتین نے مل کر پہلی خواتین سیاسی تنظیم First English Female Political Association کی بنیاد ڈالی۔ انگلینڈ میں National Union of Women Suffrage Societies (N.U.W.S.S) تنظیم جو 1897ء میں قائم کی گئی تھی، اپنے علمبرداروں کی ذہنی منافقت کی وجہ سے دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک N.U.W.S.S اور دوسری Women's Social and Political Union (W.S.P.U)۔ ان دونوں تنظیموں کی انفرادی کوششوں کے طفیل انگلینڈ میں 1918ء میں تیس سال سے زائد عمر کی عورتوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوا۔

اس تحریک کی مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں 1919ء میں Sexual Disqualification Act پاس ہوا جس سے خواتین کو وکیل، جیوری ممبر، جج اور رکنِ ایوان بننے کی سرفرازی حاصل ہوئی۔ 1923ء میں ''قانونِ طلاق'' نافذ کیا گیا جس میں طلاق کو مرد اور عورت دونوں کے مساوی قرار دیا گیا۔ 1925ء میں اپنی اولاد پر عورت کو اپنے شوہر کے برابر حق حاصل ہوا۔ یہاں تک

کے اسقاطِ حمل کا حق بھی انھیں 197ء میں مل گیا۔

یو۔این۔او نے مرد کے برابر عورت کے یکساں حقوق کے لیے ابتداء ہی سے ایک کمیشن قائم کیا تھا۔اس کمیشن نے 30 سال کی تحقیق کے بعد ایک دستاویز CONVENTION ON THE ELIMINATION OF ALL FORMS OF DISCRIMINATION AGAINST WOMEN (CEDAW DOCUME کے نام سے تیار کیا۔اس بین الاقوامی معاہدہ کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 18 دسمبر 1979ء کو تسلیم کیا۔3 ستمبر 1981ء کو اسے نافذ کیا گیا۔ابتداء سے ہی 20 ممالک نے اس دستاویز پر تصدیق کی مہر لگائی۔30 اپریل 2015ء میں ساؤتھ سوڈان (South Sudan) کی رضامندی کے بعد کل 190 ممالک اس بین الاقوامی معاہدے کے ساتھ اپنی اپنی تصدیق کا اظہار کر چکے ہیں،ان میں پاکستان کے ہمراہ مختلف مسلم ممالک بھی شامل ہیں۔اس کمیشن نے ہر طرح سے عورت سے جڑے ہوئے امتیازات کا خاتمہ کر کے مرد اور عورت کے درمیان تعلیم،سیاست،ملازمت،معاش ، اخلاق اور معاشرہ غرض ہر میدان میں مساوات قائم کرنے کے لیے تجاویز اور سفارشات پیش کیں۔اس دستاویز کی کل 30 (6) دفعات میں پہلی سولہ اپنے اپنے ممالک میں دونوں کے حقوق کو مساوی کرنے کے وعدوں پر مشتمل ہیں۔اور باقی 14 دفعات ایسی کمیٹیوں کو تشکیل دینے کے بارے میں ہیں جو کنونشن کے معاہدوں کو عملی جامہ پہنانے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر اس کی عملی رفتار کا جائزہ لیتی ہیں۔

یو۔این۔او کی طرف سے میکسیکو شہر میں 1975ء میں (19 جون تا 2 جولائی) خواتین کی پہلی عالمی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں مختلف ممبر ممالک کے 133 نمائندوں نے شرکت کی اور چھ ہزار کے قریب این۔جی۔اوز اس کانفرنس میں شامل ہوئے۔چونکہ یو این او کی طرف سے 1975ء کو International Women کا نام دیا گیا تھا اس لیے اس عالمی کانفرنس کا عنوان World Conference of the International women's رکھا گیا تھا۔اسی طرح دوسری عالمی کانفرنس کوپن ہیگن (14 تا 30 جولائی 1980ء) میں منعقد کی گئی تھی۔یو۔این۔او کی طرف سے 1976ء سے 1985ء تک کے سال کو United Nations Decade for Women کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔اس لیے اس کانفرنس کا اصل عنوان تھا World Conference of the United Nations Decade for Women: Peace۔اس کانفرنس میں تقریباً 145 ممالک جمع ہوئے تھے۔اس کا مقصد پہلی کانفرنس کے مقاصد کس حد تک کارگر ثابت ہوئے اس تک رسائی حاصل کرنی تھی،اور عورت کی ملازمت،صحت اور تعلیم پر توجہ مرکوز کی گئی تھی۔جائداد میں خواتین کا حق،بچے کی نگرانی اور قومیت کا حق جیسے مدعوں کو اٹھایا گیا تھا۔

تیسری عالمی کانفرنس 1985ء (15 تا 26 جولائی) کو نیروبی میں منعقد کی گئی تھی۔اس کانفرنس کا عنوان تھا: World Conferene to Review and Appraise the Achievements of the Equality, Development and Pea۔جیسا کے عنوان سے ظاہر ہے کہ دوسری عالمی کانفرنس میں پیش کردہ مقاصد کی عملی کارکردگی میں کس حد تک کامیابی ملی اس کا معائنہ کرنا اور مقصد کے حصول کی راہ میں پیش آنے والی رکاوٹوں کا خاتمہ کرنے کے طریقوں کو پیش کرنا اس کانفرنس کا مقصد تھا۔اس کانفرنس میں 157 ممبر ممالک کے تقریباً 1900 نمائندوں نے شرکت کی تھی اور 1200 کے قریب این جی اوز اس کا حصہ بنے تھے۔

یواین او کی طرف سے خواتین کی چوتھی اور سب سے بڑی عالمی کانفرنس بیجنگ میں منعقد کی گئی۔اس میں تقریباً دنیا کے دو سو ممالک کے پچاس ہزار نمائندے شامل تھے،تیس ہزار کے قریب سرکاری اور بیس ہزار کے قریب این۔جی۔اوز نے اس میں حصّہ لیا تھا۔اس کانفرنس کے اجنڈے کا نام ’’بیجنگ ڈرافٹ‘‘ تھا۔پروفیسر ثریا بتول علوی نے 12 صفحات کے اس ڈرافٹ کی چیدہ چیدہ دفعات کو اس طرح پیش کیا ہے:

(1) مرد اور عورت میں کوئی فطری فرق موجود نہیں ہے۔

(2) عورت کے روایتی کردار (یعنی بحیثیت ماں، بیٹی، بیوی وغیرہ) کو اس ڈرافٹ میں تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

(3) اسمبلیوں اور دیگر منتخب اداروں میں عورتوں کا کوٹہ 50% ہونا چاہیے۔

(4) معاشرے کے ڈھانچے کو اس طرح تبدیل کیا جائے کہ مرد و عورت میں برابری وجود میں آسکے۔

(5) ملازمتوں میں 50% کوٹا عورتوں کے لیے مخصوص کیا جائے۔

(6) بچے پیدا کرنے کا حق عورت کو ملنا چاہیے۔ یعنی اس پر خاوند یا کسی اور کا دباؤ نہ ہو۔ اپنی مرضی و اختیار رہو، چاہے تو بچے کو جنم دے اور چاہے تو نہ دے۔

(7) اسقاطِ حمل کو جائز قرار دیا جائے اور اس کا حق عورت کے پاس ہونا چاہیے۔

(8) عورت کو بھی ہم جنس پرستی کی قانونی اجازت دی جائے۔ اسی طرح جسم فروشی کی بھی قانونی اجازت ہونی چاہیے۔

(9) اس ڈرافٹ میں شادی نکاح وغیرہ کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔

(10) اس میں بنیاد پرستی پر بھی تنقید کی گئی ہے۔ اسی طرح خود مذہب پر بھی تنقید کی گئی ہے کہ یہ خاتون کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔29

خواتین کی پانچویں عالمی کانفرنس 2000ء میں (5 تا 9 جون) نیو یارک میں منعقد کی گئی جس کا اصل عنوان Women 2000: Gender Equality Development and Peace in the (2000 کی خواتین اور اکیسویں صدی میں صنفی مساوات، امن اور ترقی) تھا۔ چونکہ بیجنگ کانفرنس کے پانچ سال بعد یہ کانفرنس ہوئی تھی اس لیے اس کا نام بیجنگ Plus Five (Biejing +5) رکھا گیا تھا۔ بیجنگ کانفرنس کے طے کردہ بارہ نکاتی ایجنڈا یعنی غربت، تعلیم، حفظانِ صحت، عورت پر تشدد، مسلح تصادم، معاشی عدم مساوات، مختلف اداروں میں مرد و عورت کی نمائندگی میں تناسب 33 فیصد تک، عورت کے انسانی حقوق، مواصلاتی نظام خصوصاً ذرائع ابلاغ، ماحول اور قدرتی وسائل، چھوٹی بچی، اختیارات اور فیصلہ سازی وغیرہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ممبر ممالک کو سونپ دیا گیا تھا۔ چنانچہ اس پر کہاں تک عمل ہو سکا اس کی جانچ کے لیے اس کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔

اسی طرح خواتین کی چھٹی عالمی کانفرنس بیجنگ کانفرنس کے دس سال بعد 2005ء میں (28 فروری تا 11 مارچ) منعقد کی گئی تھی اور ساتویں عالمی کانفرنس کا انعقاد بیجنگ کانفرنس کے پندرہ سال بعد نیو یارک میں 2010ء میں (1 مارچ تا 12 مارچ) عمل میں لایا گیا تھا۔ چھٹی عالمی کانفرنس میں دو مقاصد کو مدِ نظر رکھا گیا تھا:

(1) Review of the implementation of the Bejing platf outcome of the twenty-third special session of the Ge

(2) Current challenges and forward looking strategie and empowerment of women and girls.

تانیثی لہریں (Wave Concept)

بیشتر تانیثی نقاد تانیثی تحریک کو اس کے مقاصد و مطالبات کے پیشِ نظر پانچ ارتقائی لہروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلی تانیثی لہر کا عرصہ انیسویں صدی سے بیسویں صدی عیسوی کے نصف اوّل تک ہے۔ "First Wave" (پہلی لہر) کی اصطلاح مارچ 1968ء میں پہلی بار (Martha Weinman Lear) نے "The New York Times Magazine" میں استعمال کیا۔ اسی دوران انہوں نے "Second Wave Feminism" کی اصطلاح بھی پہلی بار استعمال کی۔ تانیثیت کی پہلی لہر برطانیہ میں انیسویں صدی کے اوسط میں ابھر کر سامنے آئی۔ لندن میں متوسط طبقے کی خواتین نے باربرا باڈیکون (Barbara

اور بیسی ریز پامکس (Bessie Rayner Parkes) اور باربرا (Barbara Bodichon) کی سربراہی میں سماجی وقانونی عدم مساوات کے خلاف منظم طور سے متحد ہو کر صدائے احتجاج بلند کیا جس نے تحریک کی شکل اختیار کی۔ یہیں سے تانیثی تحریک کی پہلی لہر کا آغاز ہوتا ہے اس لہر کے درمیان حقوقِ نسواں کے مختلف ایسوز اٹھائے گئے مثلاً تعلیم، ملازمت، یکساں اجرت، شادی کے فیصلے میں آزادی، جائداد اور ملکیت کے حقوق، بیوی کے حقوق اور ووٹ کا حق وغیرہ۔ اس جدوجہد میں بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔ خواتین کو روزگار کے مواقع ملے Marreid Women's Property Act, 1870 کے تحت شادی شدہ عورتوں کو ملکیت کا حق بھی حاصل ہوا United States Constitution نے 1920ء میں امریکی عورتوں کو ووٹ دینے کے حق سے نوازا۔

دوسری تانیثی لہر کا عرصہ 1960ء سے 1990ء تک کا ہے۔ دوسری لہر نہ صرف برطانیہ بلکہ دوسرے یورپی ممالک میں بہت جلد پھیل گئی۔ جہاں پہلی تانیثی لہر کے دوران حق رائے دہندگی، جنسی مساوات اور جائداد میں حق وغیرہ پر توجہ مرکوز کی گئی تھی، وہیں دوسری تانیثی لہر میں مفکرین نے حقوقِ نسواں سے جڑے ہوئے وسیع مسائل کو اہمیت دی۔ جنسیات، گھر، کام کرنے کی جگہ، تولیدی کا حق (Unofficial عدم مساوات اور Official عدم مساوات) اور جائز عدم مساوات جیسے مدعوں پر بحث کی۔ تانیثیت کی دوسری لہر نے گھریلو تشدد اور شادی شدہ عصمت دری (Marital Rape) ایسوز پر بھی توجہ مرکوز کرائی۔ اس تانیثی لہر کی مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں خواتین کو خاطر خواہ کامیابی بھی ملی۔ امریکہ میں خواتین کو مختلف پیشہ اختیار کرنے کی آزادی دی گئی۔ Kennedy Administration کی جانب سے The Presidential Commission on the Status of Women قائم کیا گیا۔ 1963ء میں اس کمیشن کے ذریعہ پیش کردہ رپورٹ کے مطابق زندگی کے تمام شعبوں میں امریکی خواتین کے ساتھ امتیازی رویوں کی نشاندہی کی گئی۔ 1964ء میں American Civil Rights Act پاس ہوا جس کے مطابق روزگار میں جنسی امتیازات کو غلط قرار دیا گیا۔ Equal Employment Opportunity Commission قائم کیا گیا۔ چند جنسی ونسائی مسائل پر مفکرین میں عدم اتفاق کی وجہ سے یہ لہر تنازعات کا شکار ہوگئی۔

تانیثیت کی تیسری لہر کی ابتدا United States میں 1990ء کے اوّلین دور میں ہوتی ہے اور قریب قریب 2012ء میں چوتھی لہر کی شروعات تک چلتی ہے۔ قیاس آرائی ہے کہ تانیثیت کی تیسری لہر کا تب پتہ چلا جب Riot grrrl (Washington, Olympia) میں 1990ء کے اوّلین دور میں ظہور پذیر ہوا۔ sub culture

(Riot grrrl is an underground feminist punk movement early 1990s in Washington state.(particularly olymp movement that combines feminist consciousness and politics.It is often associated with third wave femi seen as its starting point.)[30]

تانیثیت کی تیسری لہر کو U.S. کی وکیل (Attorney) اور پروفیسر انیتا ہل (Anita Hill) سے بھی منسلک کیا جاتا ہے۔ 1991ء میں وہ پورے ملک میں اس وجہ سے مشہور ہوئی تھی کہ انہوں نے United States Department of Education (ED) میں U.S. The Equal Employment Opportunity Commission (EEOC) کے ایڈیٹر Clarence Thomas (Supreme Court) جو اس کا باس (Boss) بھی تھا، کو اس لیے ملزم ثابت کیا تھا کہ Clarence Thomas نے اس کا جنسی استحصال کیا تھا۔ ایک امریکن مصنفہ، فیمنسٹ اور ایکٹیوسٹ Rebicca (Walker) کا ایک مضمون سپریم کورٹ میں Clarence کی تقرری کے جواب میں "Become the Third Wave" Ms. Magazine (American Liberal Feminist Magazine) میں شائع ہوا تھا۔ اس نے لکھا تھا:

"So I write this as a plea to all women,specially wo
Thomas's confirmation serve to remind you,as it did
from over.Let this dismissal of a women's experience
that outrage into political power. Do not Vote for t
us.do not have sex with them,do not nurture them if
freedom to control our bodies and our lives.I am n
feminist.I am the Third Wave."[31]

اس دور کے فیمنسٹ صنف اور جنس کو محور بنا کر عورت کے حقوق کی مانگ کرتے ہیں۔چونکہ اب عورت میں مخفی باغی صفات ظاہر ہونے لگے ہیں اس لیے وہ اپنی بات پُر زور دعوے اور وثوق کے ساتھ دنیا کے سامنے رکھ سکتی ہے۔اسے اپنی جنسیت پر خود اختیار رہے۔تانیثیت کے لیے سرگرمی (Activism) کو ضروری قرار دیا گیا۔اس لہر کے دوران خاتون اپنا تشخص پانے میں کامیاب ہو پائی(اسے جدید تانیثیت (Modern Feminism) بھی کہا جاتا ہے۔

چوتھی تانیثی لہر کی ابتدا 2012ء کے اردگرد ہوتی ہے جسے سوشل میڈیا (Social Media) کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے۔فیمنسٹ Prudence Chamberlain کے مطابق چوتھی تانیثی لہر عورت کے لیے انصاف، جنسی استحصال کی مخالفت اور عورت کے خلاف تشدد پر توجہ مرکوز کرتی ہے۔اس لہر کی تفہیم ٹکنالوجی کے ذریعہ کی جاتی ہے۔انگریز صحافی و ناول نگار Kira Cochrane کے مطابق اس لہر کی امتیازی خصوصیات کو خصوصاً Facebook, Twitter, Instagram, YouTube, Tumbler اور مختلف بلاگس جیسے فیمنسٹ بلاگنگ (Feminist Blogging) کے استعمال کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے۔اس میں شادی سے نفرت (Misogyny) اور جنسی مساوات کو چیلنج کیا جاتا ہے۔چوتھی تانیثی لہر سڑکوں اور کام کی جگہوں پر خواتین کا استحصال، کیمپس میں جنسی حملہ (Campus Sexual Assault) اور عصمت دری کے رواج پر توجہ مرکوز کرتی ہے۔استحصال سے منسلک شرمناک واقعات (Scandals)، خواتین اور لڑکیوں کے ساتھ بدسلوکی اور ان کا غلط استعمال وغیرہ نے اس تحریک کو جلا بخشی۔مثلاً 2012ء میں دہلی کی اجتماعی عصمت دری (Delhi gang rape)، Jimmy Savile پر جنسی استحصال کا الزام، امریکی مزاحیہ اداکار Bill پر الزام وغیرہ۔

پانچویں تانیثی لہر مستقبل میں تانیثی تصورات پر مبنی ہے۔

"In how to b a women,Moran calls for a fifth wave
up.Moran states,"But if there is to be a fifth wave
that the main thing that distinguish it from all that
finally realize that "no means no" and that modern so
4 previous times." Perhaps they get the hint a 4th t

فیمنزم کے اقسام

ابتداء سے لے کر عصر حاضر تک تانیثی تحریک مختلف شاخوں میں بٹ چکی ہے جس کی وجہ سے مختلف مکاتیبِ فکر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔مختلف علاقوں کے مفکرین میں اپنے جغرافیائی حدود نیز ماحول کے مدنظر فکری اختلافات ہونا لازمی جز ہے۔مگر ان سب کے بین السطور میں عورت پر ہو رہے ظلم و ستم اور اس کی نوعیت، اس کے ساتھ روا رکھے جانے والا غیر انسانی سلوک اور اس کی محکومیت کا خاتمہ ہر مکاتیبِ فکر کے محور و مرکز رہے ہیں۔انھی اختلافات کے سبب تانیثی تحریک کے مختلف اقسام

سامنے آئے جو حسب ذیل ہیں:

حریت پسند تانیثیت (Liberal Feminism)

حریت پسند تانیثیت، ایک روایتی تھیوری ہے جس کی بنیاد مرد و زن دونوں کے لیے حریت پسند قاعدے وقوانین، مساوات اور عورت کی آزادی پر مبنی ہے۔ میری وول سٹون کرافٹ کی کتاب A Vindication of the Rights of Women اور بیٹی فرائیڈن کی تصنیف The Second Sex اور The Feminine Mystique کا تعلق اسی تھیوری کے ساتھ ہے۔ اس تھیوری کے مطابق زندگی کے ہر شعبے میں عورت کو مرد کے برابر آزادی ملنی چاہیے۔ مرد حاوی معاشرے کے غلط قوانین جس نے عورت کو یہی سکھایا کہ اس کی تخلیق صرف مرد کی خدمت کرنے کے لیے ہوئی ہے، مرد چاہے جتنے بھی برے برتاؤ سے پیش آئے اس کی اطاعت اس کا فرضِ عین ہے۔ صدیوں سے چلے آرہے ایسے رواج جو اس کی نفسیات میں ضم ہوگئے ہیں، جسے صحیح تعلیم کے ذریعہ اس کے اندر اپنے وجود کے تشخص کے تئیں غور وفکر کا مادّہ پیدا کرکے دور کیا جاسکتا ہے۔ اس کو اس لائق بنانا کہ وہ معاشرے میں اپنی حالت پر پورے ہوش وحواس کے ساتھ غور وفکر کرے جہاں اس کے سامنے صرف اس کا وجود موجود ہو، تبھی اپنی تشخص کی بحالی کے لیے اس کا ذہن بے دار ہوسکتا ہے۔ میری وول سٹون کرافٹ، روسو کے اس نظریے کا رڈ کرتی ہے کہ مرد و عورت دونوں الگ الگ طرح کی سوچ رکھتے ہیں۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ عورت کے سوچنے کا طریقہ اگر مرد سے الگ ہے یا وہ صرف غلط طرح سے غور وفکر کرتی ہے تو یہ صرف تعلیم اور اکتساب کی کمی کی وجہ سے ہی ہے۔ اس تھیوری سے جڑے سارے مفکرین نے آزادیٔ نسواں پر ہی توجہ مرکوز کی ہے۔ اس لیے انہوں نے خواتین کی حق رائے دہندگی پر زیادہ زور دیا کہ اس حق کے حصول کے بعد اسے مکمل طور پر انفرادی آزادی مل سکتی ہے۔ اس تھیوری کا مقصد عورت و مرد کی مساوی آزادی، مردوں کے ظلم و جبر پر کاری ضرب لگانا اور معاشرے میں عورت کو ثانوی جنس کی طرح نہیں بلکہ ایک مکمل انسان کی حیثیت سے زندگی گزارنا ہے۔

انتہا پسند تانیثیت (Radical Feminism)

انتہا پسند تانیثیت کا تعلق فحاشی نگاری، عصمت فروشی، جنسی استحصال، عصمت دری اور عورت پر تشدد سے ہے۔ اس تھیوری کے مفکرین نے دیگر جنسیت (Heterosexuality) اور عورت کا گھریلو وفا شعار بیوی کا کردار، بچہ پیدا کرنے والی مشین وغیرہ ایسوز کی مخالفت میں آواز اٹھائی۔ ان کا ماننا ہے کہ مردوں کے ذریعہ ہونے والے جنسی جبر سے آزادی حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ عورت ہم جنس پرستی (Lesbianism)، جنسی خود لذت پرستی (Auto-Eroticism) اور مجرد (Unmarried) کی راہ اپنائے۔ کیٹ ملیٹ (Kate Millet) اپنی تصنیف Sexual Politics میں بتاتی ہے کہ عورت تبھی آزاد ہوسکتی ہے جب پدری نظام کے ذریعہ پیدا کردہ صنفی امتیازات کو یکسر ختم کردیا جائے۔ شدت پسند تانیثیت کے علم بردار عورت کی غلامی کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ عورت کی کمزوری کا راز اس کا بچے پیدا کرنا ہے، اس لیے اسے مردوں کے مقابلے اتنا کمزور مانا جاتا ہے جیسے بچے بالغ لوگوں کے مقابلے جسمانی اور ذہنی طور پر کمزور ہوتے ہیں۔ اس لیے عورت جسمانی اعتبار سے مرد کے ماتحت رہتی ہے۔

شولامتھ فائرسٹون (Shulamith Firestone) اپنی تصنیف The Dialectic of Sex میں لکھتی ہے کہ عورت حیاتیاتی تحریک (Biological Revolution) کے ذریعہ آزادی حاصل کرسکتی ہے۔ اسے تولید کی آزادی ملنی چاہیے کہ وہ چاہے بچے پیدا کرے یا اس تولیدی عمل سے منکر ہوجائے۔ خود پر سے مرد کی ماتحتی کو جدید ٹکنالوجی کے ذریعہ ختم کرسکتی ہے۔ بچہ حاصل کرنے کے لیے مرد پر انحصار ضروری نہیں ہے۔ ٹکنالوجی مثلاً: مصنوعی تولید (Artificial Reproduction)، 'ٹیسٹ ٹیوب بچہ (Test-tube baby) کی تکنیک۔ اس تحریک کے حامیوں کا نعرہ تھا "Personal is Political"۔

مارکسسٹ اور سوشلسٹ تانیثیت (marxist and socialist feminism)

اس فکر سے جڑے ہوئے مفکرین نے سرمایادارانہ نظام کے ذریعہ پیدا کردہ جنس پرمبنی کام کے بٹوارے کے معین حدود کا مظاہرہ کیا ہے جوصرف اورصرف سرمایادارانہ نظام کی مفاد کے لیے تھا۔انیسویں صدی کے خاتمے تک سرمایادار ممالک میں شادی شدہ عورت کو اپنے نام سے اپنی جائداد رکھنے کی اجازت نہیں تھی ۔جب کبھی وہ کسی کام یا تجارت سے جڑتی تو ان معاوضے پراس کے شوہر کا حق ہوتا۔اگرچہ کارل مارکس نے سرمایادارانہ نظام کے تجزیے کے دوران اس بات کومحسوس کیا تھا کہ وہ چاہے مزدور ہو یا سرمایادار دونوں کے پاس اپنی اپنی بیویاں ہیں جواپنے گھروں میں کام کرتی ہیں اوربچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں،مگر مارکس کے فلسفے میں ایسی عورتوں کی بحالی کے لیے کہیں کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔

مگر مارکسسٹ تانیثیت پسندوں نے سرمایادارانہ نظام کے فلسفے میں شادی شدہ گھریلوعورت کو بھی شامل کیا اوراس کی اہمیت کوواضح کرتے ہوئے اس کے ذریعہ گھرپہ کیے جانے والے (بلا اجرت (Unp) کام پرتوجہ مرکوز کروائی جس سے مزدور اورسرمایادار دونوں کی زندگی خوش حال بنتی ہے اوراس کے ساتھ ساتھ تولیدی عمل کے ذریعہ اپنی زندگی کی پرواہ کیے بنا آئندہ پیڑھی کوجنم دے کر ایک عظیم کام سرانجام دیتی ہے۔جب شوہر کسی پریشانی میں مبتلا ہوتا ہے تو گھرپہ مختلف طرح کے کام کرکے معاشی طور پر اپنے شوہر کا سہارا بنتی ہے۔کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کسی مزدور کی کمائی اس کے گھریلوضروریات کو پورا نہیں کرپاتی تو اس کی بیوی گھر سے باہر نکل کرکسی فیکٹری،دوکان یا کسی کے گھر پر مزدوری کرتی ہے۔گھریلوعورت کی محنت مزدوری چاہے وہ اجرت والی ہو یا بلا اجرت،وہ صرف اورصرف اپنی فیملی کے لیے ہوتی ہے۔

مارکسسٹ اورسوشلسٹ مفکرین بڑی شدت کے ساتھ فیملی کواپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جوعورت پرظلم وجبر اوراستحصال کامنبع ہے۔ایک عورت پوری طرح سے گھر کے سارے کام انجام دیتی ہے مگراس کے اس کام کا نہ توکوئی معاوضہ ملتا ہے اورنہ ہی کوئی پذیرائی ہوتی ہے اوراس پرظلم یہ کہ وہ معاشی اعتبار سے اپنے گھر کے مردوں پرہی منحصر ہے۔اوراگر وہ گھر کے باہر کسی ملازمت سے جڑتی ہے تو تب بھی مرد اس سے یہ امید رکھتا ہے کہ اپنی ملازمت کے ساتھ ساتھ وہ اپنی گھریلو ذمہ داریوں کوبھی بہ حسن وخوبی نبھائے۔جس کی وجہ سے دوجگہوں کے کام کا بوجھ اس کے کندھوں پر رہتا ہے اوراسے اس کے لیے معقول معاوضہ بھی نہیں ملتا۔اس لیے مارکسسٹ اورسوشلسٹ مفکرین سرمایادارانہ نظام کی مخالفت کرتے ہیں کہ سرمایادارانہ نظام اور پدرانہ نظام دونوں اپنے اپنے تحفظ کے لیے ایکدوسرے کی مدد کرتے ہیں جہاں صرف اورصرف عورت ہی عذاب میں مبتلا کر دی جاتی ہے۔

کارل مارکس کے جانشین فریڈرک اینگلس (Friedrich Engels) کی تصنیف The Origin of the family, private property and the state (1884) اور ایلی زاریٹسکی (Eli Zaretsky) کی تصنیف Socialist Revolution نے اس بات پرفوکس کیا ہے کہ آج بھی مرد،عورت کواپنی جائداد سمجھتا ہے اوراس کے ساتھ اسی طرح کا سلوک روا رکھتا ہے۔یعنی عورت کی حالت ایک شئے سے زیادہ اورکچھ بھی نہیں جسے ضرورت کے وقت استعمال کیا جاتا ہے اورجب ضرورت نہ رہے تو اس کے تئیں لاپرواہی برتی جاتی ہے۔یہ تبھی ہوتا ہے جب عورت مکمل طور سے مرد پرمنحصر رہتی ہے۔سیمون دوبوا لکھتی ہیں:

> ”انسانیت نر ہے اورمرد عورت کوبالذات نہیں بلکہ اپنے ساتھ تعلق کے حوالے سے متعین کرتا ہے۔اسے خود مختار وجود نہیں سمجھتا۔“ 3

اس لیے اس فکر کے ماننے والے معاشی اعتبار سے عورت کی خود کفالت کی وکالت کرتے ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ گھر سے باہر نکل کرمحنت مزدوری کے کام کواپنا کرعورت محکومانہ زندگی سے نجات حاصل کرسکتی ہے۔

تحلیل نفسی پر مبنی تانیثیت (Psychoanalytic Feminism)

اس نظریے کے ماننے والے مفکرین Freud کے نظریے کا مطالعہ پھر سے کرنا چاہتے ہیں۔شخصیات کی تعمیر میں فرائڈ نے Oedipus Complex (Detechment from the Mother) یعنی ماں سے الگ ہو جانا کو ہی مرکز بنایا ہے۔ JUDITH LORBER اپنے مضمون "The variety of Feminisms and their Contribution to G میں لکھتے ہیں:

> "Women are the primary parents, infants bond with t
> have to separate from their mothers and identify wit
> establish their masculinity. They develop strong e
> capacity for the independent action, objectivity, and
> in Western culture. Women are a threat to their indep
> sexuality....Girls continue to identify with their r
> with fluid ego boundaries that make them sensitive, e
> these qualities that make them potentially good mothe
> to men's emotional needs. But because the men in thei
> personalities that make them emotionally guarded, w
> children to bond with."
> "Psycho analytic feminism claims that the sourse of
> women is men's unconscious two-sided need for women'
> rejection of them as potential castrators. Women sub
> their unconscious desires for emotional connectedne
> personalities are the outcome of the oedipus complex
> the mother."[34]

اس نظریے کے حامی یہ چاہتے ہیں کہ صرف ماں ہی کیوں بچوں کی تربیت کا مرکز بنے۔اور خود ماں اور باپ یعنی والدین کا کردار نبھائے۔اس لیے مردوں کو چاہیے کہ کس طرح بچوں کی تربیت کی جاتی ہے،اس کی سیکھ حاصل کریں اور بچوں کی تربیت میں ماں کے ساتھ ساتھ برابر کا شریک ہوں۔اس نظریے کے ماننے والے 'Shared Parenting' کا مطالبہ کرتے ہیں۔جس سے بچوں کے اندر ماں اور باپ دونوں کی تربیت کا اثر برابر پڑے۔اور بچے دونوں کی اہمیت کو سمجھ پائیں۔

روایتی سماج نے عورت کی ذہنی اور جذباتی دنیا کی تعمیر اپنے طریقے سے کیا ہے۔بچپن سے ہی لڑکی اور لڑکے کی نفسیات کی بناوٹ اس انداز سے ہوتی ہے کہ لڑکے احساسِ برتری اور لڑکیاں احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتی ہیں۔مرد کے نفسیات میں عورت کے تئیں ظلم واستحصال کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔اور عورت اسی سائیکی کے ساتھ زندگی گزار دیتی ہے کہ مردوں کی ماتحتی ہی اس کی قسمت ہے جسے بدلا نہیں جا سکتا۔تحلیل نفسی تانیثی مفکروں نے اس کی مخالفت کرنے کے ساتھ ساتھ صحیح تعلیم وتربیت کے ذریعہ عورت کی سائیکی کو بدلنے کی خواہش ظاہر کی۔

سیاہ فام تانیثیت (Black Feminism)

سفید فام فیمنسٹوں کی طرح سیاہ فام خواتین،تانیثی تحریک کے ساتھ اس شعور کے تحت شامل ہوئیں کہ حقوقِ شہریت کی تحریک میں ان کے ساتھ دوسرے درجے کے شہری کی طرح سلوک کیا گیا تھا۔سفید فام پدرانہ سماج نے جس طرح جنس،رنگ

اور طبقے کی بنیاد پر سیاہ فام عورتوں پر ظلم کیا ہے اس پر کسی نے آواز نہیں اٹھائی اور نہ ہی سفید فام عورتوں نے فیمنزم کی تحریک میں اس مدعے کو موضوع بنایا۔ اس نظریے کے ماننے والے کہتے ہیں کہ ایک تو اس دنیا میں عورت ہونا مشکل ہے اس پر سیاہ ہونا اور زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ایک عورت ہونے کے ناطے جنسی اور صنفی استحصال کا شکار تو ہیں ہی اس پر سیاہ رنگ اور اضافہ کر دیتا ہے۔ نسل اور رنگ کی بنیاد پر افریکن اور امریکن خواتین نفرت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور انہیں کمتر سمجھا جاتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ امریکہ جیسے مہذب ملک میں صدیوں تک غلامی کی زندگی گزارتے ہوئے سیاہ فام عورتوں نے دنیا میں سب سے زیادہ تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ چونکہ صنفی افتراقات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے ساتھ ظلم روا رکھا گیا اس لیے ان کے مطالبات بجائے انفرادی ہونے کہ اجتماعی ہیں۔ مختلف تخلیق کار مثلاً Weldon Jhonson' Claude M[illegible]en Brown' Nella Larsen' Jean Toomer' Zora اور دیگر مصنفوں نے اپنی تحریروں میں سیاہ فام عورتوں کی دردناک زندگی اور ان کے مسائل کو بڑی شدت کے ساتھ پیش کر کے اس تحریک کو جلا بخشی۔

اس کے علاوہ Lesbian Feminism, Post Modernist and Structural Femini Feminism, Eco-Feminism, Cultural F وغیرہ جیسے تصورات و رجحانات تانیثیت کو مختلف پہلو سے دیکھنے اور سمجھنے کا تقاضہ کرتے ہیں۔ ان سارے اقسام میں مختلف امتیازات کے باجود ایک مشترک نقطہ واضح طور پر نظر آتا ہے کہ صدیوں سے ظلم و جبر کا شکار بنی عورت کو زندگی کے مختلف شعبے میں مساوی حقوق اور برابری کے مواقع سے سرفرازی حاصل ہو پائے۔

تانیثی تحریک کے بنیادی مقاصد کی تکمیلی عمل میں عورتوں کے ساتھ ساتھ اگر مرد بھی اپنی شمولیت کا مظاہرہ کریں تو مذکورہ تحریک زیادہ کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مرد اس تحریک کا حصہ نہیں بنا ہیں ابتدا میں John Stuart Mill جیسی شخصیات نے اس تحریک کی آبیاری میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ تحریک کے ابتدائی مراحل کافی جدوجہد سے دوچار رہے۔ مگر کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد مذکورہ تحریک بے راہ روی کا شکار ہو گئی۔ مغربی خواتین نے اپنے بنیادی حقوق کے ساتھ ساتھ مختلف ایسے مطالبات کا بھی تقاضہ کیا جو فطرت کی خلاف ورزی کر رہا تھا، جو اس تحریک کے لیے مضر ثابت ہوا۔ میں بذات خود ایک خاتون ہونے کے ناطے اس تحریک کی شدت پسندی کی مخالفت کرتی ہوں بجائے اس کے کہ میں اپنے آپ کو فیمنسٹ مانتی ہوں کیوں کہ ایک ایسے روایتی ماحول میں میری پرورش و پرداخت ہوئی ہے جہاں سن بلوغ کے بعد لڑکیوں کی تعلیم اور گھر سے باہر نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ایسے ماحول میں میرے اور میری بہنوں کے لیے تعلیم کا معقول انتظام ہمیشہ میسر رہا۔ اس کے لیے میں اپنے روشن خیال والد جناب الطاف نادر صاحب اور باپردہ اور جدید سوچ رکھنے والی میری والدہ محترمہ اختر ینہ قادری صاحبہ کی تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں کہ روایت سے الگ ہٹ کر انہوں نے ہمارے مستقبل کے بارے میں غور و فکر کیا اور اپنے بنائے ہوئے راستے پر خود چلتے ہمیں چلنا سکھایا۔ اس لیے خود سے پہلے میں اپنے والدین کو فیمنسٹ کہوں گی۔ میں ایک فیمنسٹ ہونے کے ناطے اپنے وجودی پہلو کی بات کروں تو یہ کہوں گی کہ میں عورت ہوں مرد بننا میرے مطالبات میں شامل نہیں ہے۔ کیوں کہ مجھے اپنے وجود سے محبت ہے اپنی نسائیت پر فخر ہے۔ اس لیے میں یہ کہوں گی کہ تانیثیت عورت کے وجود کا خاتمہ نہیں چاہتی بلکہ اس کے وجود کی شناخت کی طالب ہے۔ علامہ مجتبیٰ حسن صاحب کانپوری اپنی کتاب ''اقوام عالم میں عورت کا معیار'' میں رقم طراز ہیں:

> ''مرد عورت دونوں الگ الگ صنفیں ہیں اور ہر ایک کی خاص خاص صلاحتیں دوسرے میں نہیں ہیں اگر مرد و عورت کی انہیں خصوصیتوں کو اہمیت دی جائے جو کسی ایک صنف سے مخصوص ہیں تو اس لحاظ سے نہ مرد کامل ہے نہ عورت یہ دونوں صنفیں کچھ خاص خاص اور غیر مشترک اوصاف کی مالک ہیں کہ

اگر دونوں متحد ہو کر اپنے فرائض کو پورا کر کے انسانیت کی تکمیل نہ کریں تو انسانی ارتقاء ایک نقطۂ موہوم بن کر رہ جائے ۔ان دونوں گروہوں میں سے جو گروہ اپنے فرائض سے غفلت کرے گا یا دوسرے کے فرائض میں دخل دے گا وہ حقیقتاً نوع انسانی کی ترقی کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرے گا۔''[35]

☆☆☆

تانیثی تنقید

دنیا میں انسان کے اندر ابتدائی مراحل سے ہی غور و فکر کا مادہ موجزن ہے جس نے اسے خوب سے خوب تر کی تلاش و جستجو میں محو رکھا۔ اسی فکر و عمل کی وجہ سے انسان دیگر وحشی جانوروں سے ممتاز رہا اور ایک تہذیبی و تمدنی ماحول میں اپنی زندگی بسر کر رہا ہے۔ غور و فکر کا مادّہ ہی وہ تنقیدی عنصر ہے جس کی رہبری میں انسان نے اچھے برے، پسند ناپسند، خوب و بد میں امتیاز کرنا سیکھا۔ جس طرح عملی زندگی میں تنقیدی عمل انسان کے ساتھ ساتھ قدم بہ قدم چلتی ہے اسی طرح ادب میں بھی تنقید کی اہمیت اس لیے ناگزیر ہے کہ اس کے ذریعہ کسی ادبی فن پارے کی خوبیوں اور خامیوں پر غور و فکر کے بعد اس فن پارے کی ادبی قدر و قیمت کا تعین کیا جاتا ہے۔ کسی فن پارے کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ہی تنقید اپنا کام شروع نہیں کرتی بلکہ اس فن پارے کی تخلیق کا تصور جب خالق کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے تو وہاں سے تنقیدی عناصر کی کارفرمائی کی ابتداء ہو جاتی ہے۔ بقول احتشام حسین:

> ''ادب کے تخلیقی عمل میں تنقیدی عمل کی نمو بھی ہو جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ تخلیقی ادب پیدا کرنے والا اپنے جذبات، خیالات، تجربات کو ترتیب دے کر خاص اسلوب اور لطافت کے ساتھ پیش کرتا ہے لیکن اس کی وہ تنقیدی صلاحیت جسے وہ ابتداً اپنے خیالات کی تہذیب و تنظیم میں پیش کرتا ہے بعض نفسیاتی اثرات اور وفورِ جذبات کی وجہ سے کافی نہیں ہوتی پھر بھی یہ صلاحیت جتنی قوی ہوگی تخلیقی کارنامہ اسی قدر اعلیٰ اور بے داغ ہوگا۔'' 36

ادب کوئی جامد شئے نہیں ہے۔ ابتداء سے لے کر اب تک ادب انسانی زندگی کی مانند مسلسل ارتقاء پذیر رہا ہے۔ اس لیے اس کی جانچ پرکھ کے لیے جو تنقیدی اصول متعین کیے جاتے ہیں ان میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ آج ادب کی افہام و تفہیم، تحلیل و تجزیے اور اس کی تشریح کے لیے نئے نئے طریقے کی تلاش کی جا رہی ہے جس سے کوئی نہ کوئی نیا تنقیدی زاویہ منظرِ عام پر آ رہا ہے جس سے دنیائے ادب کے ناقد و قاری استفادہ کر رہے ہیں۔ مرزا خلیل احمد بیگ اپنی کتاب ''تنقید اور اسلوبیاتی تنقید'' میں ویلک اور رورین کے نظریے کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ ان دونوں نے تنقید کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک Extrinsic Criticism یعنی خارجی تنقید اور دوسری Intrinsic Criticism یعنی داخلی تنقید۔ خارجی تنقید میں ادب کا مطالعہ خارجی اشیا مثلاً: ماحول، فضا، معاشرہ، مصنف، قاری وغیرہ کے حوالے سے کیا جاتا ہے مگر داخلی تنقید میں فن پارہ یعنی متن کا عمیق نگاہ سے مطالعہ کیا جاتا ہے مثلاً: فن پارے میں پیش کی گئی زندگی، کردار، ماحول، مکالمہ، تکنیک وغیرہ کا مطالعہ باریک بینی سے کیا جاتا ہے اور اس فن پارے کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ فن پارے کی انہی خارجی اور داخلی عناصر کے مدِّنظر اگر اس فن پارے کو مختلف زاویوں سے نہ پرکھا جائے تو اس کے تمام پہلوؤں پر سے پردہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

مختلف اذہان، مختلف خیالات اور فکر کے مالک ہوتے ہیں، کوئی فن پارے کو کسی نظریے کے تحت دیکھتا ہے تو کوئی کسی دوسرے نقطۂ نظر کی پیروی کرتا ہے۔ غور و فکر کے یہی امتیازی پہلو ہیں جو ادب کے مختلف تنقیدی دبستان کے وجود میں آنے کا جواز بنتے ہیں۔ اردو ادب میں مغربی فکر کے زیرِ اثر مارکسی تنقید، نفسیاتی تنقید، سائنٹفک تنقید، تجزیاتی تنقید، ساختیاتی تنقید، تانیثی تنقید وغیرہ کی اصطلاحیں عام ہوئیں۔ ہمارا مقصود تانیثی تنقید ہے، ذیل میں اس ایک دبستان پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

تانیثی تنقید

تانیثی تنقید (Feminist Criticism) ایک انفرادی نوعیت کی ادبی تنقید ہے۔ تنقید کا ایک مدرسۂ فکر ہے جو ادب کا مطالعہ نسائی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔ نیر وٹنڈن نے اپنے اس اقتباس میں تانیثی تنقید کے اہم پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے:

> "Feminist Criticism involves an act of revision with
> for an underlying consistent female tradition and to
> symbolism specific to women's writing so that it d
> comprehensible or unimportant as it might when judge
> symbols. It also includes to discover 'lost' works
> male writers from a feminist point of view and final
> politics of style and language."[37]

پروفیسر عتیق اللہ کے مطابق:

> ”تانیثی تنقید اپنی اکثر صورتوں میں ایسے ہر مطالعے کے رد کا نام ہے جس کا اصرار مرد و زن جیسے کرداروں کی علاحدہ علاحدہ متعصّبانہ تخصیص پر ہے۔“[38]

تانیثی مفکرین ادب میں عورت کی غیر متعصّبانہ پیش کش اور ماضی میں پیش کیے گیے کردار کے غیر جانبدارانہ مطالعہ پر فوکس کرتے ہیں۔ ان کا رجحان زیادہ تر اس نقطے پر مبنی ہے کہ تانیثی ادبی روایت کا قیام عمل میں آئے تا کہ تاریخ ادب میں عورت کی شمولیت کی وضاحت کی جا سکے۔ اس ضمن میں قدیم ادبی متون کا از سر نو مطالعہ اور تجزیہ کیا جانا ضروری قرار پایا۔

Showalter نے اپنی تصنیف "The New Feminist Criticism" میں ادبی تانیثی تنقید کو تین زمرے میں تقسیم کیا ہے۔

1۔ پہلا زمرہ تانیثی تنقید (Feminist Criticism) کا ہے جس میں ادب اور تخلیقی عمل کے محرکات کا جائزہ فیمنسٹ نقطۂ نظر سے لیا گیا۔

2۔ دوسرا زمرہ نسوانی تنقید (Gynocriticism) کا ہے۔ اس میں عورتوں کی تخلیق کردہ ادب، اس کے تخلیقی عمل کے جذباتی، حیاتیاتی، سماجی، علمی اور نفسیاتی محرکات اور اسباب کا تعین، زبان اور اس کی نسائی خصوصیات کا مطالعہ اور عورتوں کی انفرادی اور اجتمائی ادبی کاموں کے ارتقا کا مطالعہ عورت خود ہی اپنے نقطۂ نظر سے، اپنے معیارات پر کرتی ہے۔

3۔ تیسرا مرحلہ صنفی تھیوری (Gender Theory) کا ہے جس میں صنف سے متعلق تصورات ادب کو کس طرح متاثر کرتے ہیں یا ادب اور صنف ایک دوسرے پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں، اس موضوع کو مد نظر رکھتے ہوئے ادب پر تنقیدی نگاہ ڈالی جاتی ہے۔

میں نے اپنے مقالے کو دوسرے اور تیسرے زاویہ ہائے نظر سے تحریر کیا ہے، کیوں کہ میرا مقالہ انہیں زاویہ ہائے نظر کا متقاضی تھا۔ نسوانی تنقید (Gynocriticism) کی تعریف اس طرح پیش کی جاتی ہے کہ:

> "A female framework for the analysis of women

’نسوانی تنقید‘ کی اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے Showalter نے اپنے مضمون "Towards a Feminist Poetics"

"Poetics" میں 1979ء میں کیا تھا۔تنقید کا یہ طریقہ ایک نسائی فریم ورک ہے، جس میں نسائی نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے خواتین کی تخلیقات کا تنقیدی تجزیہ کیا جاتا ہے۔

تانیثی تنقید کا اہم پہلو ادب میں نسوانی پیش کش کا جائزہ لینا ہے۔تخلیق کار (خصوصاً مرد) نے اپنی تخلیقات میں نسوانی کرداروں کی عکاسی میں عورت کے انفرادی احساسات و جذبات اور تجربات، جو صرف اور صرف عورت کا ہی خاصہ ہیں اس میں کسی تذکیری عناصر کا عمل دخل نہیں، کے ساتھ کہاں تک انصاف کیا ہے۔انہوں نے روایتی Stereotype کردار کی عکاسی کی ہے یا عورت کی نسائیت کے پس پردہ اس کی انسانیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔مگر نتیجہ نہایت ہی مایوس کن ثابت ہوا۔فیمنسٹ تخلیق کاروں اور نقادوں نے مردوں کی تخلیقات کے مطالعے کے بعد یہ محسوس کیا کہ مردوں کی تخلیقات میں عورت کے نجی تجربات اس کے احساسات و جذبات اور اس کی صلاحیتوں کو مکمل طور پر کا فور کر دیا گیا ہے۔چند ایک روایتی Stereotype کردار کی شبیہ پیش کی گئی ہے جو اس وقت کے مرد حاوی معاشرے کی مانگ تھی۔

ماضی میں مردوں کے ذریعہ تخلیق کردہ ادب جس میں انہوں نے عورت کو اسی طرح پیش کیا جس طرح انہیں رکھا گیا تھا، انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اسے کیسا ہونا چاہیے، یا اس روایتی ڈھانچے سے الگ اور کیسی ہو سکتی ہے۔اس لیے متون میں نسائی کردار کا از سرِ نو مطالعہ اس کے ہی نظریے سے کیا جانا چاہیے۔مرد مرکز معاشرے میں عورت ہمیشہ سے محکومیت، گمنامی اور مجبوری کی زندگی گزارتی آرہی ہے۔اس کے وجود کو ایک محدود دائرے میں مقفل کر دیا گیا تھا کہ وہ صرف اور صرف مرد کی ضروریات کو پورا کرنے والی ایک مددگار شئے کی مانند تھی۔مرد کی جنسی، جمالیاتی، معاشرتی اور اکثر و بیشتر اس کی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے باوجود پدرسری نظام نے اسے ذیلی حیثیت سے نوازا تھا۔آج بھی ہندوستان کے مشرقی علاقوں میں جب بیٹا دلہن لانے کے لیے بارات لے کر گھر سے نکلتا ہے تو ماں اس سے پوچھتی ہے کہ ''تو کیا لانے جارہا ہے؟'' بیٹا جواب دیتا ہے ''میں آپ کے لیے لونڈی لانے جارہا ہوں''۔آج لوگ جدید دور میں جی رہے ہیں، روشن خیالی کے اس عہد میں ایسا جملہ ہو سکتا ہے شادی کے ماحول میں مزاح پیدا کرنے کے لیے کیا جارہا ہو لیکن یہ جملہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ماضی میں مردانہ نظام میں عورت کی حیثیت کیا تھی؟ اگست ببیل عورت کی دلدوز داستان سنانے کے بعد یہ کہتے ہیں کہ:

> "After all this we need not wonder that among many different times, the question was seriously discusse were human beings and possesd a soul."[39]

ایسے ماحول میں مرد کے ذریعہ پیدا کردہ تخلیقات بھی ایسی ہی ہوتی تھیں کہ مرد مرکز معاشرے کی تخلیق کردہ عورت کی روایتی شبیہ ہی کی عکاسی ہو۔مرد کے تئیں اس کی وفا شعاری کے باوجود اس کو مختلف اگنی پرکشا سے گزرنا پڑتا اور مرد کی بے وفائی پر کوئی انگلی نہیں اٹھائی جاتی۔شیکسپیئر کے ڈرامے اوتھیلو (Othello) کی زنانہ کردار لیڈی مونو ایک کالے آفیسر اوتھیلو سے محبت کرتی ہے اور جب اوتھیلو اس کی پاک دامنی پر شک کرتا ہے تو وہ اپنی جان کی قربانی دینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔تھامس ہارڈی کے ناول "The Mayor of Casterbridge (1886)" میں ایک مرد کردار Michael Henchard اپنی بیوی کو سرِ بازار نیلام کر کے اسے ناکردہ گناہ کی سزا دیتا ہے۔چونکہ مردوں کے پاس طاقت رہی ہے اس لیے انہوں نے اپنی بالا دست فطرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عورت کو ہمیشہ استحصالی قفس میں قید رکھا۔سیمون دی بوا ایک جگہ اس کی وضاحت کرتی ہیں:

> ''انسانیت نر ہے اور مرد عورت کو بالذات نہیں بلکہ اپنے ساتھ تعلق کے حوالے سے متعین کرتا ہے۔اسے ایک خود مختار وجود نہیں سمجھا جاتا۔''[40]

اس لیے مرد تخلیق کاروں کے ذریعہ پیش کی گئی عورت کی شبیہہ کو فیمنسٹ ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ انہوں نے عورت کو جس طرح دکھایا ہے وہ کسی بھی پہلو سے قریب از قیاس نہیں ہے۔ان تخلیقات میں جس روایتی

Stereotype عورت کو پیش کیا گیا ہے، اس کے مطالعے سے قاری کبھی بھی یہ نہیں جان پائے گا کہ عورت کے اندر بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت موجود ہے، جیسا مرد اسے دکھارہا ہے وہ ویسی ہی ہے یا ویسی بنادی گئی ہے۔ مرد اور عورت کے تجربات و احساسات ایک دوسرے سے مختلف ہیں اگر مرد اپنے روایتی حاوی محدود دائرے سے باہر نکل کر منصفانہ رویہ برتتے ہوئے عورت کے نسائی جذبات واحساسات کو سمجھ سکتا ہے اور اس کو ایک انسان سمجھتے ہوئے اس کے نسائی تجربات تک رسائی حاصل کر سکتا ہے تو اس کی تخلیقات بھی جانبداری اور متعصّبانہ زمرے سے آزاد ہو جائیں گی۔ منٹو جو اپنی تخلیقات میں عورت خصوصاً طوائف کی نفسیات کو پیش کرنے میں اپنی مثال آپ ہے، ادب میں عورت کی پیش کش کے متعلق احمد ندیم قاسمی سے کہتا ہے:

> ''عورت پر لکھتے وقت عورت بن جانا پڑتا ہے۔ اور کبھی تم تخلیق کے لمحوں میں عورت بنے ہو! تمہیں کبھی کسی نے چھیڑا ہے؟ کبھی کسی اجنبی نے تمہارے جسم پر ہاتھ رکھا ہے، کوئی جھرجھری محسوس کی ہے؟ تمہارے اعصاب کبھی اس اجنبی لمس کے مضراب سے بھی جھنجھنائے ہیں؟'' 4

ہر تخلیق کار تخلیق کے دوران اپنے مخالف جنس کی عکاسی میں اس کے اصل وجود کے ساتھ انصاف کر پائے تو اس کی تخلیق پر کسی بھی دور میں سوال نہیں اٹھایا جاسکتا۔ یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خواتین تخلیق کاروں نے اپنی تخلیق میں عورت کے مکمل وجود کے ساتھ ایمانداری برتتے ہوئے اس کے کردار کی عکاسی کی ہے؟ یا انہوں نے اسی معاشرتی اقدار کو اپنایا ہے جو صدیوں سے رائج چلا آرہا ہے، یعنی ایک حقیقی عورت کو نہیں بلکہ ایک بنی بنائی روبوٹ کو پیش کیا ہے، اور اگر ایسی ادیبائیں موجود ہیں جنہوں نے مرد ادیبوں کی پیروی کی ہے تو کیا ان کی تخلیق کو تانیثی ادب کے زمرے میں رکھا جانا چاہیے؟ اگر ہم انیسویں صدی کے ابتدائی دور کے نسائی ادب پر نظر ڈالیں تو اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ چند خواتین تخلیق کاروں نے اپنے قلم کو روایتی اقدار کے خلاف استعمال نہیں کیا۔ اپنی تخلیق کردہ ادب کو اپنی شناخت کا ذریعہ، اپنے احتجاج کا وسیلہ اور اپنی جنسی انفرادیت کی پیشکش کا پلیٹ فارم بنانے کے بجائے مرد حاوی معاشرے کے روایتی نظریے کو ہی پیش کیا اور ایک ایسی عورت کے ساتھ انہوں نے دنیائے ادب میں قدم رکھا جو صرف ایک کاٹھ کی گڑیا تھی اور مرد کے ہاتھ کی کھلونا۔ اس کے بین السطور میں چند وجوہات کی کارفرمائی موجود ہے۔

پہلا یہ کہ صدیوں سے مرد حاوی معاشرے میں عورت ایک محکوم صنف رہی ہے جسے اپنے مقابل حاکم صنف کی خدمت میں پابجولاں غلامی کی زندگی گزارنی پڑی ہے۔ شادی سے پہلے باپ اور بھائی اور شادی کے بعد شوہر کی حکومت کا بار اٹھانا پڑا ہے۔ انسانی فطرت کا تقاضہ یہی ہے کہ کچھ ایسے عناصر چاہے وہ صحیح ہوں یا غلط ایک مدت طے کرنے کے بعد انسان کی سائیکی بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لڑکیوں کو بچپن سے سکھایا جاتا ہے گھر کے مرد چاہے وہ باپ ہوں یا بھائی ان کا درجہ گھر کی عورتوں سے بلند ہے، بنا کھائے انہیں کھلانا چاہیے، ہمیشہ ان کی اطاعت کرنی چاہیے، اس کے بعد شوہر کی حکومت کا دور آتا ہے پھر اس کی اہمیت سے لڑکیوں کو باور کرایا جاتا ہے کہ وہ سر کا تاج ہوتا ہے وہی مالک ومختار ہوتا ہے وہ جیسا بھی سلوک کرے، اس کی فرماں برداری کرنی چاہیے۔ جیسے بھی ناسازگار حالات درپیش کیوں نہ ہوں اس کے گھر آنگن کو چھوڑنا نہیں چاہیے، لڑکی کی ڈولی جس گھر میں جاتی ہے اس گھر سے اس کا جنازہ نکلنا چاہیے یہ اس کی خوش نصیبی کا ضامن ہوتا ہے۔ اس درمیان شوہر چاہے جیسا بھی سلوک کرے اس کی تابعداری کرنی چاہیے۔ ایسی تمام بے منطقی باتیں جس میں عورت صرف ایک کنیز کا رول ادا کر رہی ہے، ایک عورت کی ہی زبانی ادا کی جاتی ہیں۔ ہر ماں اپنی بچیوں کو بچپن سے یہی تعلیم دیتی ہے جو خود بھی ایسی نامساعد حالات کا شکار رہتی ہے۔ ہزار ہا ایک عورت شعوری طور پر یہ محسوس کر رہی ہو کہ میرے ساتھ ہی ایسا سلوک کیوں؟ مگر غلطی سے بھی اس کے دل میں باغی جذبے سر نہیں اٹھاتے۔ معاشرے میں بلند درجے پر فائز مرد، جو نائبِ خدا بھی ہوتا ہے، کے خلاف آواز اٹھانا گناہِ عظیم سمجھا جاتا ہے۔ عورت نفسیاتی طور پر مرد کی بالادستی کو اس حد تک قبول کر لیتی ہے کہ اپنے سرتاج کے بغیر

زندگی کا تصور ہی نہیں کر سکتی۔ حامدی کاشمیری اپنے ایک مضمون ''عورت کا ادب، کچھ پرانے اور کچھ نئے'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''دل چسپ بات یہ ہے کہ صدیوں کے مردانہ سماج میں رہ کر عورتیں نفسیاتی طور پر اس حد تک مردوں کی بالا دستی کو قبول کر چکی ہیں کہ وہ نہ صرف اپنے شریکِ غالب کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتیں، بلکہ خود ہی اپنی بنیادی انسانی حیثیت سے بھی صرف نظر کر کے مردوں کی تابع مہمل بن کر رہ گئی ہیں۔ان کے لیے صرف ایک مسئلہ رہ گیا ہے، وہ یہ کہ تحفظ ذات اور اس کے پیش نظر مردوں کے زیر سایہ رہ کر زندہ رہنے کا رجحان ان کی سائیکی کا حصہ بن کر ان کی فطرت بن چکا ہے۔''[42]

یہ نفسیات کا ہی عمل دخل ہے کہ وہ ایسی مظلوم زندگی کو اپنا مقدر تسلیم کر لیتی ہیں۔تو ایسے ناسازگار اور غالب ماحول میں نسائی قلم سے وجود میں آنے والا ادب ویسا ہی ہو سکتا ہے جس کا مرد حاوی معاشرہ متقاضی ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ صدیوں سے مرد کا ظلم برداشت کرتے کرتے عورت کے اندر خوف و دہشت کے جراثیم اس حد تک پیدا ہو گئے تھے کہ اس کی خودی مجروح ہو چکی تھی۔نفسیاتی اعتبار سے وہ ہمیشہ خوف و ہراس کے سائے میں جی رہی تھی۔آنکھ کھلتے ہی اپنی ماں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک، پھر ہوش سنبھالتے ہی باپ بھائی کی سختی کا سامنا پھر شادی کے بعد ماں کی خوں آلود داستان کا اس کی ذات کے ساتھ دہرایا جانا، یہ سارے عناصر اسے ایک خوف کی دنیا میں لے جاتے ہیں۔مرد کی ایک دہشت ناک شبیہہ اس کی سائیکی بن جاتی ہے، یا تو اس کی اپنی ذات کے تشخص کا تصور کافور ہو جاتا ہے یا وہ خود اس سے چشم پوشی اختیار کر لیتی ہے۔چاہ کر بھی وہ اس ظالم اور طاقتور مرد کے خلاف ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لا پاتی۔مرد بالادست نظام کے خلاف ادب تخلیق کرنا تو عنقا ہی رہا اپنی تخلیقات میں اپنے تلخ تجربات، کچلے ہوئے جذبات، چھلنی کئے گئے احساسات کا مظاہرہ بھی نہیں کر پاتی۔اس خوف و دہشت کے ماحول میں اپنی انفرادی حیثیت کو نظر آتش کر دیتی ہے اب وہ وہی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے جو وہ نہیں کرنا چاہتی مگر ارد گرد کا خوفناک ماحول اس سے کرواتا ہے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ مرد غالب معاشرے نے عورت کو کبھی اس لائق ہی نہیں سمجھا کہ وہ قلم پکڑے جس پر صرف مرد کی اجارہ داری تھی۔اس کی زندگی گھر کے ایک محدود دائرے میں قید کر دی گئی تھی، مردوں کی جنسی ضروریات پورا کرنے کے ساتھ ساتھ بچے پیدا کرنا اور ان کی دیکھ بھال اور گھر سنبھالنے کی ذمہ داری، یہ اس کے بنیادی فرائض تھے جو اس کے حقوق میں بھی شامل کر دیے گئے تھے۔مرد و زن کی صنفی خصوصیات کے متعلق مولانا روم کا نظریہ:

> ''خدا نے عورت کو اس لیے پیدا کیا کہ مرد اس کی صحبت سے دل و دماغ کا سکون حاصل کرے۔اسی لیے خدا نے مرد کے دل میں عورت کے لیے خاص کشش رکھی ہے اور عورت کی فطرت میں محبت و الفت اور لطف و دلداری ودیعت کی ہے۔محبت و الفت ہی عورت کی صنفی خصوصیت ہے اور جسمانی طاقت اور سختی مرد کا خاصہ ہے۔عورت اپنی فطری نرمی اور اُلفت کی وجہ سے مرد پر غالب آتی ہے اور مرد اپنی طاقت اور سختی کے ذریعہ عورت پر حکومت کرتا ہے۔''[43]

اپنے مخالف جنس کے خلاف ایسے ہی تصورات ابتداء ہی سے مرد و زن دونوں میں ثبت کر دیے جاتے ہیں جو سنِ بلوغیت تک پہنچتے پہنچتے انسانی سائیکی کا ایک اہم اور مضبوط حصہ بن جاتے ہیں۔نتیجتاً مرد، عورت سے ذہنی اور جسمانی سکون حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ذات کو اپنی دیگر ضروریات پورا کرنے کے لیے بھی استعمال کرتا ہے اور عورت اپنے چہرے پر مصنوعی مسکان سجائے اس کی تابعداری میں دست بستہ کھڑی رہتی ہے کیوں کہ یہی اس کی تخلیق کی وجہ ہے۔اس لیے مرد اگر اسے گھر سے باہر نکالتا بھی تھا تو کھیت کھلیانوں میں جانوروں کے مانند محنت و مشقت کرنے کے لیے۔اسے تعلیم جیسی نعمت سے بھی دور رکھا جاتا تھا۔معاشرے کا عملی نظام ہو یا سیاست کے اصول و ضوابط کے عوامل، ان میں عورت کی شرکت کو ممنوع

قرار دے دیا گیا۔ظاہر ہے کہ تعلیم کے بغیر تخلیقی ادب میں اپنے وجود کی شناخت قائم کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔اور اگر اس نے اپنے احساسات کو لفظی جامہ پہنانا بھی چاہا تو مردانہ سماج نے اسے قبول نہیں کیا۔معاشرتی بالادستی کے رجحان کو قائم رکھتے ہوئے مرد نے ادب پر بھی اپنی اجارہ داری کی مہر ثبت کر دی۔چونکہ مرد نے ایک لمبے وقت تک اس کو لکھنے پڑھنے کے لائق ہی نہیں سمجھا اس لیے ادب کی تاریخ میں انہیں کہیں کوئی جگہ ہی نہیں ملی۔اس کی ادبی حیثیت کو نظر انداز کیا گیا۔اس کے تخلیق کردہ متون کے ساتھ ایمانداری نہیں برتی گئی،ان کے ذکر کو معیوب سمجھا گیا،ان کی تخلیقات کو کمتر گردانا گیا۔اردو ادب کو ہی لیجیے پروفیسر نسیم الدین فریس صاحب نے اپنے ایک مضمون میں ایک قدیم شاعرہ گجرات کی متوطن ''بی بی فتح ملک زوجہ قاضی محمود دریائی''[4] (2 8ھ1- 4 9ھ) کو پہلی معلوم شاعرہ کی حیثیت سے متعارف کروایا ہے اور شاعرات کے مختلف تذکروں سے یہ ثابت ہوا ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کی دختر شہزادی زیب النسا مخفی،مہ لقا بائی چندا،اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ لطف النساء وغیرہ ایسی شاعرہ گزری ہیں جن کا کہیں ذکر ہی نہیں ملتا۔جناب جمیل احمد بریلوی اپنے تذکرے ''تذکرۂ شاعراتِ اردو'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اردو ادب کا ایک نہایت ہی تعجب خیز اور تاسف زا واقعہ یہ ہے کہ جہاں شعراء کے کلام کو شروع ہی سے محفوظ رکھنے اور سراہنے کی کوشش کی گئی وہاں خواتین کی مساعی شعری کو نہایت بے پرواہی سے نظر انداز کیا جاتا رہا۔۔۔شاعرات کے ساتھ اس ادبی التفات کا عشرِ عشیر بھی نہیں برتا گیا جو شعراء کے ساتھ برتا جاتا رہا ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ممکن ہے اس اغماض کی تھوڑی بہت ذمہ داری ہماری قدیم مشرقی تہذیب اور اخلاق ہو،جس میں عورت کو کسی عنوان سے بھی منظرِ عام پر لانا ایک عیب اور گناہ سمجھا جاتا تھا۔لیکن افسوس اس کا ہے کہ یہ تجاہلِ عارفانہ صرف اسلاف تک ہی محدود نہ تھا بلکہ آج اس روشنی ترقی اور تہذیب کے زمانے میں بھی جو تذکرے اردو میں قابلِ قدر کہے جا سکتے ہیں ان میں کہیں خواتین کا نام تک نظر نہیں آتا۔ممکن ہے اب بزرگوں کے نزدیک صنفِ نازک کے جذبات قابلِ احترام نہ ہوں اور کمالِ بے نیازی اور بے دردی سے تلف کیے جا سکتے ہوں،لیکن کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ جب شاعروں کے کلام کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی اور کی جا رہی ہے تو کیوں نہ ان ہی اغراض و مقاصد کے ماتحت خواتین کا کلام بھی مدون کیا جائے۔''[4]

اردو میں 'نکات الشعراء'[25] (1751) 'تذکرۂ شعرائے اردو'[8] (177) کا 'گلشنِ گفتار'[2] (175) 'تحفۃ الشعراء'[2] (175) 'تذکرہ ریختہ گویاں'[3] (175) 'مخزن نکات'[5] (175) 'طبقات الشعراء'[4] (177) 'گلشنِ ہند'[0] (181) 'گلشنِ بے خار' (183[4]) وغیرہ جیسے معتبر اور مستند تذکروں میں کہیں بھی خواتین کا ذکر نہیں ملتا۔یہاں تک کہ 'آبِ حیات'[0] 188ء میں منظرِ عام پر آتا ہے جب تک اردو شاعرات مانند کہکشاں افقِ شاعری پر چمچما رہی تھیں مگر 'آبِ حیات' میں بھی ان کے ذکر کو ممنوع قرار دیا گیا۔ان تذکروں میں پہلوانِ سخن سودا کا ذکر تو آتا ہے مگر ان کی شاگردہ جینا بیگم تاریکی میں گم کر دی جاتی ہیں۔شہنشاہِ تغزل میر تقی میر کے ذکر کو اپنی شان سمجھا جاتا ہے مگر ان کی صاحبزادی بیگم کو لائقِ ذکر ہی نہیں سمجھا جاتا،میر تقی میر کی صاحبزادی کے متعلق پاکستان کی مشہور شاعرہ زہرہ نگاہ اپنے ایک لکچر میں فرماتی ہیں کہ ''میرا جی نے نیرنگ خیال کے کسی پرانے شمارے میں اپنے ایک مضمون میں میر تقی میر کی بیٹی کا ایک شعر درج کیا ہے۔پتہ نہیں میرا جی کو وہ شعر کہاں سے مل گیا مگر اس سے خوشبوئے میر تو آتی ہے۔'' شعر اس طرح ہے:

ابر چھایا ہے مینہ برستا ہے
بات کرنے کو جی ترستا ہے

زہرہ نگاہ آگے کہتی ہیں کہ اگر اس وقت کسی کو پتہ چل جاتا کہ ''بات کرنے کو جی ترستا ہے'' تو شاید اس لڑکی کا سر قلم کر دیا جاتا (https://www.youtube.com/watch ... b_q3MM7PoWU&t=)۔ پارسا بنتِ مرزا تقی خاں ہوس، سلطان معروف بہ سلطانی بیگم دختر نواب معتمد الدولہ لکھنو، بسم اللہ بیگم شاگردِ یقین، گنا بیگم شوخ اہلیہ غازی الدین حیدر اور شاگردِ میر قمر الدین منت، حیات النساء حیا دخترِ شاہ عالم ثانی اور مبارک النساء بیگم مبارک اہلیہ شاہ نجم الدین صغیر شاگردانِ شاہ نصیر، جانی بنت نواب فخر الدین خان و زوجہ نواب آصف الدولہ یا شاگردِ شاد عظیم آبادی، راضیہ خاتون جمیلہ زوجہ خدا بخش خاں کے علاوہ بہت سی دیگر خواتین شاعرات ایسی گزری ہیں جن کا ذکر کرنا ان مستند تذکروں میں معیوب سمجھا گیا۔[45]

یہی وجہ ہے جس نے مشہور و معروف ادیبہ اور نقاد ممتاز شیریں کو اپنے ایک خط بنام ضمیر الدین احمد میں یہ تحریر کرنے پر مجبور کیا کہ:

> ''آپ کو اس کی شکایت ہے کہ وقار عظیم نے 'ساقی' میں اپنے مضمون میں آپ کا یونہی سا ذکر کر دیا ہے۔ اب اسے کیا کہیے گا عبادت بریلوی نے 'ساقی' میں پچیس سالہ تنقید پر مضمون میں میرا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ حالانکہ بعض اونچے ادبی حلقوں میں یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ پاکستان میں دو وقیع نقاد ہیں۔ ایک عسکری صاحب ایک میں۔۔۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جان بوجھ کر مجھے نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی وجہ کا بھی اندازہ ہے کہ کیوں؟ میں اس لحاظ سے داد نہیں چاہتی کہ عورتوں میں، میں ایک ہی نقاد ہوں۔ ادب میں عورت مرد کی تفریق کو کیوں لایا جائے۔ دونوں کی ادبی حیثیت ساتھ ساتھ متعین کی جا سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسے مضمون میں جس میں ان کا تک ذکر ہو جنہوں نے صرف ایک ایک دو دو تنقیدی مضمون لکھے ہیں، میرا نام تک نہ لیا جائے، یہ تعجب خیز ہے۔''[46]

چونکہ خواتین کی تخلیقات کا ذکر مرد اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے یا ان کی تخلیقات کا منظر عام پر آنا مردانہ معاشرے کے لیے باعث ذلت سمجھا جاتا تھا اس لیے تاریخ میں کئی ایسی خواتین کا ذکر بھی ملتا ہے جنہوں نے اپنا نام بدل کر مردانہ قلمی نام سے یا اپنے نام کو کسی مردانہ رشتے سے منسلک کر کے اپنی تخلیقات شائع کروایا ہے۔ مغربی ادب میں Mary Evans نے اپنے اصلی نام کے بجائے اپنے ناول کو George کے مردانہ نام سے شائع کروایا۔ اور اسے اسی مصنوعی نام سے شہرت و مقبولیت ملی۔ اردو ادب میں بھی اس کی ڈھیروں مثالیں مل جائیں گی۔ خان بہادر نذر الباقر کی بہن اکبری بیگم کا پہلا قصّہ ''گلدستۂ محبت'' ۱۹۰۳ء میں عباس مرتضٰی کے فرضی نام سے مراد آباد سے اور دوسرا قصّہ ''گودڑ کا لال'' ۱۹۰۷ء میں والدہ افضل علی کے نام سے شائع ہوا۔ ز۔ خ۔ ش یعنی زاہدہ خاتون شروانیہ نے اپنی اصلی شناخت چھپا کر کبھی ز۔ خ۔ ش کبھی نادر خاتون تو کبھی خاتون کے نام سے ادب میں خود کو متعارف کروایا۔ صالحہ عابد حسین نے اپنی کئی تحریریں ہمشیرہ غلام السیدین کے نام سے شائع کیا۔ Niall Lucy نے ماہر نفسیات Freud کے نظریے کو اس طرح پیش کیا ہے:

> "For if the book symbolizes the mother(a transformat
> books are'Feminine'), its author must be the father;
> auther's thoughts, fertilizing and precious, yet defi
> be the father's penis or faces within the mother. An
> the son, hungry,voracious, destructive and defiling i
> his way into his mother, to find out what is inside
> traces out of her, to devour them, to make them his
> by them himself."[47]

Freud نے کتابوں کو عورت سے تشبیہہ دی ہے اور اسے ماں کہا مگر اس کی تخلیق کرنے والے کو مرد کہا جس کو باپ سے تشبیہہ دی۔ یعنی عورت کتاب تو ہے مگر بنا مرد کی تخلیقی قوت کے یہ صرف کورا کاغذ ہے۔ پڑھنے والے کو اس کا بیٹا کہا۔ فرائڈ نے

عورت کو نہ تخلیق کار کے زمرے میں رکھا اور نہ ہی قاری کے۔ عورت کو ایک ایسے مفعول کے زمرے میں رکھا جس کی بے معنی زندگی کو مردانہ شعور کی کاریگری بامعنی بنا دیتی ہے۔ اتنا بڑا عالم اور دانشور بھی عورت کے تخلیقی وجود اور مطالعاتی شعور سے منکر ہو گیا، یہ تعجب خیز ہے۔

ایسے ناسازگار حالات میں عورت حقوق کے تئیں باشعور ذہن کے ساتھ کیسے ادب کی تخلیق کر سکتی تھی۔ ایسا ادب جہاں صرف مرد کی ہی اجارہ داری ہے، جہاں اس کی تخلیقی قوت کو تسلیم ہی نہیں کیا جا رہا ہے اور اس کے لیے تعلیم کی عدم موجودگی سے اس کی سوچ پر پابندی عائد کر دی گئی ہے، اس کے غور و فکر کی صلاحیت کو معزول کر دیا گیا ہے تو اس سے ایک منفرد ادب کی تخلیق جس سے خالص اور باشعور نسائی فطرت کی مہک آتی ہو، کی امید کرنا مہمل سا لگتا ہے۔ مگر جب اس میں لکھنے پڑھنے کا شعور جاگا اور وہ تخلیقی کارنامے سرانجام دینے لگی تو اس سے ایسے ادب کی امید کرنا جس میں اس کے وجود کے اثبات کی جھلک پائی جائے اور جو تذکیری ادب کے مقابل معیاری ہو، اس مظلوم کے ساتھ سخت ناانصافی تھی۔ مگر بیسویں صدی میں جہاں تانیثی تحریک کے زیرِ سایہ اسے معاشرتی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی غرض ہر میدان میں مردوں کی طرح مختلف سہولیات ملتی رہیں اور وہ زمین تو چھوڑیے فلک کی سیر کرنے لگی تو اب اس کا ذہن کھلا، قلم کی ارتعاش کا خاتمہ ہوا اور وہ اپنے مکمل وجود کے ساتھ اپنی ذات کو منواتی نظر آ رہی ہے۔

عورت کو عورت سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔ اس سے یہی مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی تخلیق میں عورت کے مکمل وجود کو پیش کرتے ہوئے اس کی کردار نگاری کے ساتھ صحیح انصاف کرے اور ادب میں اس کو وہ جگہ عطا فرمائے جس کی وہ جائز حقدار ہے۔ سیمون دی بوا لکھتی ہیں:

> ''ہم نسوانی دنیا کو مردوں کی نسبت زیادہ گہرائی میں جانتی ہیں کیوں کہ اس کے اندر ہماری جڑیں ہیں۔ ہمیں مردوں کی نسبت زیادہ بہتر اور واضح طور پر معلوم ہے کہ کسی انسان کے عورت ہونے کا کیا مطلب ہے؟'' 48

تانیثی مفکرین نے زیادہ سے زیادہ خواتین کی ادب میں شمولیت پر توجہ مرکوز کیا ہے تاکہ نسائی ادب کو تذکیری ادب کے مد مقابل رکھا جا سکے کہ ہمیشہ سے مردوں کی یہ شکایت رہی ہے کہ خواتین اس لائق ہی نہیں کہ تصوری قطعیت و وضاحت کے ساتھ ایک معیاری ادب کی تخلیق کر پائیں۔ اس لیے جو بھی انہوں نے لکھا اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ اس لیے قدیم ادبی متون کی ازسرِ نو دریافت کر کے اس کا تانیثی نقطۂ نظر سے بغور مطالعہ کیا جانا ضروری قرار دیا گیا۔ جب تک خواتین ادبی دنیا میں خود آگہی سے مزین اپنی تحریر کا جھنڈا نہیں لہرائیں گی تب تک ادب میں جہاں مرد کی حکومت ہے، ان کو نظر انداز کیا جاتا رہے گا، خواتین کو یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ جس عقل و ادراک، ذہن و تصور کا مالک مرد ہے، اللہ نے ان صلاحیتوں سے انہیں بھی نوازا ہے، مردوں کے پیدا کردہ ماضی کے ناسازگار و نامساعد حالات کے سبب ان کے ہاتھ قلم پکڑنے سے محروم رہ گئے تھے یا جس کسی نے پکڑنے کی کوشش بھی کی تو ذہنی ارتعاش اس پائے کا تخلیقی ادب پیدا کرنے سے معذول رہی۔ مگر اب انہیں ادب میں اپنی شمولیت اور اہمیت کو منوانا پڑے گا۔ نتیجہ نہایت ہی خوش کن سامنے آیا ہے کہ چاہے وہ مغربی ادب ہو یا مشرقی ادب خواتین اپنی معیاری تخلیق کے ذریعہ مرد کے ہم قدم چل رہی ہیں اور کہیں کہیں مرد سے آگے بھی نکل گئی ہیں۔ عصمت چغتائی جدید ادب کی تائید میں تحریر کردہ مضمون ''ایک بات'' میں لکھتی ہیں:

> ''جب ادب کا سوال آتا ہے تو اس میں زنانہ مردانے ادب کا کیا سوال۔ جو نظام لڑکوں کو پسند نہیں وہ لڑکیوں کو کب پسند آ سکتا ہے۔ مرد اگر چیخ سکتا ہے تو عورت کو بھی کراہنے کی

اجازت ہونی چاہیے۔" 49

تانیثی تنقید کا ایک اور پہلو ادب میں عورت کے جنسی استحصال پر قدغن لگاتا ہے۔ اکثر مرد قلم کاروں کی تحریروں میں مظلوم عورت کا جنسی استحصال دکھایا جاتا ہے اور نہایت ہی عامیانہ انداز میں اس کے جنسی تعلقات مبتذل الفاظ کے ذریعہ پیش کیے جاتے ہیں جس کے مطالعے سے مرد قاری انتہائی محظوظ بھی ہوتا ہے۔ تانیثی مفکرین اس قسم کی تحریروں پر روک لگانا چاہتے ہیں اور قاری کے ذہن کو بدلنا چاہتے ہیں کہ ادب جنس بازاری کا نام نہیں ہے اور نہ ہی سماج کی ہر عورت فاحشہ ہے۔ اس کے مختلف روپ ہیں، متنوع پہلوؤں سے اس کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ ادب خود ہی اپنے آپ میں لائقِ تعظیم ہے، جنسی معاملات کے بیان میں سہوانی لذت حاصل کرنے کے لیے فحش انداز اپنانا اپنی نالائقی یا بد دیانتی کی دلالت کرتا ہے نہ کہ اس سے عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ اس لیے تانیثی تنقید اس قسم کی تحریر سے اجتناب کرتے ہوئے ادبی گہوارے کو اس کی آلودگی سے بچانا چاہتی ہے۔

ایلین شوالٹر وضاحت کرتی ہیں کہ مرد حاوی معاشرے میں نسوانی تخلیق کو لسانی سطح پر بھی منفرد ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لسانی تھیوری مختلف پہلوؤں پر سوال اٹھاتی ہے کہ کیا مرد و زن لسانی سطح پر منفرد شخصیت کے حامل ہیں، کیا تخلیقی ادب کی زبان جو جنسی افتراق کو پیشِ نظر رکھ کر استعمال کی جاتی ہے وہ حیاتیات یا معاشرہ کی پیدا کردہ ہے؟ کیا عورت اپنے لیے نئی زبان پیدا کر سکتی ہے اور کیا لکھنے، پڑھنے اور بولنے کے لیے جس زبان کو عورت استعمال کرتی ہے وہ اس معاشرے کے ذریعہ پیدا کردہ صنفی افتراق کی دین ہے؟ Nelly Furman لکھتی ہیں:

> "It is through the medium of language that we define
> difference and similarity, which in turn allow us t
> around us. Male-centered categorizations predominate
> and subtly shape our underestanding and perception o
> attention is increasingly directed to the inherentl
> women of a male-constructed language system." [50]

مرد حاوی معاشرے نے زندگی کے تمام شعبوں کے ساتھ ساتھ زبان پر بھی اپنی عصبیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایک طرف جس زبان کا استعمال مرد کرتے ہیں وہاں ان کی حاکمیت جھلکتی ہے اور خاتون کی زبان، اس کی مظلومیت اور مغلوبیت کی داستان سناتی ہے۔ Robin Lakoff نے اپنی تصنیف "Language and woman's place" میں عورت کی زبان کا لسانی تجزیہ بڑے واضح انداز میں پیش کیا ہے۔ جہاں عورت کی چپکی مرد کے ظلم و بربریت کا مظاہرہ کرتی ہے وہیں اس کی زبان بھی اس کی محکومیت کی دلدوز داستان پیش کرتی ہے، جسے رابن لیکف "Talking Like A Lady" کہتی ہے۔ اس نے اس ضمن میں دو جملوں کے ذریعہ زبان کی سطح پر مرد و زن میں پائے جانے والے لسانی افتراقات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً:

(a) Oh dear, you've put the peanut butter in the refri

(b) Shit, you've put the peanut butter in the refrige

Robin Lekoff بتاتی ہیں کہ اگر کسی سے پوچھا جائے ان دو جملوں میں کون سا مرد نے کہا ہے اور کون سا عورت نے؟ تو لوگوں کا بڑا آسان سا جواب ہوگا کہ پہلا جملہ عورت کا ہے اور دوسرا مرد کا۔ پہلا جملہ جہاں ایک طرف عجز و انکساری کا مظاہرہ کرتا ہے وہیں دوسری طرف ایک کمزور اور مظلوم طبقے کی زبان کو پیش کر رہا ہے۔ دوسرا جملہ مالکانہ انداز اپنائے ہوئے ہے۔ اس کے بین السطور میں مردوں کی حاکمیت مضمر ہے۔ آج کے دورِ جدید میں چند خود اعتماد عورتیں عام طور پر دوسرے جملے کی زبان استعمال کرنے لگی ہیں مگر آج بھی شاید عوام کا ایک بڑا طبقہ دوسرے جملے کو مرد سے ہی منسوب کرتا ہے۔ اور عورتوں کے لیے دوسرے جملے کے استعمال کو معیوب سمجھتا ہے۔ معاشرے کے سارے طاقتور عناصر پر مردوں کا قبضہ ہے اور

کمزور پہلوؤں پر عورتوں کا۔اس لیے جتنے کمزور اور غیر یقینی الفاظ ہیں ان کا اطلاق عورت پر کیا جاتا ہے۔اس لیے اس کی زبان بھی محکومانہ عناصر سے معمور ہے۔مرد و زن کے درمیان یہ افتراقات معاشرے کے ذریعہ پیدا کردہ صنفی انفرادیت کا مظاہرہ کرتے ہیں جہاں عورت کا روایتی کردار اور اس کی زبان مرد سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ایک ہی معاشرے کے پیداوار ہونے کے باوجود ایک ہر لحاظ سے حاکم بنا ہوا ہے تو دوسری صنف ہر پہلو سے محکوم۔

یہی وجہ ہے کہ تانیثی تنقید مروجہ زبان کی مخالفت کرتی ہے۔یہ زبان مردوں کی پیدا کردہ ہے جس میں عورت اپنے احساسات و جذبات کا اظہار نہیں کر سکتی۔اس کی زبان اور اس کی تحریریں لسانی اعتبار سے مردوں کی وضع کردہ تحریروں سے الگ ہونی چاہیے۔ہیلن سکسوس (Helene Cixous) اور جولیا کرسٹیوا (Julia Kristeva) نے بھی عورت کی الگ زبان کے بارے میں اپنی آراء دی ہے۔ہیلن سکسوس نے Ecriture Feminine (Feminine Writing) کا ایک تصوّر پیش کیا ہے۔اس کے مطابق خاتون کی تحریر اپنے اسلوب زبان، لہجہ اور احساس کے اعتبار سے مکمل طور پر مرد کی تحریر سے الگ ہے۔ اپنے ایک مقالہ "The Laugh of the Medusa" میں کہتی ہے یہ انفرادیت حیاتیاتی جبریت کی بدولت نہیں ہے کیوں کہ کبھی کبھی خواتین اپنی تحریروں میں مردانہ اندازِ گفتگو اپناتی ہیں اور کبھی مرد بھی زنانہ اندازِ گفتگو کی پیروی کرتے ہیں(اردو ادب میں ریختی اس کی مثال ہے)۔ہیلن کا ماننا ہے کہ بچہ روایتی زبان سیکھنے سے پہلے ہی ماں اور بچے کے رشتے میں Ecriture Feminine یعنی نسائی زبان اپنا اثر دکھانا شروع کر دیتی ہے۔یہی ممکنہ زبان جب مرد و زن کے ذریعہ تحریر میں استعمال ہوتی ہے تو منطق اور عقل یا کوئی بھی شئے جو معنی کے ساتھ آزادانہ طور پر کھیلنے کو مجبور کرتی ہے اسے یکسر ختم کر دیتی ہے [52]

فوزیہ رانی اپنے پی ایچ۔ڈی کا مقالہ ''پاکستانی اردو افسانہ نگار خواتین کے افسانوں میں نسوانی کردار۔تحقیقی و تنقیدی مطالعہ'' میں اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ زبان میں عورت کے استعمال ہونے والے بعض الفاظ زبان کی سطح پر اس کے استحصال کا پتہ دیتے ہیں۔یہاں انہوں نے ایک مثال چینی (Chinese) زبان کا دیا ہے جس میں عورت اور مرد کے لیے ایک ہی صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔چینی زبان میں عورت کے لیے جو لفظ بولا جاتا ہے وہی لفظ غلام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔بلوچستان میں شادی کے لیے کوئی مخصوص لفظ نہیں ہے بلکہ ''بیوی خریدنے'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے [53]۔وہاں شادی کے لیے عورت کو خریدنے کا رواج ہے۔چونکہ زبان پر عملی زندگی کا پہلو غالب رہتا ہے اس لیے زبان میں بھی شادی کے لیے خریدنے کا لفظ مستعمل ہے۔اردو زبان میں لفظ ''عورت'' کو ہی لیجیے اس پر شہناز نبی کا بہترین تجزیہ ان کے ایک مضمون ''عورت اور لغت'' میں موجود ہے جو ان کی کتاب ''تانیثی تنقید'' میں شامل ہے۔اس ضمن میں انہوں نے مختلف لغات کا حوالہ پیش کیا ہے۔مثلاً فرہنگِ آصفیہ کے مطابق:

> عورت (ع) اسم مونث۔(۱) آدمی کے جسم کا وہ حصہ یا عضو جس کا کھولنا موجبِ شرم ہے۔اندامِ نہانی، شرم گاہ۔چنانچہ سترِ عورت سے شرم گاہ کا ڈھانکنا مراد ہوتی ہے۔(۲)(مجازاً) زن، استری، تریا، نار، ناری، لگائی، مہرارو، (۳)(عوام) جورو، بیوی، زوجہ۔

اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے عورت سے منسلک مختلف الفاظ مثلاً زوجہ، عورت ذات، زنانہ، زنانی female، woman، feminine، femininity وغیرہ الفاظ کے معانی بھی مختلف لغات کے حوالے سے پیش کیا ہے۔عورت ذات سے منسلک مختلف محاورات اور ضرب الامثال کا بھی حوالہ دیا ہے جن میں عورت کو بے وقوف اور منفی صفات کا حامل بتایا گیا ہے۔ یہاں وہ فرانسیسی تھیوری کا بھی ذکر کرتی ہیں کہ مردوں نے زبان کی تشکیل اس طور پر کی کہ عورت پر ان کی برتری اور فوقیت ثابت ہو سکے۔آخر میں اپنے مضمون کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

> ''مرد نے 'شجاعت' کو اپنی صفت قرار دیا اور 'اطاعت' کو عورت کی۔وہ خود کو تہذیب کی علامت سمجھتا ہے اور عورت کو

فطرت کی۔غرض مردوں کے بنائے ہوئے اس سماج میں زبان بھی مردوں کی پابند رہی ہے۔"

54

شہناز نبی عورت ذات پر مردوں کی عصبیت کا ذکر کرتے ہوئے Helen کا ایک قول نقل کر رہی ہیں:

"Men have committed the greatest crime against wom
violently, they have led women to hate women, to be
mobilize their immense strength against themselves,
their virile needs. They have made for women an anti
of the Madusa) [55]

اس لیے ہیلن کے مطابق خواتین کو اپنے جسم کے حوالے سے لکھنا چاہیے۔اور اپنے لیے یا اپنی تخلیقات میں ایسی زبان کا استعمال کیا جانا چاہیے جو مردانہ وضع کردہ روایت کو مسمار کرتا ہو جس میں عورت کی مظلوم، اطاعت شعار، تابعدار، محکوم، غلام، لونڈی وغیرہ جیسی شبیہہ کا رڈ موجود ہو۔ہیلن کی طرح دیگر مفکرین بھی ایک ایسی زبان کے خواہش مند ہیں جس سے اس کی پسپائی کا مظاہرہ نہ ہو۔کیوں کہ آج کے نسائی طبقے کا غالب حصہ کسی بھی پہلو سے اپنے آپ کو مرد کے ماتحت رکھنا نہیں چاہتا۔اس لیے اس کے کردار اور عمل کی مانند اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ بہ حیثیت انسان اس کے مکمل وجود کی شناخت کا ذریعہ بنیں جس سے اس کی خود اعتمادی کو حوصلہ ملے۔

نفسیات پر مبنی تانیثی تنقید نسائی ادب کے متعلق مصنف کی سائیکی میں موجود افتراقات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ تخلیقی عمل میں صنفی عمل دخل کا مظاہرہ کرتا ہے۔اس پورے عمل میں حیاتیاتی، لسانیاتی اور معاشرتی نظام کی کارفرمائی بالواسطہ موجود ہے جو عورت کی سائیکی کی تعمیر میں صنفی تضاد کو مدِ نظر رکھتا ہے۔نتیجتاً محکومیت، مغلوبیت، خوف و ہراس، بے چارگی، پسپائی وغیرہ جیسے منفی احساسات عورت کے اندر از خود پیدا ہو جاتے ہیں۔باوجود اس کے کہ وہ ایک بیدار ذہن اور متحرک عقل و شعور کی مالک ہے مگر اس کی سائیکی پر مرد غالب معاشرہ اس طرح قابض ہے کہ وہ اس مغلوب دائرے سے باہر نکل کر اپنی انفرادیت کو ثابت کرنے سے قاصر ہے۔

Elaine Showalter "The mad wom... کے خالق گلبرٹ (Gilbert) اور گوبار (Gubar) کا نظریہ پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"In their view, the nature and 'Difference' of women'
and tormented relationship to female identity: The wo
her own gender as "a painful obstacle or even a debil
ninetinth-century women writer inscribed her own sick
anorexia, her agoraphobia, and her paralysis in her t

Elaine Showalter کے مطابق نسائی تخلیق کی خصوصیت اور انفرادیت کو جانچنے کے لیے حیاتیاتی، لسانیاتی اور نفسیاتی نظریے سے زیادہ مکمل اور اطمینان بخش نظریہ عورت کی ثقافتی تھیوری پر مبنی ہے۔کیوں کہ اس تھیوری میں حیاتیاتی، لسانیاتی اور نفسیاتی تھیوریز از خود شامل ہو جاتی ہیں۔ثقافتی تھیوری ان سارے پہلوؤں کا اظہار سماجی Cont میں کرتا ہے کیوں کہ سماج ہی ان سب کی تعمیر و ارتقاء کا منبع ہے۔

Gerda lerner کے خیال میں نسائی ثقافتی تھیوری اس پر توجہ مرکوز کرتی ہے کہ معاشرے نے نسائی کلچر کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا۔عورت کو تاریخ میں کوئی جگہ نہیں ملی اس کا سبب عام طور پر مردوں کی شیطانی حرکتیں یا خصوصی طور پر مرد تاریخ نویس نہیں ہیں، کیوں کہ ہم نے تاریخ کی تعمیر میں مرد مرکزی شرائط اور اصطلاحات کو مدنظر رکھا ہے۔عورت اور اس کی

کارکردگیوں کو بھلا بیٹھے۔اس کو بدلنے کے لیے تاریخ کے گوشے میں پوشیدہ نسائی مضمرات پر روشنی ڈالنے کے لیے ہمیں نسائی مرکزی مطالعے پر فوکس کرنا ہوگا۔مردوزن کے عام کلچر میں نسائی کلچر کے وجود میں آنے والے ممکنات پر غور کرنا پڑے گا۔ایسا نہیں ہے کہ نسائی کلچر سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور اسے نئے سرے سے پیدا کرنا پڑے گا۔نسائی کلچر کی تلاش انسانی کلچر میں ہی کی جانی چاہیے۔چونکہ تاریخ میں عورت کو کوئی جگہ نہیں دی گئی اسے صرف مردوں کی جولاں گاہ قرار دیا گیا جو مردوں کے کارنامے کے لیے ہی مختص رہی،تاریخ کی اس بڑی کمی کو محسوس کرتے ہوئے نسائی مرکز مطالعے سے ایک نئی تاریخ لکھی جاسکتی ہے جس میں عورت ذات کے ساتھ منسلک کمزور، پسماندہ اور ادھوری جیسے تلازمات کی نمائندگی نہ رہے۔اسے نسائی فلسفے کے مقاصد میں شامل کیا جانا چاہیے۔

انگریزی ادب میں تانیثی تنقید،تانیثی ادیب کے ساتھ ساتھ تانیثی قاری کا نظریہ بھی پیش کرتی ہے۔اس میں ان پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا ہے کہ کیا خواتین ہی تانیثی ادب کی بہترین قاری ہوسکتی ہیں مرد نہیں ہوسکتے؟ دیویندر اسر لکھتے ہیں:

> ''عورتوں کے مسائل مردوں کے مسائل سے اتنے زیادہ مختلف ہیں کہ مرد تخلیق کاران کی نمائندگی/ترجمانی نہیں کرسکتے۔عورتوں کی کردارنگاری میں مرد غالب اور عورت مخالف تعصبات اور رویے کسی نہ کسی طور اور سطح پر شعوری یا غیر شعوری طور پر در آتے ہیں۔'' 5.7

جس طرح مرد تخلیق کار عورت کے مسائل کی نمائندگی نہیں کرسکتے کہ کہیں نہ کہیں عورت مخالف تعصّبات جو مرد کے اندر موجود ہیں ان کا اظہار ہوجائے گا۔کیوں کہ یہ بڑے ہی دل جگرے کی بات ہے کہ اپنا قلم اپنے ہی ظلم کی داستان سنائے اور خود کی مخالفت اور عورت جیسی ثانوی جنس (بقول مرد) کی حمایت میں ایمانداری سے کام لے۔اسی طرح مرد قاری کے لیے بھی یہ نہایت ہی مشکل کام ہے کہ کسی نسائی تخلیق کے مطالعے کے دوران مرد غالب اور عورت مخالف تعصّبات اور رویے کو بالائے طاق رکھ کر پورے انصاف کے ساتھ اس متن کا تجزیہ کرے۔اس لیے تانیثی مفکرین ادب کا تجزیہ نسائی نقطۂ نظر سے نسائی قاری سے ہی کروانا صحیح مانتے ہیں اس لیے ان کے مطابق خواتین تعلیم اور تربیت کے ذریعے اپنے اندر بہترین قاری ہونے کی صلاحیت پیدا کریں تبھی نسائی ادب کے ساتھ صحیح انصاف ہو پائے گا۔مگر مرگریٹ ایل اینڈرسن کے خیال میں مصنف اور قاری دونوں اگر عورت کی طرح محسوس کرسکتے ہیں اور اس کی طرح سوچ سکتے ہیں تو تانیثی ادیب اور تانیثی قاری ہوسکتے ہیں۔

شمس الرحمن فاروقی نے بلند درجہ تانیثی مطالعات کے لیے مردوں اور عورتوں کے بنائے ہوئے متون کے مطالعہ میں چند مفروضات کو اہم قرار دیا ہے۔ان کا ایک مفروضہ یہ ہے کہ کسی متن میں بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جنہیں صرف عورت سمجھ سکتی ہے۔مگر بعض ایسے بھی ہوسکتے ہیں جو صرف مرد کی سمجھ کے دائرے میں آئیں۔مگر انہوں نے اس بات پر زیادہ زور دیا ہے کہ عورت کے بنائے ہوئے متون کا مطالعہ صرف عورت ہی صحیح طرح سے کرسکتی ہے۔کیوں کہ ایک چیز کو وہ کسی اور طرح سے دیکھتی ہے اور مرد کسی دوسری طرح سے۔اور چند ایسے نسائی تجربات بھی متن میں موجود رہتے ہیں جنہیں مرد کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ایک عورت قاری کے لیے بھی انہوں نے دو ممکنہ مفروضات کی نشاندہی کی ہے۔ایسی عورت قارئین موجود ہیں جو روایتی سوچ کی حامل ہیں اور اپنے بارے میں وہی تصورات،مفروضات اور تعصّبات رکھتی ہیں جو مردوں کے اندر موجود ہیں۔اور ایسی بھی ہیں جو اپنے بارے میں سارے تصورات وہی قائم نہیں کرتی جو مردوں کے ذریعہ پیدا کردہ ہیں بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ رائج کرداروں سے ہٹ کر تانیثی ادب میں عورت کے انفرادی وجود کی شناخت کرپائیں۔ 5.8

اس بات سے قطع نظر نہیں کیا جاسکتا کہ عورت کو سمجھنے کا مادہ عورت کے اندر ہی موجود رہتا ہے۔مگر جیسا شمس الرحمن فاروقی نے کہا کہ مرد کے اندر بھی تانیثی شعور پائے جاتے ہیں اور کبھی کبھی کسی متن سے ایسا گوشہ تلاش لیتے ہیں جو ان میں تانیثی شعور

کی موجودگی کی نشاندہی کرتا ہے۔قاضی افضال حسین نے اپنے مضمون ''متن کی تانیثی قرأت'' میں ناول ''امراؤ جان ادا'' کے چند اقتباسات کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ایک اقتباس میں امراؤ جان کی ملازمہ آبادی بیگم کے متعلق رسوا کے استفسار پر امراؤ اپنے خیالات پیش کرتی ہے۔یہاں امراؤ عورت ہونے کے باوجود آبادی بیگم کے ساتھ ہونے والے حادثات کا ذمہ دار اس کے ساتھ کھلواڑ کرنے والے مردوں کو نہیں ٹھہراتی بلکہ اس کی بری خصلتوں کا بیان کر کے آبادی بیگم کی ہاتھوں ہاتھ منتقلی کی وجہ خود آبادی بیگم کو بتاتی ہے۔یہاں قاضی افضال حسین کا تانیثی شعور انہیں یہ کہنے پر آمادہ کرتا ہے:

> ''امراؤ جان خود اپنی زندگی سے بھی کچھ سیکھ نہیں سکیں۔(کیا یہی سب کچھ امراؤ جان کے ساتھ نہ ہوا تھا؟) یا ناول نگار نے سیکھنے نہ دیا۔وہ اب بھی یہی سمجھتی ہیں کہ:
>
> ''محبت کے باب میں مرد (معاف کیجیے گا) اکثر بے وقوف اور عورتیں بہت ہی چالاک ہوتی ہیں، اکثر مرد سچے دل سے اظہارِ عشق کرتے ہیں اور اکثر عورتیں جھوٹی محبت جتاتی ہیں''۔۔۔۔
>
> ''عورتیں ضعیف القویٰ ہیں، ان کو بعض وصف ایسے دیے گئے ہیں جن سے یہ کمی پوری ہو جائے۔من جملہ ان اوصاف کے ایک وصف یہ بھی ہے بلکہ میں کہہ سکتی ہوں شاید ہی ایک وصف ہے جس کی مثال جانوروں میں بھی مل سکتی ہے۔اکثر ضعیف جانوروں میں بھی حیلہ گری کا مادہ ہے۔''
>
> صاف پدری نظام معاشرت کے تعصّبات امراؤ جان کے مشاہدات کے پردے میں بیان کیے جا رہے ہیں۔۔۔بہر حال امراؤ جان ادا کی داستان اگرچہ صیغۂ واحد حاضر میں بیان کی گئی ہے، جس کا تقاضہ یہ تھا کہ امراؤ جان واقعات کو ایک عورت کے نقطۂ نظر سے بیان کرتی مگر اب نسائی تشخص کے باوجود راوی انہی اقدار کا حامل ہے جو اصلاً مرد اساس ہے۔''[59]

قاضی افضال حسین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ناول نگار اور راوی رسوا اپنے آپ کو مرد غالب نظامِ اقدار کی حد بندیوں سے آزاد نہیں کر پایا ہے۔اس نے 'امراؤ جان ادا' کے نسائی کردار کو ویسا ہی پیش کیا ہے جیسا مرد بالا دست نظامِ اقدار کے تناظر میں عورت کی امیجری موجود ہے۔یہاں یہ کہنا مقصود ہے کہ کسی ادب پارے کے نسائی کردار کا غیر متعصّبانہ تجزیے میں نسائی جذبات واحساسات کی پرکھ کے لیے تانیثی شعور کا ہونا لازمی ہے اب چاہے وہ مرد میں ہو یا عورت میں۔

تانیثی تنقید کا ایک اور پہلو اس نقطے کی وضاحت کرتا ہے کہ عورت اپنا ایک آزاد وجود رکھتی ہے اور ادب میں اپنی اسی حیثیت کی کردار نگاری کا مطالبہ کرتی ہے۔ہمیشہ سے ایک Stereotype کردار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور ایسی کردار نگاری کو اس کی اصل فطرت مانا جاتا ہے Mill اپنی تصنیف "The Subjection of Women" میں اس بات کو رد کرتا ہے کہ جس چیز کو عورت کی فطرت کہا جاتا ہے وہ صحیح معنوں میں ایک مصنوعی سوچ ہے۔ایسی فطرت مردانہ جبر یا قدرتی انگیخت سے پیدا ہو سکتی ہے۔یہ عورت کی اصل فطرت نہیں ہے جس کو اس کی ذات کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے۔روایتی سوچ کے مطابق عورت کے رائج اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے میری ایلمن لکھتی ہے:

> "Formlessness, passivity, instability, confinement spirituality, irratioanality, complaincy and names t shrew and the witch."[60]

مگر عورت کی ایسی روایتی صفات اس کے اپنے نہیں ہیں انہیں اس کی ذات کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے جس سے اس کے وجود کو مسخ کیا جا سکے اور مردانہ نظام کا یہ ماننا ہے کہ یہ اس کی نسائیت کا مظاہرہ ہے جو اس کی ذات میں موجود ہے۔اگر عورت اس سے آزاد ہو جائے تو اس کی نسائیت خطرے میں پڑ جائے گی جو قدرتی نظام کے ساتھ کھلواڑ ہے۔مگر یہ صرف

مردانہ معاشرے کی پیدا کردہ اول جلول باتیں ہیں جن کا اصلیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔اس لیے تانیثی مفکرین عورت کے روایتی تصورات سے الگ ہٹ کرآزاد وجود کی کردار نگاری کا مطالبہ کرتے ہیں۔

حاصل مطالعہ کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تانیثی تنقید ناقدین ادب سے درج ذیل مطالبے کرتی ہے:

☆ ادبی روایت کو نسائی زاویوں سیاز سرنو ترتیب دینے کا مطالبہ کرتی ہے کیوں کہ خواتین ادیباؤں کو ان کا جائز مقام نہیں ملا ہے۔

☆ مرد قلم کاروں نے اپنی تحریروں میں عورت کردار کو کس طرح پیش کیا ہے اس کا گہرائی و گیرائی سے جائزہ لیا جائے۔

☆ خواتین قلم کاروں نے اپنے متن میں عورت کے روایتی تصورات کی کردار نگاری کی ہے یا اسے ایک آزاد وجود کے تحت پیش کیا ہے؟اس کا جائزہ لیا جائے،اگر روایتی تصورات کا عکس ملتا ہے تو اس کے بین السطور میں کون کون سے وجوہات مضمر ہیں اس کا پتہ لگایا جائے۔

☆ زبان کی سطح پر معاشرے کیتعین کردہ تحکمانہ اورمحکومانہ عناصر کا جائزہ لیا جائے نیز ایک نئی نسائی زبان و لہجے کی ایجاد کو ضروری مانا گیا ہے جس میں عورت کی محکومیت نہیں بلکہ اس کی خود اعتمادی اور خود احترامی برقرار رہ پائے۔

☆ تانیثی مفکرین کا رجحان زیادہ تر اس نقطے پر رہتا ہے کہ تانیثی ادبی روایت کا قیام عمل میں آئے تا کہ تاریخ ادب میں خواتین کی شمولیت کی وضاحت کی جا سکے۔اس ضمن میں قدیم ادبی متون کا ازسرنو مطالعہ اور تجزیہ کیا جانا ضروری گردانا جاتا ہے۔

☆ تانیثی مفکرین عورت کے روایتی تصورات سے الگ ہٹ کر آزاد وجود کی کردار نگاری کا مطالبہ کرتے ہیں۔

حوالہ جات

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	صفحہ نمبر
1۔	انور سدید	اردو ادب کی تحریکیں	23
2۔	دیوندر اسر	اردو میں نسائی ادب کا منظر نامہ	53-54
3۔	ڈاکٹر سطوت ریحانہ	مصر میں آزادئ نسواں کی تحریکاور جدید اربی ادب پر اس کے اثرات	29
4۔	Cristen Conger	www.stuffmomnevertoldyou.com/blogs/the-man-	
5۔	Cristen Conger	www.stuffmomnevertoldyou.com/blogs/the-man-	
6۔	شہناز نبی	فیمنزم: تاریخ وتنقید	18
7۔	Charls Fourier		
8۔	Neeru Tandon	Feminism: A Paradigm Shift	1-2
9۔	Jane Freedman	Concept in the Social Sciences, Feminism	2
10۔	دیوندر اسر	مشمولہ: بیسویں صدی میں واتین اردو ادب	46
11۔	Cornell Drucilla	مشمولہ: اردو ادب میں نسائی تنقید	18
12۔	June Hannam	Feminism	4
13۔	K.A. Kunjakkan	مشمولہ: پاک کی اردو افسانہ نگار خواتین کے افسانوں کے نسوانی کردار	3
14۔	Margaret L. Andersen	مشمولہ: پاک کی اردو افسانہ نگار خواتین کے افسانوں کے نسوانی کردار	34
15۔	Chaman Nahal	Feminism in the Indian Context: An Introduction	4
16۔	Dame Rebecca West	rationalwiki.org/wiki/feminism	
17۔	قاضی افضال حسین	مشمولہ: کسوٹی جدید،نسائی ادب نمبر	30
18۔	فہمیدہ ریاض	فیمنزم اور ہم (ادب کی گواہی)	32
19۔	ایم۔عبدالرحمٰن خان	مشمولہ: اردو نظم میں عورت کا تصور	10
20۔	روسو	مشمولہ: فیمنزم: تاریخ وتنقید	35
21۔	زاہدہ حنا	عورت: زندگی کا زنداں	42
22۔	انور سدید	اردو ادب کی تحریکیں	32
23۔	simone de Beauvoir	http://en.wikipedia.org/wiki/history-of-feminism	
24۔	سطوت ریحانہ	مصر میں آزادئ نسواں کی تحریک اور جدید عربی ادب پر اس کے اثرات	31
25۔	زاہدہ حنا	عورت زندگی از زنداں	43
26۔	زاہدہ حنا	عورت زندگی کا زنداں	43
27۔	محمد رفیق چودھری	مشمولہ: جدید تحریک نسواں اور اسلام	24
28۔	وہاب اشرفی	عالمی تحری نسائیت: مضمرات وممکنات	102
29۔	پروفیسر ثریہ بتول	جدید تحریک نسواں اور اسلام	26
30۔	Riot Grrrl	https://en.wikipedia.org/wiki/third-wave-feminism	

نمبر	مصنف	کتاب	صفحہ
31-	Rebecca Walker	https://en.wikipedia.org/wiki/Third-wave-feminism	
32-	Fifth Wave Feminism	https://en.wikipedia.org/how-to-be-a-women#fifth-	
33-	سیمون دی بوا	پاک کی اردو افسانہ نگار خواتین کے افسانوں کے نسوانی کردار	3
34-	Judith Lorber	The Variety of Feminisms and their Contribution to Gender Equallity	20
35-	علامہ مجتبیٰ حسین	اقوام عالم میں عورت کا معیار	8
36-	سید احتشام حسین	تنقید اور عملی تنقید	13
37-	Neeru Tondon	Feminism, A Paradigm Shift	34
38-	عتیق اللہ	مشمولہ: کسوٹی جدید: نسائی ادب نمبر	24
39-	August Bebel	Women in the Past, Present and Future	11
40-	سیمون دی بوا	عورت، مترجم: یاسر جواد	18
41-	احمد ندیم قاسمی	مشمولہ: نقوش، لاہور، منٹو نمبر	362
42-	حامد کاشمیری	http://aikrozan.com	3
43-	مولانا رومی	مشمولہ: عورت اور مرد کا مرتبہ اقوام عالم میں	379
44-	جمیل احمد بریلوی	تذکرۂ شاعراتِ اردو	39-40
45-	انور شمیم	رسالہ کسوٹی جدید، نسائی ادب نمبر	8
46-	ممتاز شیریں	مشمولہ: تانیثی تنقید: ممتاز شیریں سے عہد حاضر تک	16
47-	Niall Lucy	Post Modern Literary Theory: An Introduction	6
48-	سیمون دی بوا	عورت، ترجمہ: یاسر جواد	30
49-	عصمت چغتائی	ایک بات	10
50-	Nelly Furman	مشمولہ: Feminist Criticism	190
51-	Robin Lakoff	Language and Women's Place	50
52-	Wiley Blackwell publication	A Dictionary of Literary Terms and Literary Theory	225
53-	فوزیہ رانی	پاک کی اردو افسانہ نگار خواتین کے افسانوں کے نسوانی کردار	20
54-	شہناز نبی	تانیثی تنقید	19
55-	شہناز نبی	تانیثی تنقید	19
56-	Elaine Showalter	Feminist Criticism	195
57-	دیوندر اسر	مشمولہ: بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب	49
58-	شمس الرحمٰن فاروقی	کسوٹی جدید، نسائی ادب نمبر	14-15
59-	قاضی افضال حسین	کسوٹی جدید، نسائی ادب نمبر	33
60-	میری ایلمن	مشمولہ: پاک اردو افسانہ نگار خواتین کے افسانوں کے نسوانی کردار	13

باب دوم: عورت: ایک نظری پس منظر

1:- ہندوستان میں عورت کا تصوّر اور مقام
2:- مذہبِ اسلام میں عورت کا تصوّر اور مقام
3:- بین الاقوامی منشور، ہندوستانی آئین اور اس کے تحت روبہ عمل اسکیمیں (حقوق نسواں)

مرد وزن، خالق کائنات کی سب سے اہم تخلیق ہونے کے ساتھ ساتھ نظام دنیا کی عمارت کے دو اہم اور مضبوط ستون بھی ہیں، جن کی موجودگی دنیا کے سرسبز و شاداب وجود کی ضامن ہے۔ گردش زمانہ کے ساتھ ساتھ وقوع پذیر ہونے والے انقلابات انسانی زندگی کی ارتقاء پذیری کا محرک بنتے ہیں۔ اسی طرح انسان کے ذریعہ کیے جانے والے عوامل بھی زمانے کے نظام فطرت کی تحرک کا سبب بنتے ہیں۔ ایسے ہی وجود میں آنے والے منفی عوامل نظام زمانہ کی سکونت میں خلل انداز ہوتے ہیں، جس سے دنیا کی متوازی خوبصورتی کے زائل ہونے کا خدشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ نظام کائنات کے توازن کے قیام میں مرد وزن دونوں کے کردار اپنی منفرد صلاحیتوں اور محدود دائروں کے ساتھ خود کی اہمیت کا مژدہ سناتے ہیں۔ مگر مرد حاوی معاشرے نے مخالف صنف کے ساتھ نابرابری کا رویہ برقرار رکھتے ہوئے اس توازن کی بحالی میں رخنہ پیدا کیا ہے۔ قدرتی قوانین اور فطرت زمانہ کے ساتھ کھلواڑ کر کے اپنی ہی رہائش گاہ کی بربادی کا خود ذمہ دار بن گیا ہے۔ تبھی جس نظام زمانہ کو اس کی آرام و سکون کے لیے متعین کیا گیا ہے آج وہیں سکون زندگی کے لیے بے چین طبیعت کے ساتھ تگ و دو میں مصروف ہے۔ ایسے نازیبا حالات روشن شعور کو یہ سوال اٹھانے پر مجبور کرتے ہیں:

انساں کی دنیا میں انساں ہے پریشاں کیوں
مچھلی تو نہیں ہوتی بے چین کبھی جل میں

چندر بھان خیال

خود کے ہی اعمال کے نتیجے اپنے ہی گھر میں انسان بھٹکتی روح کی طرح انجانے سمت میں بے چین و بے قرار سرگرداں نظر آتا ہے۔ اپنے ہی گھر کی چہار دیواری محافظ بننے کے بجائے اپنے مکین کو چاروں اطراف سے کچلنے پر آمادہ ہے۔ آیئے صدیوں کی تاریخ کا پنّہ پلٹ کر دیکھتے ہیں کہ ماضی کی وہ کون سی کریہہ شکل ہے جو آج کی روشن خیالی کا منہ چڑھا رہی ہے، جس کے نتیجے میں آج دُنیا کی آدھی آبادی کے وجود کی بحالی کے لیے روایتی قوانین میں تصرف کیا جا رہا ہے، جن کے روبرو یہ آدھی آبادی اپنی وجودی بقا کے لیے مسلسل تگ و دو میں لگی ہوئی ہے۔

ہندوستان میں عورت کا تصور اور مقام

"One of the best way to undersatand the spirit of appreciate its excellences and realise its limitatio the position and status of women in it."[1]

کسی ملک کے تمدن کو سمجھنا ہے اور اسکی خوبیوں کا پتہ لگانا ہے تو وہاں کی عورتوں کے حالات کا تاریخی مطالعہ کیا جانا چاہیے کیوں کہ اُن کے حالات اس عہد کی تہذیبی قدروں اور تمدنی معیار کا پتہ دیتے ہیں۔ دورِ قدیم سے ہندوستان ایک مشترکہ اور مخلوط تہذیب کی نمائندگی کرتا آرہا ہے۔ اس کے جمہوری نظام کا راز کثرت میں وحدت (Unity in Diversity) میں مضمر ہے۔ ہندوستان متعدد عقائد، مختلف مذاہب، بے شمار زبانیں، انگنت طرزِ زندگی، رنگ برنگی تہذیب کی نظیر ہے۔ قدیم ادوار سے دورِ حاضر تک متنوع قومی تہذیب میں توازن قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ یہاں کے عوام میں اتحاد برقرار رکھنے میں ہندوستان اپنی مثال آپ ہے، لیکن جس وقت یہاں کی عورتوں کے حالات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو چاند کی طرح روشن ماضی میں کالے دھبوں کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے، جو عورت کے دلدوز داستان کی عکاسی کرتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ (دورِ قدیم سے لے کر عصر حاضر تک) کے مطالعے سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ مختلف عہد میں عورت کے حالات نشیب و فراز سے دوچار ہوتے رہے ہیں۔

عورت کے تاریخی مطالعے کے دوران اسکالر کے لیے پریشانیاں تب لاحق ہوجاتی ہیں جب ایک ہی عہد اور علاقے کے محفوظ شدہ دستاویز میں اختلاف رائے کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جہاں ایک اسکول کے مطابق عورت مرد کے لیے خدا کا بہترین تحفہ ہے، دوسرے اسکول کے ماننے والے اس پر یقین رکھتے ہیں کہ اگر خدا کو حاصل کرنا ہے تو عورت کی محبت سے دور رہنا چاہیے۔ Agastya رشی کے مطابق:

"Women combine the fickleness of the lightning the s and the swiftness of the eagle."

A. S. Altekar کہتے ہیں:

"To ascertain the position of women in Hindu society position, under different circumstances like normal abnormal i.e. in war time. Because during wars, the towards women was very un sympathetic, particularly misfortune of falling into the hand of the enemies. T get re-admitted in to thier family and society."[2]

مگر قدیم ادب کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جنگی اوقات کے علاوہ امن کے دور میں بھی عورتوں کے حالات کچھ اطمینان بخش نہیں تھے۔ انہیں شودر کی طرح سب سے نچلے طبقے میں رکھا گیا تھا۔ ان کی قتل کوئی شرمناک حرکت نہیں مانی جاتی تھی۔ البتہ ہندوستان کی تہذیبی تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ نظریاتی طور پر عورت کو دیوی (Goddess) کا درجہ دیا گیا تھا جیسا کہ ہندوؤں کے مختلف مقدس کتابوں سے اس بات کا بیان ملتا ہے۔ انہی مقدس کتابوں میں بیوی کو اردھانگنی (Better Half) کہہ کر متعارف کرایا گیا ہے جس کا مطلب عورت اور مرد دونوں برابر کے حقدار ہیں، دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے سے برتر

نہیں ہے۔ مگر غیر مہذب اور وحشی طریقوں کے عروج نے عورت کو ماتحتی کے درجے پر لا کھڑا کر دیا جہاں مرد کی تابعداری اس کا فرض عین قرار پائی۔ خاندان، سماج، مذہب، سیاست غرض کہ زندگی کے ہر شعبے میں عورت بہ نسبت مرد کے نہایت ہی کمتر درجے کی اہل رہی۔ عصر حاضر میں بھی یہ اکثر و بیشتر گھروں کی پر درد کہانی ہے کہ شادی شدہ زندگی وہ اپنے خاوند کی ملکیت میں گزارتی ہے۔ خاوند کی وفات کے بعد بچوں کی نگرانی میں اس کی زندگی گزر جاتی ہے جہاں اس کی اپنی کوئی چاہت ہوتی ہے نہ کوئی خواہش۔ ہندوستانی عورت کے حالات ہی سیمون دی بوا (Simon de Beauvoir) کے اس تاریخی جملے کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ "Women are not born but made."

ہندوستان میں عورت کے کردار اور حالات کے نشیب و فراز کی تصویر کشی کے لیے متذکرہ عہد کو درج ذیل پانچ ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے:

1۔ ویدک عہد (Vedic Period) 2500 تا 1500 قبل مسیح

2۔ مابعد ویدک عہد (Post Vedic Period) 1500 قبل مسیح تا 1000ء

3۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد کا دور (Muslim Period) 1000ء تا 1800ء

4۔ برطانیہ عہد (British Period) 1800ء تا 1947ء

5۔ عصری عہد (Contemporary Period) 1947ء کے بعد

ویدک عہد (Vedic Period)

ہندوستان کا قدیم ویدک دور عورت کے لیے بہ نسبت دوسرے ادوار کے نہایت ہی شاندار تھا۔ زندگی کے ہر میدان میں وہ آزاد تھی۔ بقول A. S. Altekar:

> "The position, which women occupied in Hindu socie
> civilization during the Vedic period is much better
> expect it to have been......Even befor the Aryans c
> 2000B.C. there is evidence to believe that Indian
> responsible position with men and played an importa
> definite culture and tradition. There status excelled
> civilizations of ancient Greece, Rome and even early

اس عہد کی تاریخی شواہد میں عورت کی اہمیت کا پتہ اس حد تک چلتا ہے کہ عورت کی ذرہ برابر تذلیل کے سبب بڑی بڑی سلطنتیں، حکمرانوں کی حکومتیں تاراج ہو گئیں۔ پانڈیان (pandyan) کا دارالحکومت صرف اس بنا پر جلا دیا گیا تھا کہ پانڈیان کے حکمران Nedunchezhiyan نے ایک عورت کے شوہر کا غلطی سے قتل کر دیا تھا۔ مہابھارت کی کہانی یہ کہتی ہے کہ کوروں (Kauravas) کی تباہی کا سبب یہ تھا کہ کوروں نے بھرے دربار میں دروپدی (Draupadi) کے جسم کو برہنہ کر کے اس کی بے عزتی کی تھی۔ رامائن میں راون کی تباہی کی وجہ یہ دکھائی گئی ہے کہ اس نے سیتا کو اغوا کر کے اس سے زبردستی شادی کرنی چاہی۔

اس عہد کے معاشرے میں عورت کی اہمیت کا پتہ ویدوں کے مطالعے سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ رگ وید کے کسی بھی حمد (Hymns) میں لڑکی کی پیدائش کو نحس نہیں مانا گیا ہے لیکن اتھروید (Atharva) میں ایسی دعائیں ملتی ہیں جو لڑکے کی پیدائش کے متعلق ہیں۔ مثلاً

"The birth of a girl, gran where, have gr

ویدک عہد میں ایک رسم یہ کیا جاتا تھا کہ چند والدین دوسری چاندرات میں کنیا شری (Kanyasr) نام کی پوجا کرتے تھے جس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ خدا انہیں ذہین اور لائق و فائق بیٹی سے نوازے۔ اس کے علاوہ رگ وید میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ویدک رسموں کی ابتدا ماتریکا پوجا (Matri) سے اور خاتمہ کماری پوجا (Kumar) سے ہونی چاہیے۔

اس عہد میں لڑکیوں کو لڑکوں کی طرح تعلیم دی جاتی تھی۔وہ بھی لڑکوں کی طرح مقدس دھاگا یعنی جنیئی (Upavitadhaaranaa) تقریب کے بعد عورتیں وید پڑھنا شروع Upav پہنتی تھیں اور برہم چاریہ یعنی طالبہ کہلاتی تھیں۔ کرتی تھیں، وید کے منتروں کو یاد کرنا، ویدک عقائد اور رسموں کو نبھانا اس کے علاوہ Yagay پوجا کے لیے جتنی ضروری رسمیں ہوتی تھیں، سب کا مطالعہ لڑکوں کی طرح کرتی تھیں۔ان کی تعلیم گوروکل میں ہوتی تھی جہاں وہ اچاریہ کے ساتھ رہ کر اپنے مرد بھائیوں کے ہمراہ تعلیم حاصل کرتی تھیں۔اتھروویدسنہتا کے مطابق ایک اچھی زندگی گزارنے کے لیے عورتوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ڈاکٹر محمد شہزاد شمس لکھتے ہیں:

''اس عہد میں تعلیم یافتہ عورتوں کا دو طبقہ ملتا ہے۔۔۔۔۔اول سدیودواہاس یعنی وہ عورتیں جو اپنی پڑھائی شادی کے بعد بھی جاری رکھتی ہیں۔دوم برہمو یدنی یعنی وہ عورتیں جو شادی نہیں کرتیں اور اپنی پوری زندگی تعلیم حاصل کرنے میں وقف کر دیتی ہیں،ایسی عورتوں میں گارگی، واچکنوی، واڈواپراتیتھیی، سکھامیتری اہم ہیں۔دیگر عورتوں میں گھوشا' گودھا' شوارااور اپالا ہیں جن کا ذکر رگ وید میں موجود ہے۔''4

عہدِ رگ وید کی خواتین، شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفی (Deba بحاث) اور معلّمہ بھی ہیں۔سرونوکرامنیکا (Sarvanukramanika) کے مطابق ایسی خواتین جنھوں نے رگ وید کے متعدد حمد (Hym) لکھے ہیں، ان کی تعداد بیس سے بھی زیادہ ہے۔ان میں سے بہت ساری شاعرہ بھی ہیں جن کی نظموں کو ویدوں میں شامل کیے جانے کا فخر حاصل ہے۔ کچھ ایسے اونچے طبقے کی خواتین بھی ہیں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ دانشوارانہ اور فلسفیانہ بحث ومباحثے میں حصہ لیتی تھیں۔ان میں گھوسا، اپالا، لوپامدرا، اندرانی، میتری اور گارگی بہت مشہور ہیں۔گارگی اپنے وقت کی بہت بڑی ویدک اسکالر تھی۔اس عہد میں فلسفیوں کی ایک کانفرنس جو اپنی نوعیت کی پہلی کانفرنس تھی ودیہا (Vide) کے راجا رسی جنک (jana) کے یہاں ہوئی تھی۔اس کانفرنس کے مباحثوں میں گارگی نے بھی حصہ لیا تھا اور تقریریں کی تھیں۔اس نے Yajnavalkya کو چیلنج کیا تھا اور اس سے دقیق اور پیچیدہ سوال پوچھے تھے۔اس کا سوال تھا:

"The layer that is above the sky and below the earth being situated between the earth and the sky and whi symbol of the past, present, and future, where is tha

A. S. Altekar کے مطابق:

"The topic of her inquiry were so abstrous and esot Yajnavalkya declined to discuss them in public."[5]

اس کے علاوہ بھی بہت ساری ایسی خواتین کا پتہ چلتا ہے جنہوں نے معلّمی، طب، تجارت، زراعت، فوج اور سیاست میں بھی مردوں کے شانہ بشانہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔پردے کا کوئی رواج نہیں تھا۔عرب سیاح ابوزید لکھتے ہیں:

''عورتیں غیر ملکیوں کے سامنے آتی جاتی ہیں اور مردوں کے دوش بدوش تفریحی جلسوں میں شرکت کرتی ہیں۔ہندوستان کے اکثر راجہ جب دربار کرتے ہیں تو اپنی عورتوں کو اپنے پاس بلا لیتے ہیں، اس طرح کے تمام دربار کے لوگ، ملکی ہوں یا غیر ملکی، انہیں دیکھ سکتے ہیں۔وہ اپنا چہرہ نقاب وغیرہ سے نہیں ڈھکتیں۔''6

ویدک دور میں خواتین کسی کی تابع نہیں تھیں۔شادی کے معاملے میں انہیں پورا اختیار تھا۔اتھروید کے مطابق:

"The happy and beautiful bride choose (vanute) by her husband."RV(27.12)

"The creator sustains the earth, heavens and sun; May of her choice for this lady;"AV(6.60.3)

اتھرووید اور رگ وید کے ان اقوال سے ہمیں صاف پتہ چلتا ہے کہ شادی کے لیے ان پر کوئی پابندیاں نہیں تھیں۔وہ

چاہیں تو مجرد رہ کر برہمہ چاریہ کی زندگی بھی گزار سکتی تھیں۔لڑکیوں کی شادی 14 سے 17 سال تک کے درمیان میں کی جاتی تھی،اس عہد میں سنِ بلوغ کے پہلے کی شادی نہیں ملتی ہے۔چونکہ شادی لڑکیوں کی مرضی سے ہو رہی تھی اس لیے اس عہد میں ایک رسم کا بھی پتہ چلتا ہے جسے سوئم ور (Swayamvara) کہا جاتا تھا۔ابتداء میں اس قسم کی شادی صرف چھتری خاندانوں تک محدود تھی۔اس میں تمام امیدوار کو کسی ایک جگہ جمع کر لیا جاتا تھا اور وہاں دلہن اپنی مرضی سے یا کسی مقابلے کے تحت فاتح کو اپنا دلہا چنتی تھی۔مہابھارت اور رامائن سے پتہ چلتا ہے کہ دروپدی جی اور سیتا جی دونوں کی شادیاں اسی طریقے کے تحت عمل میں لائی گئی تھیں۔سید سخی حسن نقوی لکھتے ہیں:

> ''سکندرِ اعظم کے فوجی افسر نیئرکس نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے لوگ جہیز لیے اور دیے بغیر شادیاں کرتے ہیں۔لیکن جب لڑکیاں شادی کے لائق ہو جاتی ہیں تو ان کے والدین انہیں منظرِ عام پر لاتے ہیں جہاں کشتی،گھونسے بازی،دوڑ یا جسمانی طاقت کے مقابلے ہوتے ہیں۔ان مقابلوں میں جیتنے والوں کے ساتھ لڑکی کی شادی کر دی جاتی ہے۔نیئرکس نے غالباً 'سوئم ور' کی رسم کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں اس وقت تک تھوڑی بہت ترمیم کر لی گئی تھی۔''[7]

اس عہد میں منو قانون کے مطابق عام طور پر شادیاں آٹھ قسم کی ہوتی تھیں:

1۔ برھما (Brahma):جس میں باپ اپنی بیٹی کو زیور سے آراستہ کر کے کسی نیک اور شریف عالم سے اس کی شادی کرواتا تھا۔

2۔ دیوا (Daiva):اس قسم کی شادی میں باپ اپنی بیٹی کو جواہرات سے سجا کر کسی پروہت سے اس کی شادی کرواتا تھا اور شادی کے درمیان قربانی کی رسم کی بھی ادائیگی ہوتی تھی۔

3۔ آرش (Arsha):جس میں باپ اپنی بیٹی کے عوض لڑکے سے ایک گائے اور ایک بیل یا دو گائیں یا دو بیلیں حاصل کرتا تھا پھر اپنی بیٹی کی شادی اس نوجوان سے کرواتا تھا۔

4۔ پرجاپتیہ (Prajapatya):جس میں باپ اپنی بیٹی کی شادی یہ منتر پڑھنے کے بعد کرتا تھا کہ:''تم دونوں دھرم کے مطابق اپنے فرائض انجام دو۔''

5۔ آسُر (Asura):جس میں دلہا اپنی حیثیت کے مطابق دلہن کے والدین کو دولت دے کر ان کی لڑکی سے شادی کر لیتا

6۔ گاندھروا (Gandharva):لڑکے اور لڑکی میں محبت ہونے کے بعد آپسی رضامندی سے وہ ایک دوسرے سے شادی کر لیتے تھے۔

7۔ راکشس (Rakshasa):جس میں کوئی شخص کسی لڑکی کو اس کے گھر سے زبردستی اغوا کر کے شادی کر لیتا تھا۔

8۔ پیشاچ (paisacha):جس میں کوئی شخص خفیہ طور پر کسی لڑکی کو سوتے ہوئے،نشے کی حالت میں جسمانی تعلق بنانے کے بعد شادی کرتا تھا۔ان میں آسُر اور پیشاچ طریقوں کو معیوب مانا جاتا تھا۔راکشس،پیشاچ اور گاندھرو طریقے چھتری طبقے میں رائج تھے۔آسُر طریقہ ویشیوں اور شودروں کے یہاں رائج تھا۔اور برہمہ طریقہ صرف برہمن طبقے کے لیے مخصوص تھا۔ان میں برہمہ اور پرجاپتیہ طریقے آج بھی ہندو سماج میں رائج ہیں۔

کسی وجہ سے اگر لڑکی کی شادی نہیں ہو پاتی تو وہ اپنے والد کی حفاظت میں رہتی تھی۔والد کی وفات کے بعد اپنے بھائی کے اختیار اور حفاظت میں زندگی گزارتی تھی۔اس کے باوجود ویدک عہد کی لڑکیاں زیادہ تر خود مختار ہوتی تھیں۔بیواؤں کو شادی کی کوئی ممانعت نہیں تھی۔انہیں دوسری شادی کا اختیار حاصل تھا۔اتھروید میں بیواؤں کی شادی کے لیے 'پونربھو' (دوبارہ پیدا ہوئی) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔رگ وید میں ایک لفظ پرا پوروا (Parapurva) ایسی عورت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس کا دوسرا شوہر ہو۔ایک لفظ دِدھِشو (Didhishu) بھی مستعمل ہے جس کا مطلب ہے 'ایک عورت کا دوسرا

شوہر'۔اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ویدک دور میں بیواؤں کی شادی کی مخالفت نہیں کی جاتی تھی۔اتھر وویداور رگ وید کے مطابق شوہر کے مرتے ہی شمشان گھاٹ پر ہی اس کا بھائی اس بیوہ کو اپنی بیوی کے طور پر قبول کر لیتا تھا۔ویدک عہد میں ستی کا کوئی رواج نہیں تھا۔

اس عہد میں وراثت کا قانون دوسرے ملکوں سے بالکل مختلف تھا۔بیٹیاں باپ کی جائداد سے محروم تھیں۔مگر مجرد لڑکیاں جو باپ کے گھر پر ہی رہتی تھیں باپ کی جائداد میں سے انہیں حق ملتا تھا۔لیکن رگ وید میں باضابطہ یہ درج ہے کہ وہ بھائی کی جائداد میں حصہ داری کا دعویٰ نہیں کرسکتی تھیں۔رگ وید کے مطابق:

"A son born of the body does not transfer wealth to s

شادی شدہ لڑکیاں اپنے بھائیوں کی عدم موجودگی میں ہی اپنے باپ کی وراثت میں حق حاصل کرسکتی تھیں۔لڑکیوں کو شادی کے وقت جو سامان، زیور، لباس وغیرہ ''استری دھن'' کی شکل میں ملتے تھے، اس پر صرف اس لڑکی کا ہی حق ہوتا تھا۔اس کے مرنے کے بعد اس کی بیٹوں میں وہ تقسیم ہو جاتا تھا۔لیکن اگر وہ چاہتی تو اس ''استری دھن'' کو اپنی مرضی سے اپنے شوہر کو دے سکتی تھی۔اور ایک رقم جو اس کو اپنے شوہر سے ملتی تھی یہ وہ رقم ہوتی تھی جو شوہر اپنی دوسری شادی کے موقع پر اسے ادا کرتا تھا۔

شاہی خاندانوں میں کثرِ ازدواج (polygamy) کا رواج کہیں کہیں دیکھنے میں ملتا ہے لیکن عام طور پر ایک زوجگی (monogamy) کو ہی زیادہ ترجیح دی جاتی تھی۔ڈاکٹر محمد شہزاد شمس لکھتے ہیں:

''تعدادِ ازدواج کا ذکر رگ وید میں ملتا ہے۔رگ وید (1 - 108) میں اس کا بھی ذکر ہے کہ ایسی صورت میں بیویوں میں جھگڑے ہوتے تھے اور شوہر کو اپنا بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش ہوتی۔سنسکرت ادب میں چند شوئی (Polyandry۔ایک عورت کئی شوہر) کا ذکر ملتا ہے۔اس کے مطابق کماؤں (Kumaon) میں برہمن کے ساتھ ساتھ راجپوت اور شودروں میں بھی اس کا چلن تھا کہ سبھی بھائی ایک ہی عورت سے شادی کرتے تھے۔دوسری طرف ویدک عہد کی تیتریا سمہتا (Taittiriya Samhita) اور ایتریہ براہمنا (Aitareya Brahmana) میں ذکر ہے کہ اس وقت ایک مرد کئی بیویاں تو رکھتا تھا، لیکن ایک عورت کئی شوہر نہیں رکھتی تھی۔اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تعدادِ ازدواج کا رواج رگ وید میں تو تھا ہی، ساتھ ہی ساتھ چند شوئی کے رواج کا بھی ذکر ملتا ہے۔8

ویدک سماج پدری نظام کی پیروی کرتا تھا۔خاندان کے سب سے بڑے بزرگ کی ماتحتی میں اہل خاندان رہتے تھے۔اس کی بیوی تاحیات اپنے شوہر کی فرمانبرداری کے ساتھ ساتھ اپنی ساری ذمہ داریاں نبھاتی تھی۔ویدک عہد میں شادی نہایت ضروری خیال کی جاتی تھی اور یہ مانا تھا کہ بنا شادی کے جنت نہیں مل سکتی۔اس عہد کی عورتوں کو یہ حق حاصل تھا کہ سہہ دھرمنی یا پتنی (patni Sahadharmini) بننے کے بعد اپنے خاوند کے ساتھ ہر مذہبی رسوم میں شامل ہوسکتی ہیں اور کبھی انفرادی طور پر بھی اس حق کا استعمال کرسکتی ہیں اور قربانیاں بھی پیش کرسکتی ہیں۔خاندان میں اس کا مقام معتبر مانا جاتا تھا۔مختلف رشیوں کے مطابق اسے گھر کا زیور مانا جاتا تھا۔دھرم شاستر (Dharmashastra) میں ایک نیک بیوی کو دیوی کا درجہ دیا جاتا تھا۔پنچ تنتر (Panchatantra) میں یہ درج ہے کہ ایک مہذب اور متمدن خاندان اس گھر میں عورت کی موجودگی کو ثابت کرتا ہے۔عورت کی غیر موجودگی گھر کو اداس جنگل میں منتقل کر دیتی ہے۔اس لیے رگ وید باپ کی بہ نسبت ایک ماں کے اعلیٰ مرتبے کی وکالت کرتا ہے۔نتیجتاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ویدک عہد میں عورت کا مرتبہ نہایت ہی بلند تھا۔خاندان اور معاشرے میں ایک عورت بیٹی، بہن، بیوی اور ماں کی حیثیت سے بہت معزز مانی جاتی تھی۔زندگی کے ہر شعبے میں مرد کے برابر درجے اور کبھی کبھی اس سے بھی اعلیٰ حیثیت کے مرتبے کی حامل تھی۔

مابعد ویدک دور (Post Ved od)

ویدک عہد کے بعد سے ہی عورت کی حیثیت کے انحطاط کا آغاز ہوتا ہے۔اس کی سماجی حیثیت کم سے کم تر ہوتی چلی جاتی ہے۔تعلیم کے میدان میں عورت کی عدم موجودگی ہی اس کی سب سے بڑی وجہ ہے۔لڑکیوں کو باہر جا کر تعلیم حاصل کرنے پر روک لگادی گئی تھی۔وہ گھر پر ہی اپنے باپ، بھائی یا کسی قریبی رشتہ دار سے ہی تعلیم حاصل کر سکتی تھیں۔نتیجتاً صرف دولتمند اور معزز خاندان کی لڑکیاں ہی مذہبی اور دیگر تعلیم حاصل کر پاتی تھیں۔کیوں کہ اس دور میں چونکہ سماج میں برنوں کا طریقہ رائج ہو چکا تھا اس لیے نچلا طبقہ یعنی شودروں کے لیے ویدوں کی تعلیم حاصل کرنا مذہبی اعتبار سے معیوب سمجھا جاتا تھا۔چند ایسی خواتین کا ذکر بھی ملتا ہے جنہوں نے اچاریہ کے یہاں رہ کر ہی تعلیم حاصل کی تھی۔انہیں چھتری شالا کہا جاتا تھا۔مگر عام طور پر عورتوں کے لیے شودروں کی طرح مقدس کتابوں کو پڑھنا تو دور اسے چھونا بھی ممنوع قرار دیا گیا تھا۔لوگ رفتہ رفتہ اسی توہمات کا شکار ہو گئے کہ اگر کسی عورت نے قلم پکڑ لیا یا کتاب چھو لی تو اس کے خاندان پر مصیبت نازل ہو جائے گی۔

جہاں تک بیٹیوں کا سوال ہے اس کی پیدائش کے تصور سے ہی لوگ کانپ جایا کرتے تھے۔مگر بیٹے کا استقبال بڑی خوش دلی سے کیا جاتا تھا کہ وہ ان کی مستقبل کا میراث تھا۔ A. S. A کے مطابق:

> "In ancient times in all patriarchal soceities the bi
> unwelcome event. Almost everywhere the son was valu
> daughter. He was a permanent economc asset of the fa
> aged parents and didnot like the daughter to anoth
> marriage. He perpetuated the name of his father's fa

لڑکیوں کی شادی سولہ سال کے درمیان ہی کردی جاتی تھی۔گوتم سنہیتا کے مطابق:

> "A girl should be given in marriage before she att
> neglects it, commits sin."

کچھ دیگر بیانات اور وسشٹھ سنہیتا (Vasistha) میں یہ بھی آتا ہے کہ:

> "A girl should be given in marriage before she wears

اس عہد میں بیٹی کے حق وراثت میں بھی تھوڑی سی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔بیٹی کو باپ کی جائداد میں حق ایک ہی شرط میں مل سکتا تھا اگر وہ بیوہ ہو یا بیٹے، پوتے یا پڑپوتے میں کوئی خرابی واقع ہو گئی ہو۔لیکن عام طور سے اسے باپ کی جائداد کا ایک چوتھائی حصہ ملتا تھا۔منو کے قانون میں بھی لڑکی کا حصہ بھائی کے حصے کا چوتھائی مقرر کیا گیا تھا جو شادی سے پہلے اس کی پرورش اور جہیز کے انتظام میں خرچ کیا جاتا تھا۔لیکن شادی کے بعد باپ کی جائداد میں اور اس کا کوئی حق نہیں ہوتا تھا۔بیوہ کے ساتھ یہ رعایت برتی جاتی تھی کہ مرنے والے کی جائیداد کے وارث اس کے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کا سامان مہیا کرتے تھے۔اور اگر مرنے والے کا کوئی وارث نہ ہوتا تو اس صورت میں اس کی بیوہ ہی اس کے مال و جائیداد کی مالک ہوتی۔مگر متاکشرا (Mitakshara) قانون کے مطابق بیوی اپنی مرضی سے شوہر کی جائداد میں حصہ داری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی۔یہ تبھی ممکن ہو سکتا تھا جب شوہر اپنی مرضی یا بیٹوں کے طلب کرنے پر اپنی جائیداد تقسیم کرتا۔اس صورت میں اسے بیٹوں کے برابر حق ملنے کا امکان رہتا تھا۔

اس عہد میں عورت کے حالات بڑے ہی خستہ تھے۔مختلف طرح کے مذہبی تقاریب میں اس کی شرکت ممنوع تھی۔اس کے فرائض چہار دیواری کے اندر گھریلو کاموں ہی تک محدود رہ گئے تھے۔خاتون چونکہ وید چھونے سے محروم کردی گئی تھی اس لیے مذہبی کتابوں پر مردوں کی اجارہ داری قائم ہو گئی تھی۔عوامی نشست اور کانفرنسوں میں حصہ لینے سے بھی محروم کردی گئی تھی۔اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ آریہ اور دراوڑ میں باہمی شادی (Inter) کے سبب غیر آریائی بیوی جو سنسکرت

زبان اور آریائی مذہبی رسم ورواج سے نا آشنا تھی، اپنے خاوند کے ساتھ مذہبی تقاریب میں حصہ لینے سے قاصر تھی۔ آریوں اور غیر آریوں کے درمیان بڑھتے ہوئے آپسی رشتے نے رفتہ رفتہ عورت کو پسماندگی کی سمت دھکیل دیا اور وہ ایسی گری کہ دنیا اس کی انسانیت کی منکر ہوگئی۔

اس عہد میں بیواؤں کے ساتھ بھی بڑا برا سلوک کیا جاتا تھا۔ وہ بیوگی کے بعد سے ایک سال تک لذیذ اور ذائقہ دار کھانا یہاں تک کے نمک کے استعمال سے بھی محروم کردی جاتی تھی۔ اگر اس کو بیٹا نہیں ہے تو بیوگی کے چھ ماہ بعد اپنے گُرو کی اجازت سے دیور کے ساتھ رشتہ قائم کر کے اس سے بیٹا حاصل کر سکتی تھی۔ مہابھارت میں درج ہے کہ اگر کوئی بچپن میں بیوہ ہو جائے تو دوبارہ شادی کر سکتی ہے۔ مگر آہستہ آہستہ سمرتی قانون سازوں کے ذریعہ بیوہ کی دوبارہ شادی پر بھی روک لگا دی گئی اور انہیں ایک ایسی دردناک زندگی گزارنے پر مجبور کیا جاتا تھا جس کے خوف سے ہی عورت خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ البتہ اس دور میں بھی ستی کا رواج عام نہیں ہوا تھا۔ مگر پنجاب کے جنگجو طبقوں میں اس کا رواج تھا۔ عورت کو ستی ہونے کے لیے زور نہیں دیا جاتا تھا۔ منو، یگیہ ولکیہ اور دوسرے قانون داں اس رسم کے بارے میں کچھ نہیں بولتے ہیں مگر وہ عورت جو ستی ہو جاتی تھی عوام کی نظروں میں معتبر سمجھی جاتی تھی اور جو ستی ہونے سے انکار کرتی تھی اسے ذلیل وخوار کیا جاتا تھا اس لیے اکثر عورتیں اس رسم کی ادائیگی کے لیے خود سے راضی ہو جاتی تھیں۔ اب اس کے بین السطور میں دو وجہ ہو سکتی ہیں ایک شوہر سے بے انتہا محبت اور دوسری وجہ بیوگی کی لعنت بھری زندگی سے چھٹکارا۔ بیواؤں کے متعلق منو کی رائے ملاحظہ ہو:

1- Untill her death, let her the patience of hardsh
and strive to fulfill that most axcellent duty which
have one husband only.

2- At her pleasure let her emaciate her body by liv
fruits, but she must never mention the name of ano
husband has died.

3- A virtous wife, Manu says again, is one, 'who at
constantly remains chaste reaches heaven though she
chast men.[11]

گویا ویدک عہد میں جو درجہ عورت کو حاصل تھا وہ رفتہ رفتہ مابعد ویدک عہد تک پہنچتے پہنچتے یکسر ختم ہونے کی کگار پر تھا۔ جب برہمن اور وپنشدوں کا دور آتا ہے تو عورت کی سماجی حیثیت کمتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ دور اس کے لیے مسلسل انحطاط کا دور تھا۔ اس دور کی مقدس کتابوں میں عورت کے مقام اور مرتبے کے بارے میں متضاد نظریے ملتے ہیں۔ جہاں ایک طرف اسے دیوی کا درجہ دیا جاتا ہے وہیں دوسری طرف اس کی حیثیت ایک غلام یا ایک شئے کی مانند بتائی جاتی ہے۔ اس قسم کا تضاد منوسمرتی، کوٹلیا کے ارتھ شاستر، رزمیہ نظموں وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ منو کا قانون ایک طرف یہ کہتا ہے کہ ''دیوتا ان گھروں سے خوش رہتے ہیں جن میں عورتوں کی عزت کی جاتی ہے اور اگر شوہر اپنی بے قصور بیوی کو خواہ مخواہ چھوڑ دے تو راجہ کو چاہیے اسے سزا دے''، لیکن دوسری طرف اس کا قانون یہ بھی کہتا ہے کہ شوہر کا اپنی بیوی پر پورا اختیار ہے۔ وہ چاہے تو اس کی غلطی پر اسے جسمانی سزا بھی دے سکتا ہے اور بیوی اگر اس کی خلاف ورزی کرے تو شوہر اسے چھوڑ سکتا ہے۔ شوہر جیسا بھی کیوں نہ رہے، کتنی ہی برائیاں اس کے اندر کیوں نہ پائی جائیں بیوی پر لازم ہے کہ وہ اپنے شوہر کی پوجا دیوتاؤں کی طرح کرے۔ شوہر کی زندگی میں اور اس کے مرنے کے بعد بھی بیوی کو پاکباز اور اس کے تئیں وفادار رہنا چاہیے۔ مگر خاوند کے لیے یہ حکم تھا کہ بیوی کے مرنے کے بعد وہ دوسری شادی کر سکتا ہے۔

اسی طرح رزمیہ نظموں (تقریباً 0 0 1 ق۔م) میں بھی عورت کے تئیں متضاد نظریے ملتے ہیں۔ رزمیہ نظموں کے چند اشعار میں اسے متلوّن، مفسد، بے وفا اور زہر کا اصلی برتن، جیسے منفی الفاظ سے مخاطب کیا گیا ہے جہاں اس کی حیثیت مرد کی

ماتحتی میں نہایت ہی پست ہو جاتی ہے۔اس کے برخلاف رزمیہ نظموں کے دوسرے اشعار گھر اور خاندان کے لیے اس کی اہمیت کو سراہتے نظر آتے ہیں۔شوہر کے لیے اسے اردھانگنی قرار دیا جاتا ہے۔اس کا وجود گھر کے لیے باعث برکت مانا جاتا ہے۔ایک نیک اور وفا شعار بیوی شوہر کے لیے باعث فخر ہوتی ہے اور شوہر کی تمام تر توجہ اور احترام کی مستحق قرار پاتی ہے۔ایک ماں کی حیثیت سے وہ دس باپوں سے زیادہ عظمت والی مانی جاتی ہے۔

کوٹلیہ کی ارتھ شاستر میں شادی اور عورتوں کی قانونی حیثیت کے بارے میں جو باب ہے اس کی ابتداء اس قول سے ہوتی ہے کہ ''شادی بیاہ ہر فساد کی جڑ ہے۔''اس میں ایک عورت کو اس بات کی آزادی دی گئی ہے کہ اگر اس کا شوہر بدچلن ہے یا اسے پردیس گئے عرصہ ہو گیا ہے یا اس نے راجہ سے غداری کی ہے یا وہ بیوی کا جانی دشمن ہو گیا ہے یا اپنی ذات سے گر گیا ہے یا از کار رفتہ ہو گیا ہے تو بیوی اسے چھوڑ سکتی ہے۔باقاعدہ طور پر ارتھ شاستر طلاق کی بھی تائید کرتا ہے۔شوہر بیوی میں اگر نا اتفاقی پیدا ہو جائے تو دونوں کی باہمی رضامندی سے طلاق واقع ہو سکتی ہے۔اس ضمن میں دونوں کو برابری کا درجہ دیا گیا ہے۔نارد سمرتی میں بھی عورت کے ساتھ کچھ حد تک رعایت برتی گئی ہے۔نارد سمرتی کے مطابق:''اگر کوئی شخص ایسی بیوی کو چھوڑ دیتا ہے جو مطیع وفرمابردار،خوش کلام،ذہین وطباع اور نیک سیرت ہے تو راجہ کو چاہیے اسے سخت سزا دے۔۔۔۔اگر کوئی بے عیب عورت کسی ایسے مرد کو بیاہ دی جائے جس میں کوئی نقص ہو اور اس کا علم بیاہ سے پہلے نہ ہو تو عورت کو اختیار ہے کہ نہ صرف اس مرد کو چھوڑ دے بلکہ دوسرے مرد سے شادی کر لے اور اس کے رشتہ داروں کو اس سلسلے میں اس کی مدد کرنی چاہیے۔''اگر عورت بانجھ ہے یا صرف لڑکی پیدا کرتی ہے تو اس کے شوہر کے لیے نارد سمرتی میں حکم ہے کہ وہ اس سے کبھی محبت نہ کرے۔بُری عورت کے لیے بھی کہا گیا ہے کہ اگر وہ فضول خرچ ہے،اسقاطِ حمل کراتی ہے،شوہر کی جانی دشمن ہے،کسی دوسرے مرد سے ناجائز تعلق رکھتی ہے،بدزبانی کرتی ہے یا شوہر کو نہیں مانتی ہے تو شوہر کو چاہیے کہ اسے چھوڑ دے۔[2] [1]

گوتم بدھ کے زمانے میں عورتوں پر کسی قسم کی پابندیاں نہیں تھیں۔مگر کسی عورت کو گھر بار چھوڑ کر بھکشنی بننے کی دعوت نہیں دی گئی۔اسکے باوجود کہ عورتوں نے اس دھرم کو زیادہ سے زیادہ قبول کیا مگر ان کے لیے قواعد زیادہ سخت تھے اور ہر لحاظ سے ان کی حیثیت مردوں سے کم تھی۔انفرادی طور پر مذہبی دورہ کرنا یا اکیلے رہنے کی انہیں اجازت نہیں تھی۔محمد مجیب گوتم بدھ سے ان کے چیلے آنند کا مکالمہ نقل کرتے ہیں:

''حضور،عورتوں کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے؟''
''اس طرح،آنند،کہ جیسے تم انہیں دیکھتے ہی نہیں۔''
''اور اگر ہم انہیں دیکھ لیں تو کیا کرنا چاہیے؟''
''ان سے باتیں نہ کرو۔''
''لیکن حضور،وہ خود ہم سے باتیں کریں تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''
''تب،آنند،ہوشیار رہو۔''[3] [1]

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ گوتم بدھ،عورت کے وجود کو مرد کے لیے مضر خیال کرتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے اس کے سائے سے بھی بچنا چاہیے۔مگر ایک جگہ اس کا ذکر ملتا ہے کہ اپنے زمانے کی مشہور بیسوا امباپالی،جس پر پنچایت کا یہ فیصلہ صادر ہوا تھا کہ چونکہ وہ ہیرا ہے اس لیے اسے کسی ایک مرد سے شادی نہیں کرنی ہے بلکہ اسے چاہیے کہ پنچایت کی ملکیت میں آکر اپنے حسن وجمال سے پوری پنچایت کو محظوظ کرے اور پنچایت کی مرضی سے اس نے اپنے آپ کو بیسوا بنا لیا تھا،اس نے ایک بار گوتم بدھ کی مجلس میں حاضر ہو کر انہیں اپنے گھر مدعو کیا تھا اور بدھ نے دیگر اہم دعوتوں کو چھوڑ کر اس کی دعوت قبول کی تھی۔

وہیں اگر مہابھارت کا ذکر کریں تو ایک عورت 'دروپدی' کی تذلیل کا بدلہ پانڈو نے کورو کو تباہ کر کے لیا اور مہابھارت میں عورت کو نہ صرف یہ کہ خاندان کا مرکز مانا گیا ہے بلکہ اسے پوری سماجی تہذیب کی بنیاد بتایا گیا ہے جس پر ملک کا مستقبل منحصر

ہے۔ وہیں عورت کو تریا چرتر ثابت کرتے ہوئے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''اگر کسی کی سوزبانیں ہوں اور وہ ایک سو برس تک مسلسل بیان کرتا رہے تب بھی عورتوں کی برائیوں اور عیبوں کو مکمل طور پر بیان نہیں کرسکتا۔'' چونکہ اس کا وجود تباہی اور بربادی کا منبع ہے اس لیے مرد کو چاہیے اس سے اسی طرح دوری اختیار کرے جس طرح وہ خطرناک جراثیم سے بھاگتا ہے۔

اس طرح قدیم مقدس دستاویزوں میں عورت کے تئیں متضاد آراء ملتے ہیں۔ مگر عام طور پر دیکھا جائے تو اس عہد میں عورت کے سماجی حالات نہایت ہی پست تھے۔ منو اسمرتی قوانین کے مطابق اسے تعلیم حاصل کرنے میں پابندی لگا دی گئی۔ اپانینا (Upana) تقریب کا سلسلہ پوری طرح ختم کر دیا گیا۔ منو نے لڑکیوں کو جنیئو (مقدس دھاگہ) پہننے پر پابندی لگا دی۔ اب صرف یہ لڑکوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ منو کے قانون میں اس کو سماج میں وہی درجہ عطا کیا گیا جو شودر کا تھا۔ قتل کے معاملے میں دونوں کے لیے ایک سزا مقرر کی گئی تھی۔ اس کے مطابق عورت کو کبھی آزاد نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اسے چاہیے کہ وہ بچپن میں باپ، جوانی میں شوہر اور بڑھاپے میں بیٹوں کی ماتحتی میں رہے۔ اس کی شادی کی عمر آٹھ سال مقرر کر دی گئی۔ اور سخت پابندی عائد کر دی گئی کہ اگر لڑکی کی شادی آٹھ سال کی عمر تک نہ کی جائے تو اس کے والدین گناہ میں گرفتار ہو جائیں گے۔ صرف کشتریہ (Ksht) خاندانوں میں لڑکی کی شادی 14 سے 15 سال کی عمر میں کرنے کا رواج تھا۔ اس وقت عوام منو کے قوانین کو خدا کا حکم مانتے تھے۔ اس لیے کہیں چوں چرا کا سوال ہی نہیں تھا۔ ڈاکٹر محمد شہزاد شمس عورت ذات کے لیے منو کا نظریہ نقل کر رہے ہیں:

> ''عورت دنیا میں مرد کو ورغلاتی ہے۔ اس لیے کوئی بھی شخص اس کی صحبت میں رہ کر محفوظ نہیں رہ سکتا۔۔۔ عورت کو اپنے بستر، گھر، زیورات، ناپاک خواہشات، غصہ، بے ایمانی، کینہ پرور اور بداطواری سے ہی محبت ہوتی ہے۔ اسی لیے عورتوں کو مقدس کتابیں پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔'' 14

منو نے عورت کے متعلق یہ بھی کہا ہے کہ جھوٹ بولنا اس کی ذات میں مختص ہے۔ اس لیے وہ شوہر کو تعقید کرتا ہے کہ اگر بیوی غلطی کرے یا جھوٹ بولے تو اسے رسی سے باندھ کر ڈنڈے سے پیٹنا چاہیے۔ اس کے باوجود منو ماں کو ایک بلند مرتبہ عنایت کرتا ہے۔ ماں کے بارے میں اس نے یہ کہا ہے کہ وہ ہزار باپ سے بھی زیادہ سبقت رکھتی ہے۔ لیکن منو کے قانون نے بیواؤں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی۔ اس نے بیواؤں کی شادی پر روک لگا دی۔ خاوند کے حیات میں اور موت کے بعد بھی بیوی کو چاہیے کہ وہ اپنے شوہر کی اطاعت گزار رہے۔ اس کی موت کے بعد ایک پرہیز گار سنیاسن کی زندگی گزارے۔ اپنے آپ کو زندگی کی تمام سہولیات سے محروم رکھے۔ اپنا سر منڈوالے۔ یہاں کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اپنے آپ کو ایسا بنالے کہ کوئی مرد اسے دیکھنا بھی پسند نہ کرے۔

اس دور کا ایک اور بڑا اسکالر چانکیہ جس نے منو اسمرتی کو بہتر بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی اس نے بھی عورت کو حقیر ہی سمجھا اور اسے مرد سے کمتر گردانا۔ اس کی ذات کو ہلاکت کا باعث بتایا اور اس کے اتنے عیب گنوائے مثلاً جھوٹی، فریبی، بے وقوف، لالچی، ناپاک، بددماغ، بے رحم جیسے منفی صفات کو اس کے وجود کا آئینہ قرار دے کر اس کی شخصیت کو مسخ کر دیا۔ چانکیہ نیتی میں ایک جگہ لکھا ہے:

> ''آگ، پانی، جاہل مطلق، سانپ، خاندان شاہی اور عورت۔۔۔۔ یہ سب موجب ہلاکت ہیں۔ اس سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہیے۔'' 15

پوران کے دور میں کو بھی عورت کی مظلومیت کے اضافے کا دور کہا جا سکتا ہے۔ پوران کے مصنفین کے مطابق شوہر بیوی کے لیے خدا کا درجہ رکھتا ہے اس لیے بیوی کو چاہیے کہ شوہر کی پوجا اسی طرح کرے جیسا مرد بھگوان کی کرتا ہے۔ پوران میں اس کے لیے کہا گیا ہے:

''شراب کی تین قسمیں ہیں۔لیکن سب سے زیادہ نشہ آور عورت ہے۔اسی طرح زہر کی سات قسمیں ہیں۔لیکن سب سے زیادہ مہلک عورت ہے۔'' 6 1

پوران میں بھی لڑکی کی تعلیم پر پابندی عائد کر دی گئی۔بچپن کی شادی کی حمایت کی گئی اور شادی کی عمر چار سال قرار دی گئی۔بیواؤں کی دوسری شادی پر ضرب لگ گیا۔اور اسی دور میں ستی جیسے مذموم رواج کا چلن عام ہونے لگا۔اور آہستہ آہستہ یہ انسان کی سائیکی بن گئی کہ جس عورت کا شوہر مر جاتا ہے وہ سماج کے لیے منحوس ہو جاتی ہے اس لیے اسے مجبور کیا جاتا کہ شوہر کی جلتی چتا کے ساتھ اسے بھی نظرِ آتش ہو جانا چاہیے اور جو ستی ہو جاتی ہے اس کے سارے گناہ دھل جاتے ہیں اور وہ سنسار کے مایا جال سے نجات حاصل کر لیتی ہے۔اس کے درجات بلند ہو جاتے ہیں اور اسے دیوی مان لیا جاتا ہے۔مگر جو ستی ہونے سے انکار کر دیتی ہے مختلف قاعدے وقوانین کے زیر اثر اس کی زندگی کو اتنا پر درد بنا دیا جاتا کہ وہ ایسی زندگی سے موت کو ترجیح دیتی ہے۔اس لیے چند عورتیں ایسی بھی ملتی ہیں جو رضا کارانہ طور پر اپنے شوہر کی چتا کے ساتھ جل گئیں۔سید سخی حسن نقوی لکھتے ہیں:

''ڈی اوڈرس نامی ایک یونانی مصنف نے ایک ستی کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔ایک ہندوستانی فوجی سردار ایران میں جنگ کرتا ہوا مارا گیا (۳۱۶ ق۔م۔) تو اس کی دونوں بیویوں نے ستی ہونے کی خواہش کی۔یونانی افسروں نے بڑی بیوی کو جو حاملہ تھی ستی ہونے سے روک دیا اور چھوٹی بیوی کو اجازت دے دی۔ڈی اوڈرس لکھتا ہے۔''بڑی بیوی روتی ہوئی چلی گئی۔۔۔لیکن چھوٹی بیوی خوش خوش بڑے فاتحانہ انداز میں دلہن کی طرح بن ٹھن کر چتا پر چلی گئی۔وہاں پہنچ کر اس نے اپنے تمام بیش قیمت زیورات، انگوٹھیاں، ہار، مالائیں جن میں موتی اور ہیرے جڑے ہوئے تھے، اتار کر لوگوں میں تقسیم کیے۔اس کے بعد وہ اپنے شوہر کے برابر لیٹ گئی۔تمام فوج نے چتا کے چاروں طرف تین بار گردش کی اور جب شعلے بلند ہوئے تو اس کے منہ سے چیخ تک نہ نکلی اور اس نے چتا میں جل کر بڑی بہادری سے جان دے دی۔ایک بڑا مجمع اس عجیب منظر کو دیکھنے کے لیے موجود تھا۔سب لوگ اس عورت کی جرائت سے متاثر ہوئے لیکن بعض یونانیوں نے جو موقع پر موجود تھے اس رسم کو وحشیانہ اور خلافِ انسانیت قرار دیا۔'' 7 1

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بیوی کے نہ چاہتے ہوئے اسے زبردستی شوہر کی چتا میں جھونک دیا جاتا۔یہ بہیمانہ اور وحشیانہ رسم اس لیے بھی ادا کی جاتی تھی کہ شوہر کے بغیر بیوی بدکردار ہو سکتی ہے اور خاندان کی بدنامی کا باعث بن سکتی ہے۔اس کے علاوہ سمرتی لکھنے والے برہسپتی کے مطابق ایک مرد تب تک مکمل طور پر نہیں مرتا ہے جب تک اس کی بیوہ زندہ رہتی ہے۔اس مقصد سے کہ شوہر کو مرنے کے بعد مکتی مل جائے بیوی کو اس کے ساتھ ستی ہونا پڑتا ہے۔مہابھارت میں ایک اور رامائن میں تین کے ستی ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

اس دور میں بھی عام طور پر عورت کو وراثت کا حق حاصل نہیں تھا۔وہ خود مرد کی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔پران کے مطابق عورت کو گروی رکھا جا سکتا تھا اور رہن رکھنے پر سود کے طور پر اس کی قیمت کا ساتواں حصہ لیا جاتا تھا۔جسے خود ایک اثاثہ سمجھ کر رہن رکھنے کی بات کی جا رہی ہو وہاں اس کے حقِ وراثت کی کیا بات کی جا سکتی ہے۔مگر سمرتی کے ایک مصنف پرجاپتی کے مطابق شوہر کی ہر طرح کی جائداد میں بیوی کا حق ہے۔اگر شوہر کے مرنے کے بعد اس کا کوئی رشتہ دار بیوہ کو اس کے حق سے محروم رکھتا ہے تو وہ سزا کا مستحق ٹھہرتا ہے۔وہاں کے راجا کو چاہیے کہ اسے سزا دے اور بیوہ کا حق اس تک پہنچائے۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شوہر کی زندگی میں اس کی جائداد پر بیوی کا کوئی حق نہیں ہے۔بیوگی کی حالت میں ہی اسے یہ حق مل سکتا ہے۔

اس دور میں جہاں عورت کی ذات کو مسخ کرنے والے دانشوروں کے ساتھ ساتھ ایسے مصلحین بھی ملتے ہیں جن کے قلم میں کمتر پیمانے پر ہی سہی عورت کی حمایت کے لیے جنبش پیدا ہوئی ہے۔مگر عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کے ویدک دور کے

مقابلے مابعد ویدک یعنی سمرتی، پورانک، وپنیشد، بودھیشٹ اور رزمیہ نظموں کا دور عورت کے لیے المناک دور تھا۔اس کی خاندانی اور سماجی زندگی پست سے پست تر ہوتی چلی گئی۔

مسلمانوں کی آمد کے بعد کا دور (1000ء سے 1800ء)

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد کا دور بھی عورت کے لیے کوئی نوید لے کر نہیں آیا۔اس دور کی تاریخ میں بھی عورت کی آہ وبقا کا شور صاف سنائی دیتا ہے۔اس عہد کی تاریخ مابعد ویدک عہد میں اس کی زبوں حالی کی اضافی شکل ہے جس میں بچپن کی شادی، ستی، بیوگی، عصمت فروشی، دیوداسی، جہالت وغیرہ کے ساتھ ساتھ سخت پردے کے رواج کے باعث عورت کی حالت مزید خستہ ہوگئی تھی۔ہم اس کے لیے مذہب اسلام کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔کیوں کہ اسلام ہی وہ پہلا مذہب ہے جس نے عورت کو بحیثیت انسان بلند و بالا مرتبہ عطا کیا۔اسلام میں خواتین کے حقوق کے لیے جتنے قوانین پیش کیے گئے ہیں اگر انہیں ان کی اصلی صورت میں نافذ کیا جائے تو انہیں اپنی بہتری کی تلاش میں کہیں اور بھٹکنے کی ضرورت نہیں ہے۔یہ بات سو فیصد صحیح ہے کہ اسلام نے مرد کو عورت سے ممتاز مانا مگر اس کے ساتھ ساتھ قران میں باقاعدہ طور پر عورت کے مختلف حقوق کی وضاحت کر دی کہ کہیں مرد خود سری کا شکار نہ ہو جائے۔باایں ہمہ چند ایسے مقامات پر بھی روشنی ڈال دی جہاں عورت کا مرتبہ مرد سے مساوی اور کہیں برتر بھی رکھا گیا ہے۔عورت کے حقوق میں تعلیم کا حق، حقِ وراثت، نان ونفقہ کا حق، شوہر کے انتخاب کا حق، خلع کا حق، عقد ثانی کا حق، بیوگی کے بعد دوبارہ شادی کا حق، آزادیٔ رائے کا حق، ملازمت کا حق، تجارت کا حق، چند ایک معاملات کو چھوڑ کر قاضی کے فرائض انجام دینے کا حق غرض کے اس طرح کے مختلف حقوق شامل کیے گئے۔مولانا رومی کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

پرتو حق است آں معشوق نیست
خالق ست آں گوئیاں مخلوق نیست

محمد زبیر صدیقی لکھتے ہیں:

> ''مولانا روم فرماتے ہیں کہ عورت نورِ الٰہی کی بہترین مظہر ہے۔وہ محض مادی معشوق نہیں ہے۔بلکہ اس کو خالق کہا جا سکتا ہے۔ڈاکٹر نکلسن اس شعر کی شرح میں ابن العربی اور دوسرے کبار صوفیہ کے اقوال نقل کر کے لکھتے ہیں کہ مولانا روم اس شعر میں عورت کے مادّی فرائض کی طرف نہیں بلکہ اس کے روحانی خصائص کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کی وجہ سے مرد میں محبت کا وہ جذبہ پیدا ہوتا ہے جس کے ذریعے سے وہ معشوق حقیقی (خدا) کے ساتھ یگانگت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔عورت کی ایسی تعریف وتمجید کسی قوم نے آج تک نہیں کی ہے۔''[18]

الغرض اسلام نے عورت کو اس کا صحیح مقام عطا کیا۔مگر یہ مساوی نظریہ اسلام میں عورتوں کے ساتھ بہت دنوں تک قائم نہیں رہ پایا۔مرد نے اپنی طاقت کے بل بوتے اپنے مفاد کے لیے ان میں تصرف کرنا شروع کیا اور عورت کے حقوق کو پامال کر دیا۔ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے سلسلے میں صالحہ بیگم لکھتی ہیں:

> ''لیکن جو پٹھان، مغل اور ترک، ہندوستان آئے وہ عرب کی تہذیب کے علم بردار نہیں تھے بلکہ اپنے اپنے ملک کی تہذیب وتمدن کے پیرو تھے۔۔۔ہندوستانی ماحول میں ان کا جو تمدنی کردار پیدا ہوا وہ نہ تو اسلامی تھا نہ پٹھان نہ مغل، بلکہ ان سبھوں کا مجموعہ تھا جو ہندوستانی فضا کا گہرا رنگ لیے تھا۔پردہ کا رواج بھی اسی وقت قائم ہوا۔''[19]

پہلی بات تو یہ کہ مسلمان مختلف ممالک سے ہوتے ہوئے ہندوستان آئے اور اپنی تہذیب وتمدن ساتھ لائے۔مختلف

ممالک کے تہذیبی اثرات سے ظاہری بات ہے کہ ان کی تہذیب خالص عربی تہذیب نہیں رہی تھی۔اس میں مختلف تہذیبوں کی آمیزش ہو چکی تھی۔اور کچھ ہی مدت میں ہندوستانی رسم و رواج نے انہیں اپنے حلقۂ آغوش میں لے لیا۔جہاں آنے والی تہذیب نے قدیم ہندوستانی تمدن پر اثر ڈالا وہیں یہاں کے کلچر نے وہاں کے رسم و رواج کو بھی متاثر کیا۔اس کے باعث ایک نئے مخلوط تمدن کی بنیاد پڑی جو نہ خالص ہندوستانی تھی اور نہ ہی ترکی، پٹھانی اور اسلامی تھی۔اسی تہذیب و ثقافت اور رسم و رواج کے تبادلے کا سب سے برا اثر عورت کی زندگی پر پڑا۔اس کی سماجی حیثیت نہایت ہی کمتر ہو گئی۔ہندوستان کے قدیم دور میں پردے کا رواج تو ملتا ہے مگر اس کی پابندی میں اتنی شدت نہیں برتی جاتی تھی۔مگر مسلمانوں کی آمد کے بعد اس رواج میں شدت پیدا ہو گئی۔اس سلسلے میں ستیش چندرا لکھتے ہیں:

''اس عہد میں اعلیٰ طبقے کی عورتوں کو پردے میں رکھنے کا اور غیر مردوں کی موجودگی میں چہرے کو چھپانے کا رواج عام ہو گیا تھا۔بدنگاہ مردوں سے عورتوں کو بچانے کی خاطر پردے میں رکھنے کا رواج ہندوؤں میں بھی تھا۔قدیم ایرانیوں اور یونانیوں میں بھی یہ رواج پایا جاتا تھا۔عربوں اور ترکوں نے بھی اس رواج کو اپنا لیا تھا۔وہ ہندوستان آئے تو یہ رواج یہاں بھی اپنے ساتھ لائے ان کو دیکھ کر ہندوستان خصوصاً شمالی ہند میں پردہ کرنے کا عام رواج ہو گیا۔''0 2

پردے کی سختی کی وجہ سے عورتوں میں تعلیمی انحطاط کا پیدا ہونا لازمی تھا۔عورت گھر کی چہار دیواری میں مقید ہو کر رہ گئی۔اس نے اپنی انفرادیت کھو دی۔مزدور پیشہ اور زراعت پیشہ عورتوں کے علاوہ دیگر طبقے کی عورتوں کے لیے پردہ لازمی قرار دے دیا گیا۔حصول معاش کے لیے جدوجہد تو کرنا در کنار گھر کی چہار دیوری کے باہر سانس لینا بھی مشکل ہو گیا۔عورت مرد کی دست نگر بن کر رہ گئی۔مولانا ابوالکلام آزاد پردے کے متعلق لکھتے ہیں:

''ہم صاف صاف کہے دیتے ہیں اور اسے قطعی فیصلہ سمجھ لو اصول مسلمہ کی طرح مان لو کہ جب تک متعارف پردہ ہندوستان سے نہ اٹھے گا، جب تک عورتوں کو جائز آزادی جس کا اسلام مجوز ہے، نہ دی جائے گی غلامی میں رہ کر اور پردہ کی تقلید کے ساتھ تعلیم دینی نہ صرف فضول بلکہ مضر اور اشد مضر ہے۔''1 2

یہ صحیح تھا کہ اس رواج کے باعث عورت تعلیم اور دیگر سہولیات کے بغیر نہایت پست حیثیت پر پہنچ چکی تھی جہاں اس کی جائز آزادی کی بات کرنی بے معنی اور فضول تھی۔

اس کے علاوہ بچپن کی شادی جو قدیم ہندوستانی قوم میں رائج تھی مسلمان بھی اس کی پیروی میں اپنی بیٹیوں کو نو یا دس سال کی عمر میں بیاہ دیتے تھے جس سے ماں اور نومولود بچے دونوں کی موت کے تناسب میں اضافہ ہو گیا۔حفظانِ صحت کی ناواقفیت کی بنا پر عورتیں مہلک مرض میں مبتلا ہو جاتی تھیں۔اسلام میں خلع، طلاق اور عقد ثانی کوئی تعجب خیز بات نہیں تھی۔مگر ہندوستان میں ان خلع اور طلاق کا کوئی تصور ہی نہیں تھا صرف نارد سمرتی میں اس کا ذکر ہے کہ شوہر میں اگر کوئی کمی ہو تو بیوی اسے چھوڑ سکتی ہے اور دوسرے کسی بھی قانون نے اس کا کوئی مثبت ذکر نہیں کیا اس کے علاوہ بیوہ کے لیے دوسری شادی ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔مسلمانوں نے اس کی پیروی میں اپنے مذہبی قوانین کو پیچھے چھوڑ دیا۔بقول قرۃ العین حیدر:

''ہندوستانی والدین اپنی لڑکی کو نصیحت کرتے تھے کہ ایسے مجازی خدا (شوہر) کے گھر میں پالکی میں بیٹھ کر جاؤ کہ وہاں سے صرف جنازہ ہی باہر آئے۔یہ خوشحال معمر خاندانوں کے لیے بھی ایک غیر تحریری قانون بن گیا۔''2 2

کم عمر میں بچیوں کی شادی معمر مردوں سے کی جانے کی وجہ سے لڑکیوں میں اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے بدکاری کا رجحان عام ہونے لگا۔اس کے علاوہ بادشاہوں کی حرم سراؤں کی روایت نے عورت کی سماجی حیثیت کو اور بھی زیادہ پست کر دیا۔اس سے یہ خرابی پیدا ہوئی کہ عام گھروں میں اس کے لیے کوئی خاطر خواہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے معاشرے میں

قحبہ خانے کا رواج عام ہونے لگا۔اس سے عورت کا وجود صرف ایک لذت کوشی کا سامان بن کر رہ گیا۔دن بدن قحبہ خانے کے بڑھتے رواج سے بادشاہ بھی پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔دہلی میں قحبہ خانوں کی بڑھوتری میں روک لگانے کے لیے علاءالدین خلجی نے ایک فرمان جاری کیا تھا کہ اسے جلد سے جلد قابو میں لایا جائے اور جہاں تک ہو سکے ان کی شادی کروا کے خانگی زندگی گزارنے پر مجبور کیا جائے۔

ہندوؤں میں ستی کا رواج جوں کا توں قائم تھا۔اس دور میں کئی مسلم بادشاہوں مثلاً ہمایوں اور اکبر نے اس پر روک لگانے کی کوشش کی مگر انہیں کامیابی نہیں ملی۔وراثت کے حق کے اعتبار سے بھی ہندو عورت کی قانونی حیثیت اطمینان بخش نہیں تھی۔ستری دھن کے علاوہ اس کی اپنی کوئی جائداد نہیں ہوتی تھی جس کے سبب اسے مرد کی محتاج بننا پڑتا تھا۔مگر اس دور میں بھکتی تحریک کی ابتداء عورت اور شدر کے لیے نیک فعال ثابت ہوئی۔کئی عورتوں نے پردہ ترک کر دیا اور اس تحریک سے منسلک ہو گئیں۔مگر اس تحریک کے خلاف مذہبی کٹر پنتھیوں نے آواز اٹھائی اور اسے پنپنے ہی نہیں دیا۔اور اس تحریک کا بہت جلد خاتمہ بھی ہو گیا۔ ڈاکٹر آمنہ تحسین لکھتی ہیں:

> ’’ہندوستان کی تاریخ میں اٹھاریں صدی عیسوی ہمہ جہتی انحطاط کا دور مانی جاتی ہے۔جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے پچھلے ادوار کی طرح یہ تاریک ترین دور تھا۔مغل شہنشاہیت میں انتشار،مختلف یوروپی طاقتوں کے عروج اور فرسودہ رواجوں،رسوم،توہمات اور نامعقول اجارہ داری نے ملک کو تباہ کر دیا تھا۔ان حالات میں عورتیں اپنی آزادانہ شناخت کھو بیٹھی تھیں۔وہ مکمل طور پر مردوں کی ماتحت بنادی گئی تھیں۔‘‘ 3؎

برطانوی دور (1800ء-1947ء)

انیسویں صدی ’’جدید ہندوستان‘‘ کے آغاز کی صدی ہے۔اس کے نصف آخر تک انگریز ہندوستان پر پوری طرح قابض ہو چکے تھے اور غدر (1857ء) کے بعد انکی بنیاد بھی یہاں مستحکم ہو چکی تھی۔ان کی حکومت میں محکوم ہندوستانی عوام بری طرح جکڑے ہوئے تھے۔اس غلامی کی زندگی سے آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔یہ عجیب کشمکش کا دور تھا۔اس دور میں بھی عورت مختلف مسائل سے دوچار تھی۔ویسے ہی ایک عام عورت کے لیے چہاردیواری کے اندر قید ہو کر اپنے شوہر کی اطاعت اور بچوں کی دیکھ بھال میں پوری زندگی اپنے لب سی کر گزار دینا اس کا مقدر تھا۔مردوں کو ایک سے زیادہ شادی کرنے کی اجازت تھی۔مگر عورت بیوگی کے بعد دوسری شادی نہیں کر سکتی تھی۔اسلام کے اصل قوانین پر مرد حاوی نظام کا ایک دبیز پردہ پڑ چکا تھا۔ہندوستانی تہذیب نے مسلمانوں کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔مسلمانوں میں بھی عورت کے بیوہ ہونے کو منحوس سمجھا جانے لگا تھا۔ہندوؤں کی طرح ایک مسلم بیوہ کی عقدِ ثانی میں بھی مختلف مسائل درپیش آنے لگے۔یعنی عورت کی حالت دونوں اقوام میں یکساں تھی۔پِپن چندر لکھتے ہیں:

> ’’سماجی حیثیت اور زندگی کی قدروں میں ہندو مسلمان عورتوں کی حالت یکساں تھی اور سماجی معاشی اعتبار سے دونوں یکساں طور پر کلیتاً مرد کی تابع تھیں۔آخری بات یہ ہے کہ بیشتر عورتیں تعلیم کے فیض سے محروم تھیں۔اس پر مزید یہ تھا کہ عورتوں کو مرد کی ماتحتی قبول کرنے کی اور اسے اپنے لیے طرۂ امتیاز سمجھنے کے لیے تعلیم دی جاتی تھی۔‘‘ 4؎

تعلیم سے محرومی عورت کے لیے نہایت ہی مضر ثابت ہوئی۔بچپن کی شادی اور سخت پردے کے نظام نے اس کی سماجی حالت کو بہت زیادہ متاثر کیا۔قحبہ خانے کو سماج میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی جس سے عورت صرف لذت حاصل کرنے کا ذریعہ بن کر رہ گئی تھی۔عیش پسند امراء و نوابین طوائفوں کی کوٹھیوں میں جانا اپنی شان سمجھتے تھے۔جنس بازار کی طرح اس کے جسم کی خریداری کھلے عام ہوا کرتی تھی۔طوائفوں کی کوٹھیاں تہذیب و تمدن اور آداب و اخلاق کے ادارے مانے جاتے

تھے۔شرفاءاورنوابین اپنے بچوں کواخلاقی درس کے لیےطوائفوں کےکوٹھے پربھیجا کرتے تھے۔یہ رجحان صرف اعلیٰ طبقے تک ہی محدود تھا کیوں کہ غریب عوام کے پاس دولت کی فراوانی نہیں تھی۔ادھرعورت کا طوائف کی حیثیت سے ذہنی اور جسمانی استحصال ہورہا تھا ادھر گھریلوعورت مرد کی عیش کوشی کے باوجودلب کھولنے کی جراءت تک نہ کرسکتی تھی۔اسی اخلاقی پستی کی بدولت عورت اپنے سارے بنیادی حقوق سےمحروم ہوکررہ گئی تھی۔

برطانوی عہد میں عورت کی سماجی حالت ایک طرف بڑی خستہ ضرورتھی مگر وہیں انگریزوں کی روشن خیالی نے ہندوستانیوں کوبہت زیادہ متاثر بھی کیا تھا۔یہاں کی عوام اورخصوصاً عورتوں کی حالت کےسدھارکے لیےانگریزوں نے قابل قدراقدامات اٹھائے۔نئے انداز کی معیشت،مملکتی ڈھانچہ،تعلیمی نظام اورسماجی قانون میں مختلف تبدیلیاں رائج کی گئیں۔لڑکیوں کے لیےمکتب اورمدرسے قائم کیے گئے۔انگریزوں کی ماتحتی میں یہاں کے کچھ روشن خیال اور باشعورلوگوں نے بھی عورت کی فلاح وبہبودی میں فعال کرداراداکیا۔ان کے زیرسایہ مختلف تحریکات وجودمیں آئیں۔اس ضمن میں برہموسماج اور آریہ سماج نے نمایاں کام انجام دیا۔برہموسماج کے بانی راجارام موہن رائے کی انتھک کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ 1829ء میں لارڈولیم نےستی کےخلاف ایک قانون پاس کیا،جس میں شوہرکی چتاکےساتھ بیوہ کا خودکوآگ کےسپردکردینا قانوناً جرم قرار دیا گیااوراس رسم کی حمایت کرنے والوں کوبھی سزا کا مستحق ٹھہرایا گیا۔راجارام موہن رائے،ایشورچندرودیاساگر،کشیپ چندرسین وغیرہ کی بے لاگ مخالفت کی وجہ سے 1856ء میں ایک قانون پاس ہواجس میں بیواؤں کودوسری شادی کا اختیار حاصل ہوا۔ 1848ء میں کچھ طالب علموں نے "Student Library and Scientific Society" کی بنیادڈالی جس کے مقاصد میں ایک مقصدلڑکیوں میں تعلیم عام کرنے کے لیےاسکول کا کھولنا بھی تھا۔لڑکیوں کے لیےایک اسکول 1851ء میں جیوتیبا پھولےاوران کی بیوی کی ماتحتی میں پونہ میں قائم کیا گیا۔دوارکاناتھ نے بھی ایک بورڈنگ اسکول 1873ء میں ”ہندو مہیلا اسکول“ کےنام سےکھولا۔پنڈت وشنوشاستری نے 1850ء میں ”انجمن عقدبیوگان“ قائم کی۔کسون داس مول جی نے عقدبیوگان کی ترویج کے لیے”ستیہ پرکاش“ نام کا اخبارگجراتی زبان میں جاری کیا۔نومولودبچوں کے وحشیانہ قتل کےخلاف ”طفل کشی“ کا پہلا قانون 1802ء، 1804ء میں صوبہ بنگال میں بینٹنگ اور ہارڈنگ کے زمانے میں سختی سےعمل میں لایا گیا تھا۔دادابھائی ناروجی نے پارسی عورتوں کی فلاح کے لیے”پارسی لا ایسوسی ایشن“ بنائی جس کا مقصد پارسی عورتوں کووراثت اور شادی میں برابری کادرجہ دلاناتھا۔

چنانچہ عورتوں میں بھی تعلیم کا شوق پیداہواجس کے لیےان میں سےکئی نےبیرون ممالک کابھی سفرکیا۔ان خواتین میں سرلادیوی،سروجنی نائیڈو،وجیالکشمی پنڈت،کملادیوی چٹوپادھیائے،اینی بیسنٹ،مارگرٹ کزن،بیگم شریف حامدی،مسرور جہاں وغیرہ شامل تھیں ان خواتین نے انڈین نیشنل کانگریس (INC)سے منسلک ہوکربہت اعلیٰ پیمانے پرکام کرنا شروع کیا۔ 1917ء میں مسزاینی بسنٹ نے”انڈین ایسوسی ایشن“ کےذریعہ عورتوں کی تعلیم کوفروغ دینےکی کوشش کی۔ 1920ء میں ”فیڈریشن آف یونیورسٹی آف ویمن“ قائم ہوئی۔ 1923ء میں ”قومی کونسل برائےخواتین“ کا آغازہوا۔

عورت کوجائزمقام دلوانے میں سرسیداحمدخان اوران کےرفقانے نہایت ہی اہم رول اداکیا۔سرسیدنے 1870ء میں ”تہذیب الاخلاق“ جاری کیا جس میں سماجی اورادبی مسائل کےساتھ ساتھ تعلیم نسواں،تعدادازدواج،خواتین کی فلاح و بہبودی پرمشتمل مضامین شائع ہوتے تھے۔شیخ عبداللہ کی سرپرستی میں خواتین کی پہلی کانفرنس 1904ء میں علیگڑھ میں منعقدکی گئی جس میں عورتوں کی تعلیم اورآزادیٔ رائے پربہت سے فیصلے لیے گئے تھے۔شمس العلماءمولوی ممتازعلی نے ایک رسالہ ”تہذیب نسواں“ جاری کیا تھا۔اس رسالے کےذریعہ عورتوں کی تعلیمی پسماندگی اورذہنی غلامی سےآزادی دلانے کی پرزور کوشش کی گئی تھی۔شیخ عبداللہ نےعلی گڑھ میں گرلس اسکول کی بنیادڈالی جوآگےچل کرویمنس کالج بنا۔سرسیداحمدخاں کی تعلیمی

تحریک سے متاثر ہو کر نذیر احمد، حالی، شبلی، محسن الملک، شیخ عبداللہ، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ نے اپنی تحریروں کے ذریعہ عورتوں کی بھلائی اور ترقی میں نمایاں رول ادا کیا۔ ان کے ساتھ ساتھ خواتین ادیبائیں بھی اپنی تحریروں کے ذریعہ عورتوں کی فلاح و بہبودی میں فعال اور متحرک نظر آئیں۔ All India Muslim Ladies Conference جیسی انجمن کے قائم ہونے کے بعد خواتین کی تعلیم کے لیے راہیں کھلیں۔ ملک میں چاروں طرف زنانہ اسکول، کالج کا قیام عمل میں آنے لگا۔ لڑکیاں اعلیٰ تعلیم کے لیے مغربی ممالک بھی گئیں۔ All India Women's Conference سے منسلک فعال خواتین نے حکومت کے سامنے عورت کی حق رائے دہندگی کا مطالبہ کیا۔ شروع میں اسے مسترد کر دیا گیا مگر بالآخر 1926ء میں حکومت ہند نے عورتوں کو ووٹ دینے کے حق سے نوازا۔ 1937ء میں Hindu Women Right to Property Act پاس ہوا جس کے تحت ہندو عورتوں کو کچھ معاشی حقوق حاصل ہوئے اور شوہر کی جائداد میں ان کا حصہ مقرر رہوا۔ مثلاً قانون کے دفع 3 کے تحت کسی ہندو مرد کی وفات پر نہ صرف اس کا بیٹا اس کا وارث ہوگا بلکہ اس کی بیوہ بھی وارث ہوگی۔ اگر بیٹا بیوہ سے پہلے انتقال کر جاتا ہے تو تب بیوی اس کے حصے کی بھی وارث ہوگی۔ خواتین نے ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

الغرض برطانوی عہد کی روشن خیالی کے باعث خواتین کی سماجی، خاندانی اور قانونی حالات میں بہتر اتبدیلی آئی۔ انہیں مختلف حقوق عطا کیے گئے۔ تعلیم کے میدان میں بھی انہوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اور وہ بھی ایسی صلاحیت کی اہل ہو گئیں کہ انہوں نے دیگر مظلوم عورتوں کے حق میں آواز اٹھایا اور انہیں اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی بھی ملی۔

دورِ حاضر (آزادی کے بعد کا دور)

آزادی کے بعد خواتین کی آزادی اور ان کے حقوق کے تئیں جمہوری ہند میں مختلف اقدامات اٹھائے گیے۔ جمہوری ہند کی خاصیت یہی رہی ہے کہ اس کے دستور میں رنگ، نسل، جنس وغیرہ کو کوئی جگہ نہیں دی گئی۔ سب کے لیے برابری کا قانون نافذ کیا گیا۔

یہاں سے ہندوستانی عورت کے لیے ایک مساوی اور جدید دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ہندوستانی دستور نے عورت کو نہ صرف رائے دہی کا حق عطا کیا بلکہ سیاسی انتخابات میں مقابلہ کرنے کے حق سے بھی نوازا۔ سیاست میں اس کی حصے داری کو بھی منظوری ملی اور اسے اس حق سے بھی نوازا گیا کہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر وہ کسی بھی اعلیٰ عہدے یا ادنیٰ ترین عہدے کے لیے منتخب کی جاسکتی ہے۔ مسز سروجنی نائیڈو اتر پردیش کی گورنر منتخب کی گئی تھیں جبکہ ان کی بیٹی پدمجا نائیڈو کو بنگال کی گورنر چنا گیا تھا۔ ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو کی بہن وجیا لکشمی پنڈت گورنر ہونے کے ساتھ ساتھ امریکہ اور روس میں ہندوستانی سفیر چنی گئی تھیں۔ وہ انگلستان میں ہائی کمشنر کے عہدے پر بھی فائز رہی تھیں۔ پھر انہیں یہ بھی شرف حاصل تھا کہ وہ اقوام متحدہ جنرل اسمبلی کی صدر بھی مقرر کی گئی تھیں۔ سچیتا کرپالینی کو اتر پردیش کی وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے ملک کی خدمت کرنے کا موقع ملا تھا۔ مسز اندرا گاندھی پوری دنیا کی دوسری خاتون رہی ہیں جو وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہوئی تھیں۔ راج کماری امرت کور ہندوستان کی وزیر صحت ہونے کے علاوہ عالمی ہیلتھ آرگانائزیشن (WHO) کی صدر بھی مقرر ہوئیں۔ ہندوستانی دستور میں اس حق کو بھی ترجیح دی گئی کہ مملکت کے زیر انتظام کسی بھی عہدہ پر تقرر یا روزگار سے متعلق معاملات میں تمام شہریوں سے مساوات برتی جائے گی۔ جنسی امتیاز سے پرے مساوی تنخواہ کے حق کو بھی نافذ کیا گیا۔ جدید ہندوستانی قوانین نے زندگی کے مختلف شعبوں میں عورت کے مساوی حقوق کا کھل کر اعلان کیا۔

ہندو قانون وراثت 1956ء نے ہندو بیٹیوں کا اپنے والد کی جائیداد میں حق وراثت تسلیم کیا۔ ڈاوری (جہیز) کو ایک سماجی برائی تسلیم کرتے ہوئے اس کے خلاف بھی 2005ء میں قانون Domestic Violence Act بنا کر عورت کو گھریلو تشدد سے نجات دلا کر اسے مزید تحفظ فراہم کیا گیا۔ 5 تا 14 سال تک مفت تعلیم کا نظام قائم کیا گیا جس سے لڑکیوں کو بھی اعلیٰ پیمانے پر

مستفیض ہونے کا موقع ملا۔ تعلیم کی سہولیات نے عورت کی زندگی ہی بدل دی۔ لڑکیوں کی شادی کی عمر اٹھارہ سال کر دی گئی۔ اس کے علاوہ ہندوستانی دستور میں بیویوں کے حقوق کے لیے بھی مختلف قانون بنائے گئے۔ Hindu Marriage Act 1955 کے تحت بیویوں کے تحفظ کے لیے مختلف سہولیات فراہم کی گئیں۔ بیوہ کو بھی دوبارہ شادی کرنے کا حق ملا۔ اس کے ساتھ ساتھ قانون نے اسے شوہر کی جائیداد کا بھی حصہ دار بنایا۔

اس طرح ہندوستانی عورت نے مختلف میدانوں میں مردوں کے ہمراہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور پورے انہماک کے ساتھ مختلف امور کی انجام دہی میں بہترین کارکردگی کا ثبوت پیش کیا۔ آزاد ہندوستان میں اسے آزادی کی نوید تو سنائی گئی اور اس سے ملک کی عورتوں نے فائدہ بھی اٹھایا مگر آج بھی ہندوستانی عورت کی اکثریت مختلف طرح کے تشدد کا شکار ہے۔ آج بھی اسے مکمل آزادی نہیں ملی ہے۔ گھریلو تشدد مختلف درمیانی اور نچلے طبقے کی عورتوں کی جان کا جنجال بنا ہوا ہے۔ عصمت ریزی کی وارداتیں اس قدر عام ہو چکی ہیں کہ چھ ماہ کی بچی کی معصومیت کو کچل کر حیوان صفت مرد اپنی بے غیرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ قدیم دور میں عورت گھر کی چہار دیواری میں محفوظ نہیں تھی اور آج اس نام نہاد آزادی کے دور میں بیرون خانہ اپنے تحفظ کی لڑائی لڑ رہی ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ مرد کہ قانون کہ خود عورت؟ یہ سوال بڑا ہی غور طلب ہے اور بڑی ہی سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کا تقاضہ کرتا ہے۔ عصر حاضر میں عورت موافق قوانین کے باوجود اس طبقے کی اکثریت ظلم و تشدد کا شکار ہے اور یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا؟ کب اس کی اس آزادیٔ شب کے انتظار کا خاتمہ ہوگا؟ یہاں فیض کی نظم صبح آزادی کے چند مصرعے ذہن کو کرید رہے ہیں کہ:

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

اسلام میں عورت کا تصور اور مقام

چھٹی صدی عیسوی میں حضرت محمدؐ کی آمد نے پوری دنیا کو امن وسکون اور آزادی ومساوات کا مژدہ سنایا۔تاریخ انسانی کا یہ پہلا اور سب سے بڑا واقعہ ہے جس نے انسانی شعور میں انقلاب برپا کر دیا۔آپؐ کی آمد ایک ایسے دور میں ہوئی جب انسان جہالت کی حد پار کر چکا تھا۔ ہاشم انور اپنی کتاب "A short hist on" میں لکھتے ہیں:

"The period in the Arabian history preceding the ris
Jahiliya or the age of ignorance."[25]

یہ دور خصوصاً عورت پر ظلم و بربریت کے عروج کا دور تھا۔اہلِ عرب عورت کا وجود اپنے لیے ننگ وعار سمجھتے تھے۔لڑکی کی پیدائش ان کے لیے باعث ذلت تھی،اس لیے اس مظلوم کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔اس دور کے عرب کی تاریخ عورت کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کی داستان سناتی نظر آتی ہے۔ظلم کے اس انتہائی عروجی دور میں ایک ایسے بڑے انقلاب کی ضرورت تھی جس کی معرفت انسان کے غور وفکر کرنے کے طریقے میں تبدیلی لائی جا سکے۔اور یہ انقلاب اسلام کی شکل میں حضورؐ کی معرفت دورِ جاہلیت میں نمودار ہوا جس کے نتیجے میں سوچ وفکر کی دنیا میں یلغار پیدا ہو گیا۔عقل وشعور میں بالیدگی پیدا ہوئی،انسان نے نئے طریقے سے سوچنا شروع کیا۔اپنی خود غرضی کو بالائے طاق رکھ کر دنیا کے دوسرے مظلوم مخلوق کی وجودی حیثیت متعین کرنے کی کوشش کی جس میں عورت سرفہرست تھی۔اس کے متعلق انسان کا قدیم رویہ یکسر بدل گیا۔اس کو اس کی وجودی شناخت ملی۔اب ایسا وقت آیا جہاں مرد وزن کے تعلقات نئے اور مساوی بنیادوں پر قائم کیے گیے۔ایک روایت میں حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

''ہم عہدِ جاہلیت میں عورتوں کو کچھ بھی اہمیت نہیں دیتے تھے لیکن جب اسلام آیا تو اللہ نے ان کا ذکر کیا،لہٰذا ہم نے محسوس کیا کہ ہم پر عورتوں کے بھی حقوق ہیں۔'' (بخاری)

اسلام میں عورت کے تصور کی شروعات ہم اس غلط فہمی کے ازالے سے کرنا چاہتے ہیں جس میں حضرت آدمؑ و حضرت حواؑ کے شجر ممنوعہ کے پھل کھانے کو لے کر صرف حضرت حواؑ کو ہی مجرم گردانا جاتا ہے۔حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کے متعلق عام روایت اس طرح چلی آ رہی ہے کہ سانپ کے جنت میں داخل ہوتے ہی ابلیس اس کے پیٹ سے نکل آیا اور اس نے حواؑ کو ورغلا کر اس ممنوع پھل کے کھانے پر راضی کر لیا۔چونکہ عورت ناقص العقل ہوتی ہے اس لیے شیطان نے اپنے اس برے فعل کے لیے حواؑ کا انتخاب کیا۔اللہ نے حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو اس پھل کے کھانے سے ممانعت فرمائی تھی۔آدمؑ بھی حواؑ کی باتوں میں آ کر اس پھل کو کھا لیتے ہیں جو اللہ کی بارگاہ میں ان دونوں کے مجرم بننے کا سبب بنتا ہے۔عیسائی اور یہودیوں کے یہاں اس پورے حادثے کا ذمہ دار حواؑ کو ہی ٹھہرایا گیا ہے۔اکثر مسلمان بھی اپنی ناعلمی کے سبب اسی روایت کا حوالہ دیتے آئے ہیں۔عیسائی مذہب میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ حضرت آدمؑ کو پھل کھانے کی ترغیب دینے پر اللہ نے حضرت حواؑ کو سزا کے طور پر یہ حکم دیا کہ:

''میں تیرے دردِ حمل کو بڑھاؤں گا۔تو درد کے ساتھ بچہ جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔''[6]

زاہدہ حنا سامی روایت کی روشنی میں حواؑ کو گناہ گار نہ مانتے ہوئے انسان کے ذریعہ اٹھائے جانے والے اس ٹھوس

قدم (غلط ہی سہی) کو سراہتی ہیں۔سب سے پہلے غور وفکر کرنے کا عمل جو ایک عورت میں پیدا ہوا جس نے اسے ایک ٹھوس فیصلہ لینے پر آمادہ کیا، اس کو فخریہ انداز میں اس طرح پیش کر رہی ہیں:

> ''اپنے آپ کو وہ سامی روایت کی روشنی میں دیکھتی ہے تو روئے زمین کی ساری رونق اسی کے دم قدم سے ہے، ورنہ آدمؑ کا ارادہ تو یہی تھا کہ خداوند خدا کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے زندگی باغ عدم میں ابدالآباد تک بسر کر دی جائے۔یہ حواؑ تھی جس کے اندر جستجو تھی، جس نے سانپ کے روپ میں آنے والے ابلیس سے مکالمہ کیا، نیک و بد کی پہچان کرانے والے پیڑ کا پھل خود کھایا اور آدمؑ کو بھی کھلایا۔کتاب مقدس کی رُو سے حواؑ پہلی گناہ گار ذی روح ٹھہرتی ہے وہ عرش بریں سے فرش زمیں پر آئی تو اس لیے کہ سوچتی تھی، سوال اٹھاتی تھی۔یہ وہی ہے جس نے پہلا قدم اٹھایا، پہلا فیصلہ کیا اور باغِ عدم کی ٹھہری ہوئی اور یکساں زندگی کو اپنے انحراف سے تہہ و بالا کر دیا۔'' 7

مذکورہ روایت جو عہد بہ عہد بنی نوع انسان کے ساتھ چلی آ رہی ہے اس نے بڑے بڑے دانشوروں کو خود پر قلم فرسائی کرنے پر مجبور کر دیا ہے، مگر اس کے متعلق قرآن ساکت ہے۔قرآن میں کہیں بھی اس روایت کا ذکر اس انداز میں نہیں کیا گیا۔علامہ ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر ''وہب ابن منبہ'' میں اس روایت کو نقل کرنے کے بعد اس کی وضاحت کی ہے کہ یہ روایت ان اہل کتاب کے ذریعہ آئی ہے جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔''تفسیروں میں اسرائیلی روایت'' کے مصنف اسیر ادروی نے بھی اس روایت کو اسرائیلی روایت قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''حقیقت یہی ہے کہ یہ بنی اسرائیل کا گڑھا ہوا افسانہ ہے اس لیے اس بے سر و پا کہانی کے سرچشمہ وہ علماء یہود ہیں جنھوں نے اپنی کتاب میں تحریف کر رکھی ہے، انھوں نے ایک صحیح اور حقیقی واقعہ میں کذب و افترا کی آمیزش کر کے یہ کہانی تیار کی ہے۔'' 8

اور جب ہم قرآن کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ قرآن میں اللہ نے آدمؑ اور حواؑ دونوں کو مجرم ٹھہرایا ہے اس لیے دونوں سزا کے مستحق قرار پاتے ہیں۔اس بات کا ذکر کہیں نہیں ملتا کہ شیطان نے پہلے حواؑ کو وسوسے میں ڈالا پھر حواؑ کے ذریعہ آدمؑ بھی شیطان کے ورغلانے میں آ گئے۔قرآن میں سورۂ بقرہ، سورۂ اعراف، سورۂ طٰہٰ، سورۂ ص، سورۂ حجر میں حضرت آدمؑ کے متعلق بیانات ملتے ہیں۔ان کے علاوہ چند سورتیں ایسی ہیں جن میں صرف ضمناً حضرت آدمؑ کا ذکر کیا گیا ہے۔درج بالا سورتوں میں سے سورۂ ص اور سورۂ حجر میں آدم کی تخلیق، آدمؑ کو سجدہ کرنے کے لیے فرشتوں پر اللہ کا حکم، اور ابلیس کا سجدہ کرنے سے انکار میں اللہ کی نافرمانی کرنے کا بیان ملتا ہے۔بقیہ تین سورتوں سورۂ بقرہ، سورۂ اعراف اور سورۂ طٰہٰ میں حضرت آدمؑ اور آپ کی زوجہ (حواؑ) کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔سورۂ بقرہ آیت نمبر 35 تا 38 ملاحظہ ہو:

> ''اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدمؑ رہا کرو تم اور تمہاری بیوی بہشت میں پھر کھاؤ دونوں اس میں سے بافراغت جس جگہ سے چاہو اور نزدیک نہ جائیو اس درخت کے ورنہ تم بھی انہی میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔پھر لغزش دے دی آدمؑ اور حواؑ کو شیطان نے اس درخت کی وجہ سے سو برطرف کر کے رہا ان کو اس عیش سے جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا نیچے اترو تم میں سے بعضے بعضوں کے دشمن رہو گے اور تم کو زمین پر چندے ٹھہرنا ہے اور کام چلانا ایک میعاد معین تک۔بعد ازاں حاصل کر لیے آدمؑ نے اپنے رب سے چند الفاظ تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی ان پر (یعنی توبہ قبول کر لی) بیشک وہی ہیں بڑے توبہ قبول کرنے والے بڑے مہربان۔ہم نے حکم فرمایا نیچے جاؤ اس بہشت سے سب کے سب پھر اگر آوے تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت سو جو شخص پیروی کرے گا میری اس ہدایت کی تو نہ کچھ اندیشہ ہو گا اس پر اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے۔''

سورۂ اعراف آیت نمبر 19 تا 25:

''اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدمؑ! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو، پھر جس جگہ سے چاہو دونوں آدمی کھاؤ۔ اور اس درخت کے پاس مت جاؤ کبھی ان لوگوں کے شمار میں آ جاؤ جن سے نامناسب کام ہو جایا کرتا ہے، پھر شیطان نے ان دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا، تا کہ ان کا پردہ کا بدن، جو ایک دوسرے سے پوشیدہ تھا دونوں کے روبرو بے پردہ کر دے اور کہنے لگا کہ تمہارے رب نے تم دونوں کو اس درخت سے اور کسی سبب سے منع نہیں فرمایا مگر محض اس وجہ سے کہ تم دونوں کہیں فرشتے ہو جاؤ یا کہیں ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے ہو جاؤ۔ اور ان دونوں کے روبرو قسم کھائی کہ جانیئے کہ میں آپ دونوں کا خیر خواہ ہوں۔ سو ان دونوں کو فریب سے نیچے لے آیا۔ پس ان دونوں نے جب درخت کو چکھا تو دونوں کے پردہ کا بدن ایک دوسرے کے روبرو بے پردہ ہو گیا اور دونوں اپنے اوپر جنت کے پتے جوڑ جوڑ رکھنے لگے۔ اور ان کے رب نے ان کو پکارا کیا میں تم دونوں کو اس درخت سے ممانعت نہ کر چکا تھا اور یہ نہ کہہ چکا تھا کہ شیطان تمہارا صریح دشمن ہے؟ دونوں کہنے لگے کہ اے ہمارے رب ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا۔ اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ کریں گے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو واقعی ہمارا بڑا نقصان ہو جائے گا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ نیچے ایسی حالت میں جاؤ کہ تم باہم بعضے دوسرے بعضوں کے دشمن رہو گے۔ اور تمہارے واسطے زمین پر رہنے کی جگہ ہے۔ اور نفع حاصل کرنا ایک وقت تک۔ (اور) فرمایا کہ تم کو وہاں ہی زندگی بسر کرنا ہے اور وہاں ہی مرنا ہے اور اسی میں سے پھر پیدا ہونا ہے۔''

سورۂ طٰہٰ آیت نمبر 115 تا 123:

''اور اس سے (بہت زمانہ پہلے) ہم آدمؑ کو ایک حکم دے چکے تھے۔ سو ان سے غفلت (اور بے احتیاطی) ہو گئی ہم نے حکم کے اہتمام میں ان میں پختگی (اور ثابت قدمی) نہ پائی اور (وہ وقت یاد کرلو) جبکہ ہم نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ آدمؑ کے سامنے سجدہ (تحیّت) کرو سو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے (کہ) اس نے انکار کیا۔ پھر ہم نے (آدمؑ سے) کہا اے آدم (یاد رکھو) یہ بلا شبہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا (اس وجہ سے) دشمن ہے (کہ تمہارے معاملے میں یہ مردود ہوا) سو کہیں تم دونوں کو جنت سے نہ نکلوا دے پھر تم مصیبت میں پڑ جاؤ یہاں (جنت میں) تو تمہارے لیے یہ (آرام) ہے کہ نہ تم بھوکے رہو گے اور نہ ننگے ہو گے۔ اور نہ یہاں پیاسے ہو گے اور نہ دھوپ میں تپو گے۔ پھر ان کو شیطان نے بہکایا کہنے لگا اے آدم کیا میں تم کو ہمیشگی (کی خاصیت) کا درخت بتلاؤں اور ایسی بادشاہی کہ جس میں کبھی ضعف نہ آوے۔ سو (اس کے بہکانے سے) دونوں نے (اس درخت سے) کھالیا تو ان دونوں کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور (اپنا بدن ڈھانکنے کو) دونوں اپنے اوپر جنت کے (درختوں کے) پتے چپکانے لگے۔ اور آدم سے اپنے رب کا قصور ہو گیا سو غلطی میں پڑ گئے۔ پھر (جب انہوں نے معزرت کی تو) ان کو ان کے رب نے (زیادہ) مقبول بنالیا سو ان پر توجہ فرمائی اور راہ (راست) پر (ہمیشہ) قائم رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دونوں کے دونوں اس (جنت) سے اترو (اور دنیا میں) ایسی حالت سے (جاؤ) کہ ایک کا دشمن ایک ہوگا۔ پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت (کا ذریعہ یعنی رسول یا کتاب) پہنچے تو (تم میں) جو شخص میری (اس) ہدایت کا اتباع کرے گا تو وہ نہ (دنیا میں) گمراہ ہوگا اور نہ (آخرت میں) شقی ہوگا۔''

ان سورتوں میں سے آدمؑ اور حواؑ کے جنت سے اخراج اور دنیا میں ورود ہونے کا جو واقعہ سامنے آتا ہے اس سے یہ پتہ لگتا ہے کہ اللہ نے حضرت آدمؑ کو جنت میں آرام فرمانے اور بلا عذر کسی بھی چیز کے استعمال کی اجازت دے دی تھی۔ مگر صرف ایک درخت کو چھونے سے منع فرمایا تھا۔ شیطان چونکہ آدمؑ کو سجدہ کرنے سے منکر ہو کر لعین ہو چکا تھا اس لیے اس کا مقصد اللہ کے

حضور آدمؑ کو ذلیل کرنا تھا تو اس نے آدمؑ اور حواؑ دونوں کو بہکایا۔ سورۂ طٰہٰ میں شیطان با قاعدہ آدمؑ سے ہی اس طرح مخاطب ہے: ''یٰٓ اٰدَمُ ھَلْ اَدُلُّکَ عَلٰی شَجَرَۃِ الْخُلْدِ وَمُلْکٍ لَّا یَبْلٰی ۔'' (اے آدمؑ کیا میں تم کو ہمیشگی (کی خاصیت) کا درخت بتلاؤں۔ اور ایسی بادشاہی کہ جس میں کبھی ضعف نہ آوے۔) یہاں برملا شیطان بجائے حواؑ کے حضرت آدمؑ سے ہی خطاب کر رہا ہے۔ سورۂ اعراف میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ شیطان حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کے من میں یہ کہہ کر وسوسہ ڈالتا ہے کہ اللہ نے تمھیں اس درخت کے استعمال سے صرف اس لیے روکا ہے کہ کہیں تم فرشتہ نہ بن جاؤ یا کہیں تم ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔ اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے اس نے قسمیں بھی کھائیں۔ اس طرح آدمؑ اور حواؑ شیطان کے بہکاوے میں آ گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اس کی وضاحت کرتے ہیں، تورات میں ہے کہ شجرِ ممنوعہ کے پھل کھانے کی ترغیب آدم کو حوا نے دی تھی، اس لیے نافرمانی کا پہلا قدم جو انسان نے اٹھایا وہ عورت کا تھا، اسی بنا پر یہودیوں اور عیسائیوں میں یہ اعتقاد پیدا ہو گیا کہ عورت کی خلقت میں مرد سے زیادہ برائی اور نافرمانی ہے اور وہی مرد کو سیدھی راہ سے بھٹکانے والی ہے۔ لیکن قرآن نے اس قصے کی کہیں بھی تصدیق نہیں کی بلکہ ہر جگہ اس معاملے کو آدمؑ اور حواؑ دونوں سے منسوب کیا ہے۔ انہیں جو حکم دیا گیا تھا وہ بھی یکساں طور پر دونوں کے لیے تھا ''ولا تقربا ھذہ الشجرۃ فتکونا من الظٰلمین'' (البقرہ 35) اور لغزش بھی ہوئی تو ایک ہی طرح پر دونوں سے ہوئی ''فازلھما الشیطٰن عنھا فاخرجھما مما کانا فیہ'' (البقرہ 36) شیطان نے دونوں کے قدم ڈگمگا دیئے اور دونوں کے نکلنے کا باعث ہوا۔ یعنی جو لغزش ہوئی اس میں یکساں طور پر دونوں کا حصہ تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ کسی ایک پر دوسرے سے زیادہ ذمہ داری ہو۔[2]

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری ایک جگہ وضاحت کرتے ہیں کہ عورت پر سے دائمی معصیت کی لعنت ہٹا دی گئی اور اس پر سے ذلت کا داغ بھی مٹا دیا گیا کہ مرد اور عورت دونوں کو شیطان نے وسوسے میں ڈالا تھا، جس کے نتیجے میں ان دونوں کو جنت سے نکالا گیا تھا جبکہ عیسائی روایات کے مطابق شیطان نے حضرت حواؑ کو بہکا دیا اور اس طرح حضرت حواؑ حضرت آدمؑ کے جنت سے نکالے جانے کا سبب بنتی ہیں۔ مگر قرآن مجید اس باطل نظریہ کا رد کرتا ہے۔[3]

قرآن میں بیان کیے گیے آدمؑ اور حواؑ کے اس واقعے سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہو رہا کہ شیطان نے حواؑ کو پہلے بہکایا اور حواؑ کے ذریعے آدمؑ کے ذہن میں وسوسہ ڈالا اور نہ ہی یہ کہ عورت ناقص العقل ہے اور گمراہ کرنے والی ہے۔ اور نہ ہی کہیں اس کا ذکر ہے کہ اللہ نے سزا کے طور پر اسے خاوند کی محکوم بنایا اور اس کے دردِ حمل میں اضافہ کیا۔ بلکہ سورۂ طٰہٰ میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ شیطان نے آدمؑ کو براہِ راست وسوسے میں ڈالا۔

بعض حلقوں میں عورت کی تخلیق کے متعلق یہ تصور پایا جاتا ہے کہ وہ مرد کی پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ اور یہی تصور اس کو مرد سے کمتر مانے جانے کے لیے کافی ہے کہ جس کی تخلیق مرد کے جسم کے ایک چھوٹے سے جز کے ذریعے کی گئی ہو وہ مرد کے برابر کیسے ہو سکتی ہے؟ مگر قرآن اس معاملے میں خاموش ہے۔ سورۂ نسا آیت نمبر ایک کا شروع کا حصہ ملاحظہ ہو:

> ''لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑ ا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔''

مولانا مودودی صاحب نے اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تمام انسان ایک نسل سے ہیں اور ایک دوسرے کا خون اور گوشت پوست ہیں۔ ''تم کو ایک جان سے پیدا کیا'' یعنی نوعِ انسانی کی تخلیق ابتداً ایک فرد سے کی۔ دوسری جگہ قرآن خود اس کی تشریح کرتا ہے کہ وہ پہلے انسان آدمؑ تھے جن سے دنیا میں نسلِ انسانی پھیلی۔ ''اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا'' اس کی تفصیل ہمارے علم میں نہیں ہے، عام طور پر جو بات اہلِ تفسیر بیان کرتے ہیں اور جو بائبل میں بھی بیان کی گئی ہے وہ

یہ ہے کہ آدمؑ کی پسلی سے حواؑ کو پیدا کیا گیا۔تلمود میں اورزیادہ تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ آدمؑ کی پسلی سے حضرت حواؑ کو حضرت آدمؑ کی بائیں جانب کی تیرہوئیں پسلی سے پیدا کیا گیا۔لیکن کتاب اللہ اس بارے میں خاموش ہے اور جو احادیث اس کی تائید میں پیش کی جاتی ہیں اس کا مفہوم وہ نہیں جو لوگوں نے سمجھا ہے۔لہٰذا بہتر یہ ہے کہ بات کو اسی طرح مجمل رہنے دیا جائے،جس طرح اللہ نے اسے مجمل رکھا ہے۔31

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں''خلق منھا زوجھا'' کے معنی ہیں اس کی جنس سے۔پھر وہ بتاتے ہیں کہ اس کے معنی لوگوں نے دوسرے بھی لیے ہیں لیکن جس بنیاد پر لیے ہیں وہ نہایت ہی کمزور ہے۔آگے فرماتے ہیں کہ جو معنی انہوں نے لیا ہے اس کا ردخود قرآن میں موجود ہے۔سورۂ نحل میں فرمایا''واللہ جعل لکم من انفسکم ازواجاً''۔اور اس کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں،ظاہر ہے کہ اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ اللہ نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں۔اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ یہ یہاں ہر ایک کے اندر سے پیدا ہوئیں 32

ڈاکٹر راشد شاز سورۂ نسا کی مذکورہ آیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں قرآن نے پہلے انسانی جوڑے کے متعلق جتنی کم تفصیلات دی ہیں اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تفصیلات قرانی تصورحیات کے خط وخال وضع کرنے میں کچھ زیادہ اہمیت کی حامل نہیں۔یہاں صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ دنیا کے تمام افراد ایک ہی نفس یا روح سے پیدا کیے گیے ہیں اور اسی روح سے ان کا جوڑا بھی پیدا کیا گیا ہے۔لفظ نفس عربی زبان میں فی نفسہ تو مونث ہے۔البتہ اس سیاق میں اسے وسیع معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور یہی معاملہ لفظ زوج کا بھی ہے جو ہے تو مذکر مگر وسیع معنوں میں قرآن میں کثرت سے استعال ہوا ہے۔لفظ من میں 'سے' اور 'میں' دونوں کے استعمال کی یکساں گنجائش موجود ہے۔اس کے بعد اس آیت کا لب لباب اس طرح بیان کررہے ہیں کہ دنیا کے تمام انسانوں کو خواہ مرد ہو یا عورت ایک ہی نفس سے پیدا کیا گیا ہے۔انسان کی تخلیق میں جس روح کا استعمال کیا گیا ہے یا جس گارے سے ان کا خمیر تیار ہوا ہے وہ ایک ہی ہے 33۔آگے اس آیت کی بنیاد کے متعلق جانکاری فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس آیت میں بنیادی طور پر دو باتوں پر زور ہے۔اولاً اللہ سے ڈرو اور ثانیاً یہ کہ کارخانہ رحم کی تخلیقی عظمت کو نہ بھول جاؤ۔دیکھا جائے تو یہ آیت عورت کو مرد کا کمتر حصہ بتانے کے بجائے عورت کی زبردست تخلیقی عظمت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔اور اہل ایمان کو اس بارے میں متوجہ کرتی ہے کہ عورت سے اپنے باہمی حقوق کی طلبی میں اس حقیقت کو نہ بھول جانا کہ اس کائنات میں تمہارا داخلہ کسی عورت کی مادرانہ شفقت و محبت کے نتیجے میں ہی ممکن ہوا ہے 34

مولانا سید جلالدین عمری صاحب اس آیت کی وضاحت میں لکھتے ہیں؛یہ اس بات کا اعلان تھا کہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان جو جھوٹے امتیازات دنیا نے قائم کررکھے ہیں اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور سب بے بنیاد ہیں۔اللہ نے سارے انسان کو ایک نفس واحد سے پیدا فرمایا۔سب کی اصل ایک ہے۔پیدائشی طور پر نہ تو کوئی شریف ہے نہ رذیل نہ کوئی اونچی ذات کا ہے نہ نیچی،نہ کوئی امیر ہے نہ غریب،اللہ کی نگاہ میں سب برابر اور مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔خاندان،قوم،قبیلہ،رنگ،نسل،صنف،زبان اور پیشے کی بنیاد پر ایک دوسرے میں تفریق پیدا کرنا بالکل غلط ہے 35

مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب لکھتے ہیں زوجک سے مراد حضرت حواؑ ہیں جو اس وقت پیدا ہو چکی تھیں۔یہ روایت کہ حضرت حواؑ کی پیدائش حضرت آدمؑ کی پسلی سے ہوئی ہے توریت کی ہے(کتاب پیدائش2: 18)''خلق منھا زوجھا'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں تخلیق حواؑ کی تفصیلی کیفیت سے قرآن تو یکسر ساکت ہے اور تقریباً یہی حال حدیث کا ہے،جس مشہور حدیث کی رو سے حضرت حواؑ کا آدم کی پسلی سے پیدا ہونا بیان کیا جاتا ہے اس میں ذکر نہ حضرت آدمؑ کا ہے نہ حضرت حواؑ کا بلکہ محض عورت کی پیدائش اور اس کی کجی و سرکشی کا بیان ہے 36

ڈاکٹر حنا باری ان احادیث کا ذکر کر رہی ہیں جن میں پسلی سے عورت کے تعلق کا ذکر کیا گیا ہے۔

''ابو ہریرہؓ نے کہا نبی کریمؐ نے فرمایا: عورتوں سے خیر خواہی کرو اس لیے کہ وہ پسلی سے بنی ہیں اور پسلی میں اونچی پسلی سب سے زیادہ ٹیڑھی ہے پھر اگر تو اسے سیدھا کرنے لگے گا تو توڑ دے گا اور اگر یوں ہی چھوڑ دے گا تو ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہے گی خیر خواہی کرو عورتوں کی۔''

''ابو ہریرہؓ نے کہا رسول اللہؐ نے فرمایا کہ عورت پسلی کی مانند ہے اگر تو اس کو سیدھا کرنا چاہے گا تو توڑ ڈالے گا اور اگر چھوڑ دے گا تو تیرا کام نکلے گا واضح رہے کہ اس میں کجی ہے۔'' 73

علامہ ابن حجر نے فتح الباری میں پہلی حدیث کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ دراصل عورت کو پسلی سے تشبیہہ دی گئی ہے، عورت کی خلقت کی ابتداء پسلی سے کی گئی ہے اس کا حال پسلی ہی کی طرح ہے اگر اس کی کجی کو سیدھا کرنا چاہو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی تو جس طرح پسلی کے ترچھے پن کے باوجود اس سے کام لیا جاتا ہے اور اس کے خم کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی اسی طرح عورتوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا چاہیے ورنہ سختی کے برتاؤ سے خوش گواری کی جگہ تعلق کے شکست وریخت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ علامہ کرمانی حدیث مذکور کی شرح میں لکھتے ہیں کہ یہ فطرت عورت کی کجی کی طرف صرف استعارہ ہے۔ علامہ نووی نے حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان کی کج روی کو برداشت کرنے کا بیان ہے۔ اور آدمؑ کی بائیں پسلی سے حضرت حواؑ کی پیدائش ہے پھر پسلی کا اثر کجی ہے 83۔ مولانا مودودی نے اشارۃً یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ حضرت آدمؑ کی پسلی سے حضرت حواؑ کی پیدائش کی تائید میں جو احادیث پیش کی جاتی ہیں اس کا مفہوم وہ نہیں ہے جو لوگوں نے سمجھا ہے۔

مذکورہ بالا عالم دین کی تفاسیر سے یہ کہیں بھی ثابت نہیں ہو رہا ہے کہ آدمؑ کی پسلی سے حواؑ کو پیدا کیا گیا۔ بلکہ قرآن میں اس بات کی تفصیل کہیں بھی نہیں دی گئی ہے کہ اللہ نے حواؑ کی تخلیق کس طرح کی؟ اس معاملے میں قرآن خاموش ہے۔ ہاں اس کا بیان ضرور ملتا ہے کہ ''الَّذِی خَلَقَکُم مِّن نَّفسٍ وَّاحِدَۃٍ'' (جس نے (اللہ نے) تم کو ایک جان سے پیدا کیا) اور مولانا مودودی اس آیت کی شرح میں بیان کرتے ہیں کہ ''تم کو ایک جان سے پیدا کیا'' یعنی نوع انسانی کی تخلیق ابتداً ایک فرد سے کی۔ دوسری جگہ قرآن خود اس کی تشریح کرتا ہے کہ وہ پہلا انسان آدمؑ تھا جس سے دنیا میں نسل انسانی پھیلی۔ اتفاق رائے سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سارے انسان ایک نفس واحد (آدمؑ) سے پیدا کئے گئے ہیں اور سب کی بنیاد ایک ہے۔ احادیث میں عورت کو جس بنا پر پسلی سے منسلک کیا گیا ہے وہاں اس کی نازک، بے لچک اور جذباتی صفات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ جس طرح ٹیڑھی پسلی کو سیدھا نہیں کیا جا سکتا اور اگر آزمایا جائے تو اس کے وجود کا ہی خاتمہ ہو جاتا ہے اسی طرح مرد کو چاہیے عورت کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے۔ اگر اس کے ساتھ سختی برتی گئی تو وہ ٹوٹ جائے گی۔ سورۂ نسا کی پہلی آیت اور مذکورہ احادیث کی روشنی میں عورت کو کمزور گردانا جانا اور برابری کے درجے سے خارج کر دینا کسی بھی طریقے سے صحیح ثابت نہیں ہو رہا ہے۔

یہاں تک چند عام غلط فہمیوں پر جامع روشنی ڈالی گئی اور عورت کی پیدائش اور اس کے وجودی پہلو کی اہمیت کو مختلف حوالوں کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ خاندان، معاشرہ، معاش، سیاست، تعلیم وغیرہ زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلام نے کس طرح عورت کو برابری کا درجہ عطا کیا ہے۔

سماج کی نیو گھر پر ہی رکھی جاتی ہے۔ سماج میں گھر ہی انسان کی سب سے پہلی اولین تربیت گاہ ہے جس پر ایک بہترین سماج کی تعمیر کا دارومدار ہے۔ بنیاد ہی اگر کمزور ڈالی جائے تو کسی بھی وقت مکان کے ڈھے جانے کا امکان رہتا ہے۔ اسی طرح گھر ہی اگر صحیح ادارہ نہ بن پائے تو ایک بہترین سماج کا تصور کرنا ہی بے سود ہے۔ یہ کوئی کمتر درجے کا فعل نہیں ہے۔ یہ ایک بہت بڑا اور بنیادی فریضہ ہے جس کا بار اللہ نے عورت کے کندھے پر ہی ڈالا ہے۔ اس بنیادی تربیت گاہ کا معمر عورت کو ہی چنا

گیا۔اس کی شخصیت میں مضمر چند بنیادی خصوصیات ہی ہیں جن کے باعث اسے ایسی عظیم ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ یہ اس کے درجے کی بلندی کا ضامن ہے نہ کہ کسی بھی پہلو سے اس کی کمتری ثابت ہوتی ہے۔گھر میں عورت چار نمایاں کردار نبھاتی ہے۔ اسلام نے ان تمام حیثیتوں کے ذریعے اسے ایک اونچا اور اعلیٰ مقام عطا کیا ہے۔

اسلام میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے بعد سب سے اونچا درجہ ماں کو ہی عطا کیا گیا ہے۔ ماں نو مہینے تک اپنے بچے کو اپنی کوکھ میں پل پل سینچتی ہے۔اس معین مدت میں اسے کتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس تخلیقی عمل کے دوران اسے ہر ہر لمحہ مر کر پھر سے زندہ ہونا پڑتا ہے۔مگر ان مشکل مراحل کے دوران اس کی پیشانی شکن آلود رہنے کے بجائے اس کے چہرے پر ایک ابدی سکون کا بسیرا رہتا ہے۔ یہ وہ روحانی خوشی ہے جو اس دنیا میں کسی اور ذرائع سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ بچے کی ایک ایک سانس کا احساس اسے ہر پل گدگداجاتا ہے۔ یہ وہ عظیم احساس ہے جس سے صرف ایک عورت ہی سرفرازی حاصل کرسکتی ہے۔یہ اللہ کا کرم ہے عورت ذات پر کہ اللہ نے تخلیق انسان جیسے سب سے عظیم عمل کے لیے اس کا انتخاب کیا اور اسی عمل نے دین اور دنیا دونوں میں اس کو بلند و بالا مرتبے سے نوازا۔سورۂ لقمان آیت 14 میں اللہ ارشاد فرماتا ہے کہ:

"اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کیا کر۔"

سورۂ احقاف آیت 15:

"اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اس کی ماں نے اس کو بڑی مشقت کے بعد پیٹ میں رکھا اور بڑی مشقت کے ساتھ اس کو جنا اور اسکو پیٹ میں رکھنا اور اس کا دودھ چھڑانا تیس مہینے ہے۔"

ایک بچے کی بہترین تربیت میں ماں اور باپ دونوں نہایت ہی اہم کردار نبھاتے ہیں۔مگر نو مہینے تک اپنی کوکھ میں بچے کو سنبھالے رکھنا، موت کی سی تکلیف برداشت کر کے بچے کو پیدا کرنا اور دو سال تک اسے اپنا دودھ پلانا، ان اوقات میں جن صعوبتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہ صرف عورت کا اپنا تجربہ ہے اس میں مرد کا کوئی دخل نہیں۔اس لیے ماں، باپ سے تین درجے اوپر ٹھہرائی جاتی ہے۔امام احمد فرماتے ہیں کہ باپ کی اطاعت ہوگی اور حکم مانا جائے گا لیکن جہاں تک حسن سلوک کا تعلق ہے چار حصوں میں سے تین ماں کے ہوں گے 93۔اہلِ ایمان کی جنت ماں کے قدموں تلے قرار دے کر عورت کی عظمت اور احترام کو کئی گنا بڑھا دیا گیا ہے۔آپؐ نے فرمایا سب سے زیادہ حسن سلوک کی حق دار ماں ہے:

"حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا: ایک آدمی رسول اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوا یا رسول اللہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ فرمایا کہ تمہاری والدہ عرض کی پھر کون ہے فرمایا کہ تمہاری والدہ، عرض کی کہ پھر کون ہے؟ فرمایا کے تمہاری والدہ، عرض کی کہ پھر کون ہے؟ فرمایا کہ تمہارا والد ہے۔"
(بخاری، الصحیح، 5: 2227، رقم: 5626)

"حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ عورت پر سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ آپ نے فرمایا اس کے شوہر کا۔ میں نے پوچھا مرد پر سب سے بڑا حق کس کا ہے؟ آپؐ نے فرمایا اس کی ماں کا۔" (حاکم، المستدرک علی الصحیحین، کتاب البر والصلۃ، حدیث 7244)

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے:

"اللہ نے حرام ٹھہرائی ہے ماؤں کی نافرمانی۔۔۔اور لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا۔" (صحیح بخاری)

قران اور احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ماں کی خدمت دیگر رشتوں سے زیادہ عظیم ہے کیوں کہ بچے پر سب سے زیادہ ماں کے احسانات ہوتے ہیں۔ماں کے ساتھ اچھے سلوک کو حصولِ جنت کا ذریعہ اور گناہ کی مغفرت کا ضامن بتایا گیا

ہے۔

اسلام کا نزول ایک ایسے دور جاہلیت میں ہوا تھا جہاں بیٹی کی پیدائش کو انسان اپنی ذلت اور رسوائی کا سبب قرار دیتا تھا۔اس لیے ایسی انسانیت سوز حرکت اس کے ساتھ کی جاتی تھی جس سے روح کانپ اٹھے۔سورۂ نحل' آیت 58-59 میں اللہ فرماتا ہے کہ:

''اور جب ان میں سے کسی کو عورت (یعنی بیٹی) کی خبر دی جائے تو سارے دن اس کا چہرہ بے رونق رہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہے۔جس چیز کی اس کو خبر دی گئی ہے اس کی عار میں لوگوں سے چھپا چھپا پھرے کہ آیا اس کو ذلت پر لیے رہے یا اس کو گاڑ دے خوب سن لو ان کی یہ تجویز بہت ہی بری ہے۔''

اللہ ایک اور جگہ سورۂ تو کیر' آیت 8-9 میں روز محشر کے متعلق ارشاد فرماتا ہے کہ:

''اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر قتل کی گئی تھی۔''

اللہ نے اس انسانیت سوز عمل کی تذلیل کرتے ہوئے اس کی مذمت کی اور روز محشر میں جب زندہ دفنائی گئی بچی سے پوچھا جائے گا کہ تیری قتل کا ذمہ دار کون ہے؟ تو ایسے انسانوں کا حشر بہت برا ہوگا۔اللہ کی نظر میں ذلیل و خوار ٹھہرائے جائیں گے۔دور جاہلیت کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو اسلام دنیا کا پہلا ایسا مذہب ہے جس نے بیٹی کو زندہ درگور کرنے کی ممانعت کی اور اس عمل کو گناہِ عظیم ٹھہرایا۔سورۂ بنی اسرائیل' آیت 31 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور تم اپنی اولاد کو ناداری کے اندیشے سے قتل مت کرو (کیوں کہ) ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی، بے شک ان کا قتل کرنا بڑا بھاری گناہ ہے۔''

اسلام نے نہ صرف بیٹیوں کو عزت و احترام بخشا، سماج اور معاشرے میں اسے بلند مقام سے نوازا بلکہ اسے حق وراثت بھی عطا کی گئی۔سورۂ نساء' آیت 11 میں اللہ ارشاد فرماتا ہے:

''اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے باب میں لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں گو دو سے زیادہ ہوں تو ان لڑکیوں کو دو تہائی ملے گا اس مال کا جو کہ مورث چھوڑ مرا ہے اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کو نصف ملے گا۔''

اسلام میں لڑکیوں کی پرورش کو کار ثواب اور حصول جنت کا بہت بڑا ذریعہ قرار دیا گیا۔حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا:

''جس کسی کے تین لڑکیاں ہوں اور وہ ان کے سلسلے کی تکلیفوں اور معاشی پریشانیوں پر صبر کرے تو ان کے ساتھ اس کی ہمدردی سے اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔فرماتے ہیں اس پر ایک شخص نے پوچھا: اے اللہ کے رسولؐ! اگر کسی کے دو لڑکیاں ہوں (اور وہ ان کے سلسلے میں تکلیف برداشت کرے تو؟) آپ نے فرمایا! دو لڑکیاں ہوں تو بھی (اللہ تعالیٰ جنت عطا فرمائے گا) ایک شخص نے کہا اگر ایک ہو؟ آپؐ نے فرمایا ایک ہو تو بھی۔'' (حاکم المستدرک، کتاب البر والصلۃ، حدیث نمبر 7348-7195)

لڑکی کے ساتھ اس طرح کے حسن سلوک کی مثال کسی اور مذہب میں قطعی نہیں ملتی۔جہاں اس کی بہترین پرورش کو جنت کا ضامن ٹھہرایا گیا وہیں اس کا بھی حکم صادر کیا گیا کہ بیٹیوں کو بیٹوں کی طرح اچھی تعلیم و تربیت سے نوازا جائے اور زندگی بھر چاہے شادی سے پہلے یا شادی کے بعد ان کے ساتھ محبت و شفقت روا رکھا جائے۔حضورؐ ارشاد فرماتے ہیں:

''اپنی اس بچی پر احسان کرنا جو (بیوہ ہونے یا طلاق دیے جانے کی وجہ سے) تیری طرف لوٹا دی گئی ہو اور تیرے سوا کوئی دوسرا اس کا کمانے والا نہ ہو۔'' (حاکم المستدرک، کتاب البر والصلۃ، حدیث نمبر 7345)

اسلام نے جہاں عورت کے دیگر سماجی اور معاشرتی درجات کا تعین اعلیٰ پیمانے پر کیا ہے وہیں وہ بطور بہن بھی نہایت

عزت وعفت سے نوازی گئی ہے۔ بھائی اور بہن کا رشتہ خونی ہوتا ہے جس میں ایک روحانی کشش موجود رہتی ہے۔ دونوں ایک جذباتی لگاؤ سے آپس میں جڑے رہتے ہیں۔ اتنا اہم رشتہ مگر ہمیشہ لاپرواہی کا شکار رہتا ہے۔ آمد اسلام کے قبل اس کی کوئی معنویت ہی نہیں تھی۔ مگر اسلام نے بیٹیوں کی طرح اس رشتے کو بھی اتنی ہی اہمیت سے نوازا ہے۔ بیٹی کی طرح بطور بہن عورت کا وراثت کا حق بیان کرتے ہوئے سورۂ نساء آیت 12 میں اللہ ارشاد فرماتا ہے کہ:

> ''اور اگر کسی ایسے مرد یا عورت کی وراثت تقسیم کی جارہی ہو جس کے نہ ماں باپ ہوں نہ کوئی اولاد اور اس کا ماں کی طرف سے ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے پھر اگر وہ بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو سب ایک تہائی میں شریک ہوں گے (یہ تقسیم بھی) اس وصیت کے بعد (ہوگی) جو (وارثوں کو) نقصان پہنچائے بغیر کی گئی ہو یا (قرض کی ادائیگی) کے بعد۔''

پھر سورۂ نساء آیت 176 میں اللہ ارشاد فرماتا ہے:

> ''لوگ آپ سے حکم دریافت کرتے ہیں۔ فرما دیجیے کہ اللہ تمہیں (بغیر اولاد اور بغیر والدین کے فوت ہونے والے) کلالہ (کی وراثت) کے بارے میں یہ حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص فوت ہو جائے جو بے اولاد ہو مگر اس کی بہن ہو تو اس کے لیے اس (مال) کا آدھا (حصہ) ہے جو اس نے چھوڑا ہے اور اگر (اس کے برعکس بہن کلالہ ہو تو اس کے مرنے کی صورت میں اس کا) بھائی اس (بہن) کا وارث (کامل) ہوگا اگر اس (بہن) کی کوئی اولاد نہ ہو۔ پھر اگر (کلالہ بھائی کی موت پر) دو (بہنیں وارث) ہوں تو ان کے لیے اس (مال) کا دو تہائی (حصہ) ہے جو اس نے چھوڑا ہے اور اگر (بصورت کلالہ مرحوم کے) چند بھائی بہن مرد (بھی) اور عورتیں (بھی وارث) ہوں تو پھر (ہر) ایک مرد کا (حصہ) دو عورتوں کے برابر ہوگا۔''

حق وراثت کے علاوہ مختلف احادیث میں بہن کی پرورش، تعلیم وتربیت اور شادی کے متعلق مختلف احکامات ملتے ہیں۔ کسی حدیث میں تین لڑکیوں یا تین بہنوں کے ساتھ حسن سلوک روا رکھے جانے پر جنت کی بشارت دی گئی ہے تو کسی حدیث میں دو لڑکیوں یا دو بہنوں کے ساتھ بہترین برتاؤ پر بہشت کی خوش خبری سنائی گئی ہے۔ اور رسول اللہ نے یہاں تک ارشاد فرمایا ہے کہ بیٹیوں اور بہنوں کی کفالت اور نگہداشت کے باعث جنت میں حضورؐ کی رفاقت کا شرف حاصل ہوگا۔ یہاں ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے بیٹیوں کو جتنی ترجیح دی بہنوں کو بھی اتنی ہی اہمیت کا مستحق ٹھہرایا۔ حضرت عبداللہ بن حرام انصاریؓ کا ایک واقعہ ہے کہ جنگ احد میں جانے سے پہلے انہوں نے اپنے بیٹے حضرت جابرؓ کو یہ وصیت کی تھی کہ ان کے بعد وہ اپنی بہنوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت جابرؓ چونکہ اس وقت جوان تھے مگر انہوں نے نکاح کے لیے جوان لڑکی کے علاوہ ایک بیوہ کو ترجیح دی۔ جب رسول اللہؐ نے اس کی وجہ جاننی چاہی تو حضرت جابرؓ نے جواب میں کہا کہ:

> ''یا رسول اللہ! میرے والد احد کے معرکے میں شہید کر دیئے گیے اور اپنے پیچھے نو لڑکیاں چھوڑ گیے، جو میری نو بہنیں ہوئیں۔ ان کی نگہداشت کے پیش نظر میں نے یہ پسند نہیں کیا کہ ان کے ساتھ ان ہی جیسی ناتجربہ کار لڑکی کو جمع کردوں۔ اس لیے ایک ایسی عورت کا انتخاب کیا جو ان کی کنگھی چوٹی اور دیکھ بھال کر سکتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ٹھیک کیا تم نے۔'' (بخاری)

یہ وہ قابل تعریف جذبے تھے جو اسلام کی بدولت مسلمانوں کے دلوں میں موجزن تھے۔ اسلامی احکامات جس میں پورے بنی نوع انسان کے لیے فلاح و بہبودی موجود ہے، کی پیروی میں عہد رسالت کے مسلمان اس طرح مستغرق تھے کہ اپنی نفسانی خواہشات ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں۔ آج کے مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی تعلیمات کو قرآن تک ہی محدود رکھ دیا ہے ان کا عملی پہلو یکسر غائب ہے اگر اس پر کہیں عمل کیا بھی جارہا ہے تو اپنے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے ان احکامات پر تحریفات کی چھری چلادی گئی ہے جس نے آج کے مسلم معاشرے کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ اگر فوری

طور پر مسلمان اپنی اصل (قرآن) کی طرف نہ لوٹے تو ان کو برباد ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

اسلام نے جس طرح ماں، بہن اور بیٹی کے حقوق اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی سختی سے تعقید کی اسی طرح بیوی کے حقوق وفرائض پر بھی واضح طریقے سے روشنی ڈالی۔ دور جاہلیت میں عورت شوہر کی جوزیت میں غلامانہ زندگی گزارتی تھی۔ جس طرح سے اس کے حقوق کو پامال کیا گیا تھا اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جنس بازار کی طرح اس کی خرید وفروخت کی جاتی تھی۔ معمولی سی شراب کی طلب اور جوئے کے داؤ پر اس کی عزت کے ساتھ کھلواڑ کیا جاتا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد بیٹا اپنی سوتیلی ماں کو اپنی ملکیت مان کر اسے اپنی زوجیت میں لے لیتا تھا۔ مگر رسول اللہؐ جو پوری نسل انسانی کے لیے سراپائے رحمت بن کر آئے، طبقۂ نسواں پر ان کے احسانات کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اب ایک ایسا وقت آیا جو عورت کے حق میں تھا۔ پورے بنی نوع انسان کو میاں بیوی کے ازدواجی رشتے کی اصلیت سے آگاہ کیا۔ میاں بیوی کا تعلق اصلاً الفت ومحبت کا تعلق ہے جس کی فطری خاصیت روحانی کشش اور جاذبیت پر مبنی ہے۔ سورۂ روم آیت 21 میں اللہ تعالیٰ ایک جگہ ارشاد فرماتا ہے:

> ''اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے بنائے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں۔''

سورۂ نساء آیت 19 میں ایک جگہ اور اللہ ارشاد فرماتا ہے:

> ''ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر تم ان کو ناپسند کرتے ہو تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناپسند ہو اور اللہ نے اسی میں بہت سی بھلائی رکھ دی ہو۔''

قرآن اس معتبر رشتے کی حقیقت کی طرف اشارہ کررہا ہے کہ یہ رشتہ صرف محبت اور خلوص کا تقاضہ کرتا ہے۔ اس رشتے میں صرف سب کچھ حاصل ہی نہیں کیا جاتا بلکہ بہت کچھ قربان کردینے کا جذبہ بھی مستغرق رہتا ہے۔ بہت بار ایسا ہوتا ہے کہ چند ایسی عادتیں بیوی کی جو شوہر کو بالکل پسند نہیں آتیں مگر وہاں شوہر کا فرض یہ بنتا ہے کہ بیوی کے اندر پوشیدہ ایسی خوبیوں کی تلاش میں لگ جائے جو یقیناً اسے بھلی لگیں کیوں کہ یہ اللہ کا ہی فرمان ہے۔ انسان خوبیوں اور خامیوں کا ہی اجماع ہے۔ غور و فکر کرنا عقل مند انسانوں کا ہی وطیرہ ہے اس لیے عقل مندی اسی میں ہے کہ بیوی کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا جائے۔ اپنی بیوی کے ساتھ بہتر برتاؤ بہترین ایمان کا ضامن بھی ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''مجھے خوشبو اور بیویاں دونوں مرغوب ہیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔'' رسول اللہؐ نے بیوی کے ساتھ بہتر برتاؤ روا رکھنے کے لیے بہت بار تلقین کی۔ آپؐ فرماتے ہیں:

> ''ایمان والوں میں سب سے کامل ایمان اس شخص کا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں اور تم میں بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے حق میں بہتر ہوں۔'' (ترمذی)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: یہ دنیا زندگی گزارنے کا سامان ہے۔ اس کی بہترین سامان صالح عورت ہے۔ (ابن ماجہ)

شادی کے متعلق عورت کو مختلف حقوق سے نوازا گیا ہے۔ اس کا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ اپنے لیے سب سے بہترین مرد کا انتخاب کرے۔ ثابت بنانی کہتے ہیں کہ میں حضرت انسؓ کے پاس تھا، ان کے پاس ان کی بیٹی بھی تھی، حضرت انسؓ نے کہا کہ ایک عورت نبی کریمؐ کے پاس آئی اور اس نے نبی کریمؐ کے لیے اپنی ذات کی پیشکش کی، اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ کیا آپ کو میری ضرورت ہے؟ اس پر حضرت انسؓ کی بیٹی نے کہا کہ وہ کتنی بے حیا تھی، ہائے افسوس، ہائے افسوس، حضرت انسؓ نے کہا کہ وہ تم سے بہتر تھی اس کو نبی کریمؐ کی ذات میں دلچسپی ہوئی تو اس نے اپنے آپ کو نبی کریمؐ کے لیے پیش کردیا۔ (بخاری)

ازدواجی زندگی کو لے کرعورت کا دوسرا حق، شوہر اگر کسی بھی پہلو سے بیوی کو ناپسند آئے یا بیوی اس کے ساتھ نہ رہنا چاہے تو وہ اپنی مرضی سے شوہر کو چھوڑ سکتی ہے۔ جس طرح اسلام نے مرد کو طلاق کا حق دیا ہے اسی طرح بیوی کو بھی خلع کے حق سے نوازا ہے۔ اس کی دلیل میں یہ آیت قرآنی پیش کی جاتی ہے:

''پس اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود قائم نہ رکھ سکیں گے تو (اندریں صورت) ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ بیوی (خود) کچھ بدلہ دے کر (اس تکلیف دہ بندھن سے) آزادی حاصل کر لے۔'' (سورۂ بقرۂ آیت 229)

مہر عقدِ نکاح کا لازمی جز مانا گیا ہے۔ یہ وہ رقم ہے جو عقد نکاح کے بعد بیوی کو متمتع ہونے کے عوض میں مرد کی جانب سے دیا جاتا ہے۔ یہ مال یا تو نکاح کے وقت زوجہ کو فوراً دے دیا جاتا ہے جسے مہر معجّل کہتے ہیں، یا بعد میں دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے جسے مہر موٴجل کہتے ہیں۔ شادی کے بعد مباشرت سے قبل اگر بیوی کو طلاق دے دی جائے تو مہر کی قیمت آدھی ہو جاتی ہے۔

اسلام نے عورت کو یہ حق دیا ہے کہ طلاق کے بعد عدت کے دوران اگر اس کا شوہر انتقال کر جائے تو اس کے ترکہ سے اسے میراث ملے گی، جس طرح غیر مطلقہ بیوی کو ملتی ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ جب تک اس طلاق شدہ بیوی نے دوسری شادی نہ کی ہو، عدت کے بعد بھی میراث میں حصہ ملے گا۔ بیوی کا ایک اور حق حضانت کا حق ہے۔ بچے کی تربیت اور اس کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے اس کی نگرانی حضانت کہلاتی ہے۔ رسول اللہؐ نے حضانے کا حق اس کی ماں کو عطا کیا۔ ماں کے بعد ماں کی ماں یعنی بچے کی نانی کو دیا۔ اور پھر باپ کو پھر باپ کی ماں کو عطا کیا۔ ایک حدیث ملاحظہ ہو:

''عبداللہ ابن عمرو سے روایت ہے کہ ایک عورت نے آپؐ کی خدمت میں عرض کیا، یارسول اللہؐ! یہ میرا بچہ ہے میرا پیٹ اس کا برتن تھا، میرے پستان اس کے مشکیزے اور میری گود اس کی آرام گاہ، اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے اور اسے مجھ سے چھیننا چاہتا ہے، تو رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اس کی زیادہ مستحق تو ہے، جب تک تو نکاح نہ کر لے۔'' (ابوداوٗد)

اسلام نے بعض شرائط کے ساتھ ایک وقت میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت دی ہے، جس کی حد چار بیویوں تک مقرر کی گئی ہے۔ اس کے لیے لازمی طور پر یہ شرط بھی عائد کردی گئی ہے کہ بیویوں کے درمیان عدل وانصاف قائم رکھنا ہوگا تاکہ کوئی بیوی کسی قسم کی محرومی کا شکار نہ ہو جائے اور اگر کہیں ایسا محسوس ہو کہ سب کے درمیان مساوی سلوک روا نہیں رکھا جا سکتا ہے تو پھر ایک سے زائد نکاح کرنے سے پرہیز کیا جانا چاہئے۔ سورۂ نسا، آیت۔3 میں اللہ نے ارشاد فرمایا:

''اگر تم کو ڈر ہو کہ ان میں برابری قائم نہ رکھ سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی رکھ سکتے ہو یا ایک باندی۔''

آج کا روشن خیال حال اس سچائی کا بہتر شعور رکھتا ہے کہ مرد اساس سماج نے اپنی سہولت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مذہبی قوانین میں تصرّف پیدا کردیا ہے۔ باندیوں کے متعلق بھی قرآنی احکامات اپنے مفاد کے حساب سے استعمال کیے جاتے ہیں۔ لونڈیوں کے بارے میں قرآن میں کئی ایک جگہ وضاحت کی گئی ہے:

''اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کرسکو گے تو ان خواتین سے نکاح کرو جو تمہارے لیے پسندیدہ اور حلال ہوں۔ دو دو اور تین تین اور چار چار پھر اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل نہیں کرسکو گے تو صرف ایک ہی خاتون سے یا وہ کنیزیں جو تمہاری ملکیت میں آئی ہوں۔'' (النساء،۴:۳)

''اور تم میں سے جو کوئی استطاعت نہ رکھتا ہو کہ آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کر سکے تو اُن مسلمان کنیزوں سے نکاح کر لے جو تمہاری ملکیت میں ہیں۔'' (النساء،۴:۲۵)

اللہ نے قرآن کریم میں اجازت تو دے رکھی ہے کہ جس طرح تمہیں اپنی بیوی کے پاس جانے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی اسی طرح شرعاً تمہاری ملکیت میں آنے والی لونڈی پر تمہارا پورا حق ہے، اس سے لذت اٹھانے میں تمہیں کوئی شرمندگی

محسوس نہیں ہونی چاہیے۔مگر یہاں باندی کے معنی اوراس سے مالک کےلذت اندوز ہونے کی شرطوں کوسمجھ لیناضروری ہے۔ لونڈی، غلام، اسلام کے دورِاوّل میں یاتو وہ لوگ تھے جومعاشرے میں صدیوں سے غالب طبقے کی مغلوبیت میں غلامی کی زندگی جیتے آرہے تھے،جن کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک ہوا کرتا تھا،جن کے پاس کوئی اختیارنہیں تھا،بازار میں ان کی بولی لگائی جاتی تھی،ان کوخریدنے والے ان کے مالک ومختار آقا بن جاتے تھے جوانہیں ہرطرح سے استعمال میں لاتے تھے،اس طرح لونڈی وغلام کاایک الگ نچلا طبقہ معاشرے میں موجود تھا جواپنے غالب طبقے کے ذریعہ اتنادبایا کچلا گیاتھا کہ سماج میں اس کی حیثیت نہ کے برابر رہ گئی تھی،اس غلامی کی لعنت کواسلام نےختم کیااورکسی آزادکوزرخرید غلام بنانا گناہِ کبیرہ قراردیا۔اس طرح سےاسلام نے ایسی غلامی کا خاتمہ کیا۔

ایک اورطرح کی لونڈی اورغلام کا بھی رواج تھا۔یہ وہ لوگ تھے جن سے مسلمانوں نے جہادکی شکل میں جنگیں لڑیں اور فتح حاصل کیں۔ان میں جنگی قیدی کا مسئلہ بھی سامنے آیا۔قیدیوں کا تبادلہ نہیں کیا جاسکتا تھا کیوں کہ مسلمانوں میں کوئی بھی کافروں کےقیدی نہیں ہوئے تھے۔یہاں قرآن پھرایک حکم صادر کرتا ہے:

”جب ان کواچھی طرح کچل ڈالوتو اب خوب مضبوط قیدوبند سے گرفتار کرو(پھراختیار ہے) کہ خواہ احسان رکھ کرچھوڑدویافدیہ لےکر۔“(سورۃ محمد،۴۷:۵)

مگرکبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ان غلاموں کے پاس بطورفدیہ دینے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تھا۔اوردوسری صورت کہ ان پر احسان کر کے چھوڑدینا بھی کبھی کبھی نقصان دہ ثابت ہوتا کہ وہی لوگ آزادہوکرپھرترقیِ اسلام میں راہ کی رُکاوٹ بن جاتے۔ ان غلاموں میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے تھے جوواپس جانے سے انکار کرتے تھے۔ایسی حالت میں انہیں قتل کرنے کا بھی کوئی حکم نہیں تھا کہ انہیں اسلام کی طرف سے امان مل چکا تھا۔اب انہیں جان و مال،عزت ومذہب کاتحفظ دینا مسلمانوں کا فرضِ عین تھا۔ایک طریقہ یہ ہوسکتا تھا کہ انہیں لونڈی یاغلام بنا کرسر چھپانے کے لیے گھر،عزت ڈھانکنے کے لیے کپڑا اوربھوک مٹانے کے لیے کھانا فراہم کیا جائے۔ان سےصرف نوکروں جیسا کام لے سکتے ہیں۔اور جو بیوہ،کنواری بالغ لڑکیاں ہیں ان سے وہ شخص جوان کا شرعاًمالک ہے،متمتع ہوسکتا ہے اور چاہےتو موقع ومحل کی مناسبت سے انہیں آزادکر کے ثوابِ دارین حاصل کرسکتا ہے۔ان دونوں صورتوں میں اصل مقصدان کاتحفظ ہی ہے۔ایسے غلاموں کےساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا اسد ضروری قراردیا گیا تھا۔ارشادنبویؐ ہے(صحیح بخاری،ا:۳۴۶):

”بیشک تمہارے بھائی تمہارے خدمت گار ہیں جن کواللہ نے تمہارازیردست کردیا،سوجس کا بھائی اس کا زیردست(ماتحت)ہوتو اس کووہی کھانا کھلائے جوخودکھاتا ہےاوروہی لباس پہنائے جیسے خود پہنتا ہےاور ان کی طاقت سےزیادہ کی تکلیف نہ دوپھراگران کوان کی طاقت سےزیادہ کی تکلیف دوتو خودبھی ان کی مدد کرو۔“

آپؐ کی ان باتوں سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان غلاموں کے ساتھ اسلام نے کس طرح کا سلوک روا رکھنے کا حکم دیا ہے۔نہ آج ایساغلامانہ طبقہ موجود ہےاورنہ ہی اس طرح کی جنگیں لڑی جاتی ہیں،تو پھرآج کے معاشرے میں ایسے غلاموں کا تصوّربھی نہیں کیا جاسکتا۔لونڈی وباندی کےحق میں قرآن کی ان آیتوں کوجنسی بھوک مٹانے کی صورت میں استعمال کرنا گناہِ عظیم ہے۔

اسلام ایک ایسامذہب ہےجس کی ابتداء ہی لفظ”اقراء“ سے ہوئی ہے۔غارِحرا میں حضوراقدسؐ پر جوسب سے پہلی وحی نازل ہوئی اس سورت کا پہلالفظ”اقراء“ ہےجس کے معنی پڑھنے کے ہیں۔حضوراکرمؐ کی نبوت کا آفتاب جس قوم میں طلوع ہوا وہ ایک ”اُمّی“(انپڑھ)قوم تھی۔اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلےلفظ”اقراء“ کے ذریعے پڑھنے یاعلم حاصل کرنے کی تاکید فرمائی کہ جس کے باعث قوم جہالت کی تاریکی سے باہرنکل کرعلم کی روشنی کے ذریعے اس دنیا کو بنانے والی ذاتِ باری تعالیٰ

سے شناسائی حاصل کر پائے۔قرآن مجید کی جو سب سے پہلی آیات نازل ہوئیں وہ سورۂ علق کی پہلی پانچ آیات ہیں۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ۔خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ۔الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ۔''(سورۂ علق' آیت:1۔5)

ترجمہ:''پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا' آدمی کو خون کی پھٹک سے بنایا، پڑھو اور تمہارا رب ہی سب سے بڑا کریم ہے جس نے قلم سے لکھنا سکھایا' آدمی کو اس بات کی تعلیم دی جو وہ نہ جانتا تھا۔''

قران نے علم کی فضیلت اور اہمیت پر زیادہ سے زیادہ روشنی ڈالی۔ایک اور جگہ اللہ ارشاد فرماتا ہے:

''یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ۔''(سورۃ المجادلہ' آیت 11)

ترجمہ:''تم میں جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جن کو علم بخشا گیا ہے ان کو بلند درجہ عطا فرمائے گا۔''

قرآنِ کریم میں اللہ علم حاصل کرنے والے کے درجے کو بلند کرنے کا وعدہ فرماتا ہے۔ایک اور جگہ عالموں کو جاہلوں پر ترجیح دیتے ہوئے فرماتا ہے:

''قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ۔''(سورۃ الزمر' آیت:9)

ترجمہ:''کہہ دو کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں۔''

قرآنِ مجید میں علم پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ 'علم' اور اس کے ہم معنی الفاظ کا استعمال سینکڑوں مرتبہ لایا گیا ہے۔آپ ﷺ نے جنگِ بدر کا پہلا فدیہ یہ مقرّر کیا تھا کہ جو لوگ پڑھنا لکھنا جانتے ہوں وہ دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر:22):

''ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ایک حجرہ مبارک سے باہر نکلے اور مسجد میں تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ وہاں دو حلقے ہیں، ایک حلقے کے لوگ قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے اور اللہ سے دعائیں مانگ رہے تھے۔دوسرے حلقے کے لوگ علم سیکھنے اور سکھانے میں مشغول تھے۔نبیؐ نے فرمایا:''سب لوگ نیکی میں مشغول ہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو انہیں (ان کی مطلوبہ چیزیں) دے دے گا اور اگر چاہے تو نہیں دے گا، اور یہ لوگ علم سیکھ رہے ہیں اور سکھا رہے ہیں اور مجھے بھی علم سکھانے والا بنا کر بھیجا گیا ہے' چناں چہ آپؐ اُن کے ساتھ بیٹھ گئے۔''

علم اور اہلِ علم کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے علم اور علماء کو اپنا وارث بنایا۔مکّہ میں اتنی دشواریوں کے باوجود اپنے ایک جاں نثار صحابیؓ کے مکان ''دارِ ارقم'' کو جو صفا کی چوٹی پر واقع تھا، تعلیمی و تربیتی مرکز بنایا۔اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جس نے خاتون اور مرد میں تخصیص نہیں کی۔اور علم کے میدان میں دونوں کے لیے تعلیم حاصل کرنا اہم فریضہ قرار دیتا ہے۔آپؐ فرماتے ہیں:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ۔(سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر:224)

ترجمہ:''حصولِ علم ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔''

نبی پاک ﷺ نے سورۂ نور کی ابتدائی آیات کے متعلق فرمایا:

فَتَعَلَّمُوْھُنَّ وَعَلِّمُوْھُنَّ نِسَآئَکُمْ۔(سنن دارمی)

ترجمہ:''تم خود بھی ان کو سیکھو اور اپنی خواتین کو بھی سکھاؤ۔''

اسلام کی آمد سے پہلے دورِ جہالت میں خاتون اپنے تمام حقوق سے محروم تھی۔تعلیم حاصل کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔مگر اسلام نے خاتون کو ایک اعلیٰ و ارفع مقام سے نوازا اور حصولِ علم اور درس و تدریس میں اُسے مردوں کے برابر

حقوق عطا کیے۔ علم حاصل کرنا مردوں کی طرح خواتین کے لیے بھی فرضِ عین قرار دیا۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں آپ کا ارشاد ہے:

''جس شخص کے پاس لونڈی ہو وہ اس کو بہترین تعلیم دے اور بہترین آدابِ زندگی سکھائے، پھر اس کو آزاد کر کے خود ہی اس سے شادی کر لے تو ایسے شخص کو دوہرا ثواب ملے گا۔ ایک اس کو اعلیٰ تعلیم و تربیت دینے اور تہذیب و شائستگی سکھانے کا۔ دوسرا اس کو آزاد کر کے اس سے نکاح کرنے کا۔''

جس مذہب میں لونڈی کے حق میں ایسی شاندار روایت موجود ہے وہاں عام خواتین کی اعلیٰ تعلیم و تربیت میں کس قدر سختی سے حکم عائد کیا گیا ہوگا۔ آپؐ نے ہفتہ میں ایک دن صرف خواتین کی تعلیم و تربیت کے لیے مخصوص کیا تھا۔ اس دن آپؐ کی خدمت میں خواتین حاضر ہوتیں اور آپؐ سے مختلف قسم کے مسائل پوچھتیں۔ آپؐ نے امہات المومنینؓ کو بھی حکم دے رکھا تھا کہ وہ خواتین کو دینی مسائل سے روشناس کرائیں۔ آپؐ نے تمام ازواجِ مطہراتؓ کو تلقین کی تھی کہ: مجھے جو کام کرتے دیکھو عام مسلمانوں تک پہنچاؤ، اس لیے تمام ازواجِ مطہراتؓ سے احادیثِ نبوی منقول ہیں۔ حضرت عائشہؓ علومِ دینیہ کی ماہر تھیں۔ صحابہؓ کے سامنے جب کوئی مشکل مرحلہ درپیش آتا تو انہیں کی طرف رجوع کرتے اور آپؓ پردے میں رہ کر حل فرما دیتیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، خطابت اور ادب میں مہارت رکھتی تھیں۔ کل دو ہزار دو سو دس (2210) احادیث آپؓ سے مروی ہیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

''حضرت عائشہؓ سے زیادہ علم فرائض اور فقہ اسلامی سے آگاہ کسی کو نہیں پایا۔''

امہات المومنینؓ کے علاوہ دیگر خواتین نے بھی علم حدیث میں گراں قدر خدمات انجام دیا ہے۔ مثلاً بصرہ کی ایک کنیز علیہ بنت حسّان بڑی عالمہ فاضلہ خاتون تھیں۔ بصرہ کے علماء اور فقہاء ان سے فیض حاصل کرنے آتے تھے۔ امِ محمد زینب بنتِ احمد بغدادی علم حدیث میں ماہر تھیں۔ جس شہر میں جاتیں وہاں ایک مدرسہ قائم کر دیتیں۔ مسلم خواتین کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ انہوں نے روایات سنانے اور درس دینے کے علاوہ باقاعدہ تصنیف و تالیف کا کام بھی انجام دیا۔ عجیبہ بنتِ حافظ بغدادیہ نے اپنے اساتذہ اور شیوخ کے حالات اور ان سے حاصل کردہ احادیث پر دس جلدوں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ فاطمہ خاتون بنتِ محمد اصفہانیہ کی ایک کتاب ''الرُّمُوزُ مِنَ الکُنُوزِ'' پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ جناب مولانا سیّد انصاری اپنی کتاب ''سیرت الصحابیات'' میں لکھتے ہیں کہ:

''صحابیات طب اور جراحی میں بھی ماہر تھیں۔ رُفیدہ اَسلیمہ، اُم مطاع، اُم کبشہ، حمنہ بنت جحش، معاذہ لیلیٰ، اُمیمہ، اُم زیاد ربیع بنت معوذ، اُم عطیہ، اُم سلیم رضی اللہ عنہن کو زیادہ مہارت تھی۔ رفیدہؓ کا خیمہ تھا جس میں جراح خانہ بھی تھا جو مسجد نبویؐ کے قریب تھا۔ شاعری میں خنساء، سعدی، عاتکہ، اُم مریدیہ، ہند بنت حارث، زینب بنت عوام اَروی عاتکہ بنت زید، اُم ایمن نُعم، رقیہ رضی اللہ عنہن زیادہ نامور ہیں۔ خنساء کا جواب آج تک عورتوں میں نہیں پیدا ہوا ان کا دیوان بھی چھپ گیا۔''[4]

اس کے علاوہ صحابیات صنعت و حرفت میں بھی مہارت رکھتی تھیں۔ عہدِ نبوی میں حضرت خدیجہؓ تجارت کے میدان میں ایک ایسی خاتون تھیں جن کی مثال ہی نہیں ملتی۔ آپؐ کی پھوپھی اروٰی بنت عبدالمطلب شاعرہ تھیں۔ خنساء بنت عمرو السلمیہ سے آپؐ شعر سنا کرتے تھے۔ حضرت زبیر کی بہن زینب بنتِ العوام بھی شاعرہ تھیں۔ آپؐ کی رضاعی بہن شیماء بنت حارث بھی شاعرہ تھیں۔ یہ بچپن میں آپؐ کے لیے جھوم جھوم کر یہ شعر پڑھا کرتی تھیں:

یا ربنا ابقی لنا محمدا ☆ حتی اراہ یا فعادا امردا

ثم اراہ سیدا مسودا ☆ اکبت اعادیہ معاو الحسدا

و عاطہ عزا یدوم ابدا

ترجمہ: ''اے ہمارے رب ہمارے لیے محمدؐ کو باقی رکھ۔ حتیٰ کہ میں اسے خوبصورت نوجوان دیکھوں۔ پھر میں اسے سردار بنتا دیکھوں میں اس کے دشمنوں اور حاسدوں کو ایک ساتھ پچھاڑ دوں اور اسے عزّت دے جو ہمیشہ رہے۔''[41]

طالب الہاشمی اپنی کتاب ''تذکرہ صحابیات'' میں لکھتے ہیں:

''صحابہؓ کی طرح دیگر علوم وفنون میں صحابیات کا بھی حصّہ رہا ہے۔ اس کے علاوہ وہ زبان وادب میں بھی حصّہ لیتی رہی ہیں۔ حضرت عائشہؓ قرآن وحدیث، فقہ وفتاویٰ، طب۔۔۔ شعر وسخن اور زبان وادب میں ماہر تھیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے لبید شاعر کے تقریباً ایک ہزار اشعار محفوظ کیے ہیں۔ عروہ بن زبیرؓ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے زیادہ اشعار میں ماہر نہیں دیکھا۔''[42]

غرض اسلام میں خواتین کے لیے علوم اسلامی کے علاوہ دیگر میدانوں میں بھی علم حاصل کرنے کی اجازت ہے۔ کیوں کہ اسلام نے خواتین کو تعلیم حاصل کرنے سے نہیں روکا۔ ایک روایت میں آپؐ نے ارشاد فرمایا:

''جس کے پاس ایک بیٹی ہو وہ اس کو ادب سکھائے اچھا ادب سکھائے اس کو تعلیم دے اور اچھی تعلیم دے۔ اللہ تعالیٰ نے جن نعمتوں کو اس پر کشادہ کر رکھی ہیں وہ بھی ان نعمتوں کو اس پر کشادہ کرے وہ بیٹی اس کے لیے جہنّم سے پردہ اور رکاوٹ بن جائے گی۔'' (رواہ الطبرانی، حدیث 139)

المختصر جہاں تک ہم نے دیکھا تعلیم لڑکوں کی طرح لڑکیوں کا بھی بنیادی حق ہے، حضرت محمدؐ نے لڑکیوں کی تعلیم پر بہت زور دیا ہے۔ آپ لڑکیوں کی تعلیم وتربیت، ان کی دیکھ بھال اور ان سے حسنِ سلوک پر جنّت کی بشارت دی ہے۔ یہاں تک ہم نے دیکھا کہ آپؐ نے باندیوں تک کو علم وادب سکھانے کا حکم دیا تا کہ معاشرے کا کوئی بھی طبقہ ان پڑھ اور جاہل نہ رہے۔ آپؐ نے کبھی والدین کو مخاطب کر کے انہیں لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کی طرف توجہ دلائی تو کبھی شوہروں کو تاکید کی کہ اپنی بیویوں کو قران کے مخصوص حصّوں کی تعلیم دیں۔ آپؐ کی اس توجہ کا نتیجہ تھا کہ خواتین کی ایک بڑی تعداد علم وادب سے واقفیت رکھتی تھی۔ صحابیات اور بعد کے ادوار کی خواتین کی ایک لمبی فہرست ہے جو قرآن وحدیث کا گہرا علم رکھتی تھیں، شاعرہ اور ادیبہ بھی تھیں، طب میں بھی خاصی مہارت حاصل تھی اور فصاحت وبلاغت میں بھی اپنی مثال آپ تھیں۔

عہدِ حاضر میں اگر مسلم معاشروں میں لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کی طرف پورے انہماک کے ساتھ توجہ نہیں دی جا رہی ہے تو یہ اسلامی تعلیم کی طرف سے لاپرواہی کا نتیجہ ہے۔ والدین کو چاہیے سب سے پہلے اپنی لڑکیوں کی تعلیم کی فکر کریں۔ لڑکیوں کے لیے دینی اور دنیاوی دونوں تعلیم حاصل کرنی ضروری ہے۔ زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھتے رہنے اور دین کی اشاعت کے لیے آج کے ترقّی یافتہ دور میں عصری علوم حاصل کرنا اسد ضروری ہے۔ آج کی عورتوں کے سامنے صحابیاتؓ کی زندگی کی بے مثل تاریخ موجود ہے، ان کے علمی کارناموں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے آج کی عورتوں کو چاہیے کہ ہر طرح کے علوم سے استفادہ حاصل کریں تا کہ صرف ایک خاندان ہی نہیں اور نہ ہی صرف ایک معاشرہ بلکہ پوری قوم کی بہترین تربیت ہو سکے۔ اپنے اس باب کا خاتمہ جیلانی بانو کے ایک نظمیہ افسانہ ''او کالے برقعے والی لڑکی۔۔۔'' سے کروں گی جس کا دھاردار کٹیلا طنزیہ لہجہ سیاہ برقعے کے پیچھے چھپی فرسودہ روایت کی کریہہ شکل کو خون خون کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے:

او کالے برقعے والی لڑکی! / کالے حصار میں قید رہو / کالی نقاب میں منہ چھپالو / اوپر مت دیکھو۔۔۔ / اس کالی رات کا انت کہیں نہیں ہے / مگر اپنی آنکھیں کھلی رکھنا / ان آنکھوں سے صرف ''بہشتی زیور'' پڑھنا ہے تمہیں / وفا، ایثار اور صبر کے سب سبق یاد رکھنا ہے تمہیں / اگر ''وہ'' بے چارے تم پر پہلی نظر ڈال کر / اپنی نگاہ نہیں جھکا سکے / تو انہیں دوسری نگاہ ڈالنے کے عذاب سے بچاؤ / اپنے چہرے پر کالی نقاب ڈال لو / تمہارا چہرہ شاعروں، فن کاروں کا موضوع سخن ہے / تم نہیں ہو۔۔۔ / نہ۔۔ / اُس کتاب کی طرف ہاتھ مت

بڑھانا/علم۔۔ادب۔۔سائنس اور سیاست۔۔؟/اگر تم نے یہ کتاب کھولی تو / ایک ڈرامہ شروع ہو جائے گا۔ /اور پھر یہ ڈرامہ دکھلائے گا کیا سین۔۔؟/''پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ''/اس لیے۔۔۔/گردن جھکا کر زمرد کا گلوبند دیکھو۔۔/ یہ تمہاری وفا،ایثار اور رضا کا انعام ہے/ کبھی کالی نقاب کو اُٹھانے کی جرائت مت کرنا/ ورنہ۔۔۔!/''اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ جائے گا''/او کالے برقعے والی لڑکی۔۔۔!

☆☆☆

ہندوستانی آئین اور اس کے تحت روبہ عمل اسکیمیں
(حقوق نسواں)

اس عالم میں ہر شے ایک نظام کے تحت سرگرداں عمل ہے۔ دُنیا اپنے محور پہ طے شدہ رفتار میں رواں دواں ہے۔ شمس وقمر اپنے وقت کے ساتھ طلوع وغروب ہوتے ہیں۔ شب وروز اپنے مقرر کردہ اوقات سے تجاوز نہیں کر سکتے۔ ہر ایک موسم اپنے طے شدہ وقت میں ہی دُنیا کو اپنی منفرد کیفیات کا احساس کراتا ہے۔ تخم سے پیڑ بننے تک کے نظام کے نظم وضبط میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔ نطفے سے انسان، جانور، چرند، پرند بننے تک کا عمل معین کردہ قانون کے تحت ہی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ عالم کا ایک ایک ذرّہ طے شدہ قوانین کی ہی پیروی کرتا ہے، نتیجتاً دُنیا پوری آب وتاب کے ساتھ ایک منظّم پیرائے میں مقرر کردہ رفتار میں گردش کر رہی ہے۔ اس نظام عمل میں حرف برابر بھی بے قاعدگی پیدا ہوئی تو سب کچھ تہہ و بالا ہو جائے گا۔ یہ تو ہیں فطری قوانین جس میں انسانی شعور کی کاریگری کا کوئی دخل نہیں ہے۔ مگر اس فطری دُنیا میں رہنے والا یہی باشعور ومہذب انسان دُنیا کے نظم وضبط کے ساتھ توازن برقرار رکھتے ہوئے منظّم، متوازی ومہذب معاشرے کی بنیاد ڈالتا ہے جس کا آئینی طور طریق اُسے حیوانوں کی دُنیا سے الگ کر کے عالمِ حیات کا قاعدِ اعظم بنا دیتا ہے۔ اس طرح سے ایک با قاعدہ انسانی معاشرہ وجود میں آتا ہے جس میں مخصوص علاقوں کے مخصوص تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قوانین تحریر کیے جاتے ہیں۔ ہر ملک مرد، عورت، بچے، بوڑھے، معذور، خواجہ سرا وغیرہ انسانی وجود کے حقوق کا درواکرتے ہوئے ایک مہذب معاشرتی نظام کے تعمیری عمل میں درپیش آنے والے شرائط کو فرائض کی شکل میں انسان کی روزانہ زندگی میں واجب العمل قرار دیتا ہے۔ ان قوانین کے منکر کو مجرم قرار دیتے ہوئے سزا کا مستحق ٹھہراتا ہے۔ ان قوانین میں دیگر افراد کی طرح عورت کے لیے بھی حقوق وفرائض تفصیل و وضاحت کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ ان کی فلاح و بہبودی کے لیے نہ صرف بین الاقوامی سطح بلکہ ملکی حکومت کے تحت بھی بہت سارے قوانین بنائے گئے ہیں۔ چونکہ میرا مقالہ خصوصاً علاقائی اعتبار سے ہندوستان پر ہی مبنی ہے اس لیے صرف ہندوستان کے آئین میں درج عورت سے متعلق قاعدے وقوانین کو شامل کیا گیا ہے، جو درج ذیل ہیں:

ہندوستانی آئین:

کسی بھی قانون کی تمہید (Preamble) میں اصل دفعات اور اس قانون کے نفاذ کی ضرورت اور اس کے مقاصد بیان کیے جاتے ہیں۔ ہندوستانی قانون کی تمہید میں مرد وعورت کے درمیان مساوی حقوق کا اعلان نامہ واضح ہے۔ تمہید ملاحظہ کیجیے:

تمہید

> ''ہم بھارت کے عوام، بھارت کو ایک مقتدر سماج وادی سیکولر عوامی جمہوریہ بنانے کے لیے، اور اس کے تمام شہریوں کو:
>
> سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف،
>
> خیال، اظہار، عقیدہ، مذہب اور عبادت کی آزادی،
>
> بہ اعتبار حیثیت اور موقع مساوات
>
> حاصل کرانے کے لیے،

اور ان سب کے مابین
فرد کی عظمت اور قوم کے اتحاد
اور سالمیت کو یقینی بنانے والی اخوت
کو فروغ دینے کے لیے
متانت وسنجیدگی سے عزم کرتے ہوئے اپنی آئین ساز اسمبلی میں آج مورخہ 26 نومبر 1949ء کو ذریعہ ہذا اس آئین کو اختیار کرتے ہیں، وضع کرتے ہیں اور اپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں۔''

ہندوستانی آئین کی تمہید (Preamble) ہی اس کی شاہد ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسی جمہوری حکومت کا قیام مقصود ہے جس میں سبھی لوگوں کو مذہبی آزادی، آزادئ خیال وحق مساوات حاصل ہو اور ان کے ساتھ زندگی کے ہر شعبہ میں انصاف کیا جائے۔ انصاف میں معاشرتی، معاشی اور سیاسی انصاف بھی شامل ہے۔ یہاں جنسی یا صنفی امتیازات کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ علاوہ ازایں چند دفعات پر غور کرتے ہیں جو اسی بنیادی نقطے کو فروغ دیتے ہیں۔

دفعہ 14۔ ''قانون کی نظر میں مساواتِ مملکت کسی کو بھارت کے علاقہ میں قانون کی نظر میں مساوات یا یکساں قانونی تحفظ سے محروم نہیں کرے گی۔'' مذکورہ دفعہ جنسی مساوات کو بھی یقینی بناتی ہے۔ قانون کی نظر میں مرد اور عورت برابر ہیں اور سب کو مساوی قانونی تحفظ حاصل ہے۔ رفیق بنام ریاست اتر پردیش والے معاملہ (1980) 4 ایس سی سی 262، میں سپرم کورٹ نے اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ کوئی بھی باعزت عورت یہ الزام نہیں لگا سکتی کہ اس کے ساتھ زنا بالجبر کیا گیا ہے۔ پرمود مہتو بنام ریاست بہار والے معاملہ (1989) 2 سپلیمنٹری ایس سی سی 286، میں سپرم کورٹ نے کہا تھا کہ جہاں تک عورت کی عصمت اور جھوٹ بولنے کی بات ہے تو یہ ایک ایسی بات ہے کہ جس پر فرقہ وارانہ یا مذہبی تعصب بھی غالب نہیں آسکتا۔ کوئی بھی غیر شادی شدہ عورت اپنی عزت کو بالائے طاق رکھ کر محض فرقہ وارانہ یا مذہبی مفادات کی خاطر یہ الزام نہیں لگا سکتی کہ اس کے ساتھ زنا بالجبر کیا گیا ہے۔ ریاست مہاراشٹر بنام چندر پرکاش کیول چند جین والے معاملہ (1990) 1 ایس سی سی 550، میں سپرم کورٹ نے اس بات کو پھر دہرایا ہے کہ ہر ہندوستانی خاتون اپنی عزت، آبرو کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہے اور وہ آسانی سے ایسی کوئی بات نہیں کہہ سکتی جس سے اس کی عزت وآبرو پر آنچ آئے۔ وشاکھا اور دیگر بنام ریاست راجستھان والے معاملہ (1997) 2 ایس سی سی 241، میں بھی پہلی بار اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ عورت کی عصمت کا تحفظ اس کا بنیادی حق ہے۔ اس فیصلے کے تحت سپرم کورٹ نے سرکاری اور غیر سرکاری ایسے تمام اداروں کو جہاں پر عورتیں ملازمت کرتی ہیں، یہ ہدایات جاری کی ہے کہ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ عورتوں کے ساتھ کسی قسم کا امتیاز نہ برتا جائے، کمیٹیاں بنائی جائیں تا کہ عورتوں کا جنسی ودیگر طور پر استحصال نہ ہو سکے۔ وال سمّا پال بنام کوچین یونیورسٹی والے معاملے اے آئی آر 1996 ایس سی 101، میں بھی سپرم کورٹ نے یہ فیصلہ سنایا کہ عورتوں کے ساتھ جنسی بنیاد پر اگر کوئی امتیاز برتا جاتا ہے تو اس سے بنیادی آزادی اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ مدھو کشور بنام ریاست بہار والے معاملے اے آئی آر 1996 ایس سی 1864 میں سپرم کورٹ نے عورتوں کے ساتھ کسی بھی طرح کا امتیاز ختم کرنے سے متعلق کنونشن (CEDAW) 989 کی توضیعات پر غور کیا تھا اور یہ فیصلہ دیا تھا کہ وہ بنیادی حقوق اور ہدایتی اصولوں کا لازمی جز ہے۔ ان ساری توضیحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہندوستانی قوانین کے دفعہ 14 کو مدنظر رکھتے ہوئے سنائے گئے فیصلے بھی جنسی مساوات کو ہر ایک معاملے میں ترجیح دیتے ہیں۔

دفعہ 15۔ **مذہب، نسل، ذات یا جنس یا مقام پیدائش کی بنا پر امتیاز کی ممانعت**۔ دفعہ 15(1) اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ مملکت محض مذہب، نسل، ذات، جنس یا مقام پیدائش یا ان میں سے کسی کی بنا پر کسی شہری کے ساتھ امتیاز نہیں برتے

گی۔(3)اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ اس آئین میں کوئی امر اس میں مانع نہ ہوگا کہ مملکت عورتوں اور بچوں کے لیے کوئی خاص توضیع کرے۔

دفعہ 39(الف)۔**مساویانہ انصاف اور مفت قانونی امداد**۔اس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ قانونی نظام پر ایسا عمل درآمد ہو جس سے مساوی مواقع فراہم کرتے ہوئے انصاف کو فروغ ہو اور بالخصوص مناسب قانون سازی سے یا اسکیمیں مرتب کر کے یا کسی دیگر طریقے سے مفت قانونی امداد اس طرح فراہم کی جائے جس سے اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ معاشی یا دیگر نااہلیتوں کی بنا پر کسی شہری کو انصاف حاصل کرنے کے حق سے محروم نہیں رکھا گیا ہے۔یعنی مرد اور عورت یعنی ہر شہری کو مساوی طور پر ذرائع معاش کا حق حاصل ہوگا۔اسی دفعہ کے فقرہ (ہ) میں یہ بات کہی گئی ہے کہ عورتوں اور بچوں (جن میں بچیاں بھی شامل ہیں) کا استحصال نہیں کیا جائے گا اور نہ ان سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھایا جائے گا اور شہری معاشی ضرورت سے،کوئی بھی ایسا کام کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا جو ان کی عمر یا طاقت کے لیے مناسب نہ ہو۔فقرہ (و) میں یہ اعادہ کیا گیا ہے کہ انہیں آزادا ور پُر وقار ماحول میں پڑھنے کے مواقع اور سہولتیں فراہم کی جائیں گی اور بچپن اور جوانی میں استحصال اور اخلاقی و مادی بے اعتنائی سے محفوظ رکھا جائے گا۔

دفعہ 51(الف)۔بنیادی فرائض کے فقرہ (ہ) میں یہ بات کہی گئی ہے کہ بھارت کے ہر شہری کا یہ فرض ہوگا کہ مذہبی،لسانی اور علاقائی وطبقاتی تفرقات سے قطع نظر بھارت کے عوام الناس کے مابین یک جہتی اور عام بھائی چارے کے جذبے کو فروغ دے نیز ایسی حرکات سے باز رہے جن سے عورتوں کے وقار کو ٹھیس پہنچتی ہو۔

ہندوستانی آئین کی مذکورہ دفعات اس بات کی دلالت کرتی ہیں کہ ہندوستانی آئین میں عورتوں کو زندگی کے ہر شعبے میں برابر کا درجہ دیا گیا ہے اور ان کے ساتھ کسی بھی طرح کا امتیاز برتے جانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ان دفعات کے علاوہ آئین کی دیگر دفعات کا اطلاق بھی عورتوں پر بالکل اسی طرح ہوتا ہے جس طرح دیگر شہریوں پر ہوتا ہے۔اس کے علاوہ مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں نے عورتوں کو بااختیار بنانے کے لیے متعدد ایکٹس کو نافذ کیا ہے جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

ممانعت جہیز ایکٹ 1961

The Dowry Prohibition Act

ہمارا ملک زمانۂ قدیم سے جہیز جیسی لعنت کو اپنے سر کا تاج بنائے ہوئے ہے۔لینے والا تو فخریہ اس جُرم کو انجام دیتا ہے مگر دینے والا اگر درمیانی یا نچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہو تو اس کے لیے یہ لعنت ایک وزنی پتھر کی مانند اسے نیچے کی طرف دباتا چلا جاتا ہے۔اس جُرم کو روکنے کے لیے حکومت ہند نے ممانعت جہیز ایکٹ کے نام سے موسوم 1961 میں ایک قانون بنایا۔اس کے چند دفعات ملاحظہ ہوں:

(1) **مختصر نام،وسعت اور نفاذ:**

اس ایکٹ کا مختصر نام جہیز ممانعت ایکٹ 1961 ہے۔

(2) **جہیز کی تعریف:**

اس ایکٹ میں جہیز سے کوئی ایسی جائیداد یا قیمتی سیکوریٹی مراد ہے جو شادی کے موقع پر یا اس سے قبل یا اس کے بعد دیا جائے یا دینے کی رضامندی دی جائے۔

(الف) شادی کا ایک فریق،شادی کے دوسرے فریق کو؛یا

(ب) شادی کے کسی بھی فریق کے ماں باپ یا کوئی دیگر شخص شادی کے کسی بھی فریق کو یا کسی دیگر شخص کو متذکرہ فریقین کی شادی کے سلسلے میں بالواسطہ یا بلاواسطہ دی گئی ہے یا دیے جانے کے لیے قرار کیا گیا ہے،لیکن اس کا اطلاق ان جہیز

اور مہر کے بابت نہیں ہوگا جن پر مسلم عائلی قانون (شریعت) کا اطلاق ہوتا ہے۔

(3) **جہیز کے لین دین کے لیے سزا:**

(الف) جو شخص جہیز لینے یا دینے کے عمل میں ملوث ہے یا اس عمل کی انجام دہی کی ترغیب دیتا ہے تو وہ کم سے کم 5 سال اور 15 ہزار روپے تک کے جرمانے کا یا ایسے جہیز کی قیمت کی رقم تک کا، ان میں سے جو بھی زیادہ ہو، سزاوار ہوگا۔

(ب) ذیلی دفع (الف) کی کوئی بات، : ایسے تحائف جو دولہا یا دلہن کو بغیر کسی مانگ کے دیے جاتے ہیں، ان کے متعلق لاگو نہیں ہوگی۔ لیکن یہ تب، جبکہ ایسے تحائف اس ایکٹ کے تحت بنائے گئے قواعد کے مطابق رکھی گئی فہرست میں درج کئے جاتے ہیں۔

(4) **جہیز کے تقاضے کے لیے سزا:** اگر کوئی شخص، حسب صورت دلہن یا دولہا کے والدین یا دیگر رشتہ دار یا ولی سے کسی جہیز کی بالواسطہ یا بلاواسطہ مانگ کرتا ہے تو وہ کم سے کم 6 ماہ اور زیادہ سے زیادہ 2 سال کی مدت کے قید کا اور 10 ہزار روپے تک کے جرمانے کا سزاوار ہوگا۔

(الف) **تشہیر پر پابندی۔** اگر کوئی شخص: کسی اخبار، رسالے، جریدے یا ذرائع ابلاغ میں سے کسی کے ذریعہ کسی اشتہار میں اپنے بیٹے یا اپنی بیٹی یا کسی دیگر رشتہ دار کی شادی کے زر بدل کے طور پر اپنی جائیداد یا کوئی روپیہ پیسہ یا دونوں اپنے کسی کاروبار یا مفاد میں حصے کے طور پر دینے کی پیش کش کرتا ہے، کسی اشتہار کو چھاپتا ہے یا شائع کرتا ہے یا ادھر ادھر بھیجتا ہے، تو وہ کم از کم 6 ماہ کی اور زیادہ سے زیادہ 5 سال کی قید یا 15 ہزار روپے تک کے جرمانے کا سزاوار ہوگا۔

(5) **جہیز کے لین دین کے لیے قرار کا باطل ہونا:** اس عمل میں کیا گیا کوئی بھی قرار باطل ہوگا۔

(6) **جہیز کا بیوی یا اس کے وارثوں کے فائدے کے لیے ہونا:** جہاں کوئی جہیز دُلہن کے علاوہ کسی شخص کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے، وہاں اس شخص کو چاہیے کہ اگر جہیز شادی سے قبل حاصل کیا گیا تھا تو اسے حاصل کرنے کی تاریخ کے تین ماہ کے اندر، اور اگر وہ جہیز اس وقت حاصل کیا گیا تھا جب دُلہن نابالغ تھی تو اس کے 18 سال کی عمر پوری کرنے کے بعد تین ماہ کے اندر اس کے حوالے کر دیا جائے۔ تب تک اس جہیز کو امانت کے طور پر اپنے پاس رکھے۔ اگر کوئی شخص اس جہیز کو معین معیاد تک منتقل نہیں کر پاتا ہے تو وہ کم سے کم 6 ماہ اور زیادہ سے زیادہ 2 سال کی مدت کی سزا کا یا 10 ہزار تک کے جرمانے کا حقدار ہوگا۔ لیکن اگر ایسی عورت کی 7 سال کے اندر قدرتی وجوہات کی بنا پر موت ہو جاتی ہے تو ایسی جائیداد اس کے بچوں کو منتقل کر دی جائے گی اور اگر اس عورت کو بچے نہیں ہیں تو اس کے ماں باپ کو اس جائیداد کا حقدار بنایا جائے گا۔ سزا کی تجویز کے بعد بھی اس شخص کو عدالت ایک معین وقت کے اندر جائیداد کی منتقلی کا فرمان جاری کرے گی۔ اگر وہ کسی وجہ کی بنا پر جائیداد واپس نہیں کر پاتا ہے تو اس جائیداد کی قیمت کے برابر عدالت کے حکم سے جُرمانہ ادا کرے گا جو اس جائیدا کے وارث تک پہنچا دیا جائے گا۔

ممانعت جہیز (فہرست تحائف دولہا۔دلہن) قواعد 1985

The Dowry Prohibition (Maintenance of Lists of Presents 1985

یہ 2 اکتوبر 1985 کو نافذ ہوا جو ممانعت جہیز (ترمیم) ایکٹ 1984 (1984 کا 63) کے نافذ ہونے کے لیے متعین تاریخ ہے۔ اس قواعد کے مطابق شادی کے وقت جو تحائف دُلہن کو دیے جاتے ہیں ان کی فہرست دُلہن رکھے گی اور جو دُلہا کو دیے جاتے ہیں ان کی فہرست دُلہا رکھے گا۔ اس فہرست کو شادی کے وقت یا شادی سے پہلے جتنی جلدی ہو سکے تیار کیا جائے گا جس میں ہر تحفے کی مختصر تفصیل، تحفے کی تخمینی قیمت، اس شخص کا نام جس نے تحفہ دیا ہے، تحفہ دینے والا شخص اگر دُلہا یا دُلہن کا رشتہ دار ہے تو اس کی تفصیل کے ساتھ ساتھ اس میں دُلہا اور دُلہن کے دستخط بھی درج کیے جائیں گے۔ اگر دُلہن دستخط نہیں کر سکتی وہاں

اس کا کوئی قریبی معتمد اُسے اس فہرست کو پڑھ کر سُنائے گا اور اس سُنانے والے کا اس میں دستخط ہوگا، پھر دُلہن انگوٹھے کا نشان لگا سکے گی۔ اگر دُلہا دستخط نہیں کر سکتا ہے تو یہی قاعدہ دُلہا کے معاملے میں روبہ عمل لایا جائے گا۔ اور اگر دُلہا اور دُلہن چاہیں تو اپنی اپنی فہرستوں میں اپنے کسی رشتہ دار یا رشتہ داروں یا شادی کے وقت حاضر کسی دیگر شخص یا اشخاص کے دستخط حاصل کر سکتے ہیں۔

گھریلو تشدد سے خواتین کا تحفظ ایکٹ 2005

The Protection of Women from Domestic

(ایکٹ نمبر 43 بابت 2005)

مختصر عنوان، وسعت اور نفاذ (باب۔i): عورتوں کے خلاف آج کے متشدد حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس ایکٹ کو 2005 نافذ کیا گیا۔

گھریلو تشدد کی تعریف (باب۔ i): اس ایکٹ کی اغراض کے لیے جواب دہندہ (Respondent) کا کوئی فعل، ارتکابِ فعل یا ترکِ فعل یا طور طریقہ گھریلو تشدد تصور ہوگا اگر اس سے متاثرہ شخص کی صحت، سلامتی، زندگی، عضو یا ذہنی، جسمانی یا جذباتی صحت کو ضرر پہنچے یا خطرہ لاحق ہو یا ان باتوں کا اندیشہ ہو اور اس میں جسمانی بدسلوکی، جنسی بدسلوکی، زبانی اور جذباتی بدسلوکی اور معاشی بدسلوکی شامل ہیں، اگر جواب دہندہ متاثرہ شخص کو خوف زدہ کرتا ہے یا ضرر پہنچاتا ہے تاکہ اُسے یا اُس کے کسی دوسرے رشتہ دار شخص کو ڈرایا جائے تاکہ کسی جہیز یا دیگر جائداد یا قیمتی ضمانت کے غیر قانونی مطالبہ کو پورا کیا جائے، متاثرہ شخص یا اس کے کسی رشتہ دار کو دھمکایا جائے تو یہ گھریلو تشدد کے زُمرے میں آئے گا۔ بالفاظ دیگر متاثرہ شخص کے ساتھ کسی بھی قسم کا ظالمانہ رویہ خواہ اس کا مقصد زبانی، نفسیاتی یا جسمانی ضرر پہنچانا ہو یا دونوں طرح سے اسے تکلیف پہنچانا ہو، ظلم یا ظالمانہ رویے کے زُمرے میں آئے گا۔

راحت کے احکام حاصل کرنے کے لیے طریقۂ کار (باب۔ i)

حکم تحفظ (Protection Orders):

مجسٹریٹ متاثرہ شخص اور رسپانڈنٹ کو سماعت کا موقع دینے اور بادی النظر میں مطمئن ہونے کے بعد کہ گھریلو تشدد واقع ہونے کا اندیشہ ہے، متاثرہ شخص کے حق میں حکم تحفظ جاری کر سکے گا اور رسپانڈنٹ کو: گھریلو تشدد کے کسی فعل کے ارتکاب سے، گھریلو تشدد کے افعال کے ارتکاب میں اعانت کرنے یا مدد دینے سے، متاثرہ شخص کے کام کاج کی جگہ میں داخل ہونے، یا اگر متاثرہ شخص بچہ ہو تو اسکول یا کسی دوسری جگہ میں داخل ہونے سے جہاں متاثرہ شخص کا اکثر آنا جانا ہو، متاثرہ شخص کے ساتھ کسی بھی طرح رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنے سے جس میں ذاتی، زبانی یا تحریری یا الیکٹرانک یا ٹیلیفون رابطہ بھی شامل ہے، مجسٹریٹ کی اجازت کے بغیر اثاثے منتقل کرنے سے یعنی بینک لاکر یا بینک کھاتوں کا تصرف جن کو متاثرہ شخص اور رسپانڈنٹ دونوں فریق مشترکہ طور پر یا رسپانڈنٹ اکیلے استعمال کرتا تھا یا ان کے قبضے میں تھا اور ان میں عورت کا استری دھن یا دیگر کوئی جائیداد شامل ہے جو فریقین کے مشترکہ قبضے میں تھی یا اس پر علیحدہ علیحدہ قبضہ رکھتے تھے، لواحقین، دیگر رشتہ داروں یا کسی شخص کو تشدد کا نشانہ بنانے سے جس نے متاثرہ شخص کو گھریلو تشدد سے بچانے میں مدد دی ہو اور حکم تحفظ میں مصرحہ کسی دیگر فعل کے ارتکاب سے، ممانعت کر سکے گا۔

سکونت:

19۔ درخواست کا نپٹارا کرتے وقت مجسٹریٹ یہ اطمینان حاصل کرنے کے بعد کہ گھریلو تشدد واقع ہوا ہے، حکم سکونت صادر کر سکے گا۔ مجسٹریٹ کوئی مزید شرائط عائد کر سکے گا یا کوئی دیگر ہدایت جاری کر سکے گا جو وہ متاثرہ شخص یا ایسے

متاثرہ شخص کے بچے کے تحفظ یا اس کی سلامتی کا انتظام کرنے کے لیے مناسب طور پر ضروری تصور کرے۔ مجسٹریٹ اس پولس اسٹیشن، جس کے حدود واختیار میں مجسٹریٹ سے رجوع کیا گیا ہو، کے نگراں افسر کو ہدایت دے سکے گا کہ وہ تحفظ حکم کو روبہ عمل لانے میں مدد دے۔ وغیرہ۔

مالی امدا:

20۔ درخواست پر فیصلہ دیتے وقت مجسٹریٹ رسپانڈنٹ کو ہدایت دے سکے گا کہ وہ گھریلو تشدد کے باعث متاثرہ شخص اور متاثرہ شخص کے کسی بچے کے ذریعے کئے گئے اخراجات یا برداشت کئے گئے نقصانات کو پورا کرنے کے لیے امداد کرے۔ مجسٹریٹ کو اختیار رہوگا کہ وہ نان نفقہ کے طور پر مناسب ایک مشت رقم کی ادائیگی یا ماہوار ادائیگی کا حکم دے جیسا کہ معاملہ کے حالات تقاضا کریں۔

حق معاوضہ:

22۔ اس ایکٹ کے تحت دی جانے والی امداد کے علاوہ مجسٹریٹ متاثرہ شخص کی طرف سے درخواست دینے پر ایک حکم صادر کر سکے گا جس کے ذریعے رسپانڈنٹ کو ہدایت دی جاسکے گی کہ وہ گھریلو تشدد کے اپنے افعال کے ارتکاب سے ہوئے ضرر کے لیے جس میں ذہنی اور جذباتی ایذا رسانی شامل ہیں، معاوضہ اور ہرجانہ ادا کرے۔

باب۔V (متفرقات)

رسپانڈنٹ کے ذریعے حکم تحفظ کی خلاف ورزی کے لیے سزا:

31۔ رسپانڈنٹ کے ذریعے حکمِ تحفظ یا عبوری تحفظ کی خلاف ورزی اس ایکٹ کے تحت جرم ہوگا اور اس کے لیے ایک سال تک کی قید یا بیس ہزار روپے تک کا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔

تحفظ افسر کی طرف سے اپنا فرض انجام نہ دینے کے لیے سزا:

33۔ اگر کوئی تحفظ افسر کسی معقول وجہ کے بغیر حکمِ تحفظ میں مجسٹریٹ کی ہدایت کے مطابق فرائض انجام دینے میں قاصر رہے یا انجام دینے سے انکار کرے تو اسے ایک سال تک کی قید یا بیس ہزار روپے تک کے جرمانے یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔

ہندشہادت ایکٹ 1872

Indian Evidence Act, 1872

Presumtions of Le **(الف2) 1C1 ۔ بچے کے جائز ہونے کے بابت قیاس**

سیکشن 112 کے شادی کے دوران بچے کی پیدائش اور اس کے جائز ہونے کا قطعی ثبوت: یہ حقیقت کہ اگر کسی شخص کی پیدائش اس کی ماں اور کسی مرد کے درمیان جائز طور پر کی گئی شادی کے رشتہ سے قائم رہنے کے دوران ہوئی ہے یا ازدواجی انفساخ کے 280 دن کے اندر اور یہ کہ ماں نے اس دوران پھر سے شادی نہیں کی ہے، تو یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہوگا کہ وہ اس شخص (مرد) کی جائز اولاد ہے۔

(ب3) 11 الف۔ شادی شدہ خاتون کے ذریعہ خودکشی کی ترغیب کے بابت قیاس:

Presumption as to Abetment of Suicide by

جہاں یہ مدعا زیرِ غور ہو کہ کسی عورت کو خودکشی کرنے کے لیے اس کے شوہر یا اس کے شوہر کے کسی رشتہ دار نے ترغیب دی تھی اور یہ کہ یہ بات واضح کر دی جائے کہ اس کی اپنی شادی کی تاریخ سے 7 سال کی مدت کے دوران خودکشی کی ہے اور یہ کہ اس کے شوہر یا اس کے شوہر کے کسی رشتہ دار نے اس کے ساتھ کوئی ظالمانہ برتاؤ کیا تھا تو عدالت معاملے سے متعلق تمام

حالات کوملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یہ قیاس کر سکتی ہے کہ ایسی خودکشی کے لیے اس کے شوہر یا اس کے شوہر کے کسی رشتہ دار نے ترغیب دی تھی۔

(ج)11ب۔جہیز موت کی بابت قیاس:

Presumtion as to Dwery Death

جہاں یہ مدعا زیر غور ہو کہ کسی شخص نے کسی عورت کی جہیز کے لیے جان لی ہے اور موت کے فوراً بعد یہ بات واضح کر دی جائے کہ ایسی عورت کے ساتھ جہیز کی مانگ کے لیے یا اس سلسلے میں کسی قسم کا کوئی ظالمانہ برتاؤ کیا گیا تھا یا اسے پریشان کیا گیا تھا تو یہ قیاس کیا جائے گا کہ ایسے شخص نے جہیز موت کا ارتکاب کیا ہے۔

عورتوں کی غیر شائستہ شبیہ (ممانعت) ایکٹ 198

The Indecent Representation of Women (P

(ایکٹ نمبر 60 بابت 198)

اس ایکٹ کے تحت چند دفعات:

دفعہ 3۔ کوئی بھی شخص کوئی بھی ایسا اشتہار نہ تو شائع کرے گا نہ کروائے گا، نہ اس کی اشاعت یا نمائش کا انتظام کرے گا، نہ اس میں حصہ لے گا جس میں عورت کی کسی بھی طرح غیر شائستہ شبیہ پیش کی گئی ہو۔

دفعہ 4۔ کوئی بھی شخص کوئی بھی ایسی کتاب، پمفلٹ، پیپر، سلائڈ، فلم تحریر، ڈرائنگ، پینٹنگ، فوٹوگراف، شبیہ یا تصویر جس میں کسی عورت کی کسی بھی شکل میں غیر شائستہ شبیہ پیش کی گئی ہو، نہ تو پیش کرے گا، نہ کروائے گا، نہ فروخت کرے گا، نہ کرائے پر دے گا، نہ تقسیم کرے گا، نہ سب جگہ بھیجے گا اور نہ ہی ڈاک کے ذریعے اسے ارسال کرے گا۔

دفعہ 6۔ کوئی بھی شخص جو دفعہ 3 یا دفعہ 4 کی خلاف ورزی کرے گا اسے پہلی مرتبہ خلاف ورزی کرنے پر کسی بھی طرح کی 2 سال تک کی قید کی سزا دی جائے گی اور ساتھ میں 2 ہزار روپے تک کا جرمانہ کیا جائے گا اور اگر وہ دوبارہ یا بار بار اسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے کم از کم 6 ماہ کی قید جو بڑھا کر 5 سال کی جا سکتی ہے اور ساتھ میں کم از کم 1 ہزار روپے جرمانہ جسے بڑھا کر 10 لاکھ روپے تک کیا جا سکتا ہے، کی سزا دی جا سکتی ہے۔

فاسقانہ بیوپار (انسداد) ایکٹ 195

The Immortal Traffic (Preventi

چند اہم دفعات:

دفعہ 3۔ **قحبہ خانہ چلانے یا قحبہ خانہ کے لیے مکان کے استعمال کی اجازت دینے کی سزا:** کوئی بھی شخص جو عصمت فروشی کا اڈہ چلاتا ہے یا اس کا انتظام کرتا ہے یا اس کے انتظام و انصرام کے لیے کوئی کام کرتا ہے یا کوئی امداد بہم پہنچاتا ہے تو اسے پہلی مرتبہ ایسا جرم کرنے کے لیے کم از کم 1 سال کی اور زیادہ سے زیادہ 3 سال قید با مشقت اور ساتھ میں 2 ہزار روپے تک کے جرمانے کی سزا دی جا سکتی ہے اور دوسری بار یا بار بار ایسا کرنے پر کم سے کم 2 سال اور زیادہ سے زیادہ 5 سال تک کی قید با مشقت کی اور ساتھ میں 2 ہزار روپے تک کے جرمانے کی سزا دی جا سکتی ہے۔ اور کرائے دار، مکان مالک یا دیگر کسی ایسے شخص کو جو جان بوجھ کر خاص اسی مقصد کے لیے مکان کرائے پر دیتا ہے، اسے پہلی مرتبہ ارتکاب جرم کے لیے 2 سال تک کی قید اور 2 ہزار روپے تک کے جرمانے کی سزا دی جا سکتی ہے۔ دوسری بار اور بار بار ایسا کرنے پر یہ سزا جرمانے کے ساتھ ساتھ 5 سال کی جا سکتی ہے۔

دفعہ 5۔ اگر کوئی شخص جو کسی شخص کو اس کی مرضی سے یا اس کی مرضی کے بغیر عصمت فروشی کے لیے آمادہ کرتا ہے یا ایسا کرنے کا اقدام کرتا ہے یا کسی شخص کو بہلا پھسلا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ اس نیت سے لے جاتا ہے کہ وہ اس کا عصمت

فروشی کے لیے استعمال کرے گا اور اسے کسی عصمت فروشی کے اڈے پر رکھے گا یا عصمت فروشی کرتا ہے یا ایسا کرواتا ہے تو اسے کم سے کم 3 سال کی قید با مشقت اور ساتھ میں 2 ہزار روپے تک کے جرمانے کی سزا دی جا سکتی ہے۔ اس ذیلی دفعہ کے تحت اگر کوئی جرم کسی شخص کی مرضی کے خلاف کیا جاتا ہے تو سزا کو بڑھا کر 7 سال سے 14 سال کیا جا سکتا ہے۔ اگر متاثرہ ایک بچہ ہے تو اس ذیلی دفعہ کے تحت سزا کو بڑھا کر کم از کم 7 سال اور زیادہ سے زیادہ عمر قید اور اگر متاثرہ نابالغ ہے تو سزا کو بڑھا کر کم از کم 7 سال اور زیادہ سے زیادہ 14 سال کی قید با مشقت کیا جا سکتا ہے۔

طبی خاتمۂ حمل ایکٹ 1971

The Medical Termination of Pregna

(ایکٹ نمبر 34 بابت 1971)

دفعہ 3۔ اس دفعہ کے مطابق (1) مجموعی تعزیرات ہند (1860 کا 45) میں کسی بات کے ہوتے ہوئے بھی کسی بھی رجسٹرڈ میڈیکل پریکٹشنر کو اس مجموعے کے تحت یا نافذ الوقت کسی دیگر قانون کے تحت کسی جرم کا قصوروار نہیں ٹھہرایا جائے گا، اگر خاتمۂ حمل اس ایکٹ کی توضیعات کے مطابق کیا گیا ہو۔ ذیلی دفعہ 4 کی توضیعات کے مطابق کوئی بھی رجسٹرڈ میڈیکل پریکٹشنر ان صورتوں میں خاتمۂ حمل کر سکتا ہے، جب حمل 12 ہفتے سے زیادہ کا نہ ہو، اگر ایسے میڈیکل پریکٹشنر کی نیک نیتی پر مبنی یہ رائے ہو کہ حمل کے جاری رکھنے سے حاملہ عورت کی جان جانے یا اس کی جسمانی یا ذہنی صحت کو شدید نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو یا پیدا ہونے والے بچے کو اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ وہ جسمانی یا ذہنی بے اعتدالی میں مبتلا ہو کر شدید معذوری کا شکار ہو جائے گا اور جہاں حمل بارہ ہفتوں سے زیادہ کا ہو لیکن 20 ہفتوں سے زیادہ کا نہ ہو، اگر کم از کم 2 میڈیکل پریکٹشنروں کی نیک نیتی پر مبنی درج بالا رائے ہو تو خاتمۂ حمل کیا جا سکتا ہے۔ جب حمل زنا بالجبر کے سبب ٹھہرا ہے تو یہ قیاس کہ اس سے حاملہ کی ذہنی صحت کو شدید نقصان پہنچے گا، یا بچوں کی تعداد کو محدود کرنے کے لیے استعمال کیے گئے کسی آلے یا طریقۂ کار کے ناکام ہو جانے کے سبب حمل ٹھہرنے کی صورت میں یہ قیاس کیا جائے گا کہ اس سے حاملہ کی ذہنی صحت کو شدید مضرت پہنچے گی تو خاتمۂ حمل کیا جائے گا۔ کسی بھی 18 سال سے کم یا 18 سال سے زیادہ عمر کی لڑکی کا جو دماغی اعتبار سے معذور ہو، تب تک خاتمۂ حمل نہیں کیا جائے گا جب تک کہ اس کے ولی سے تحریری طور پر ایسا کرنے کی رضامندی حاصل نہ کر لی جائے۔

دورانِ حمل تشخیص جنس کی تکنیک (ضابطہ بندی اور انسداد استعمال بیجا) ایکٹ 1994

The Pre-Natal Diagnostic Techniques (Regulation ar

(ایکٹ نمبر 57 بابت 1994)

کچھ اہم دفعات:

دفعہ 6۔ اس دفعہ کے مطابق کوئی بھی جینیٹک کونسلنگ سینٹر یا جینیٹک لیبوریٹری یا جینیٹک کلینک قبل از پیدائش جنس کی تشخیص کے لیے کسی تکنیک جس میں الٹراسونوگرافی بھی شامل ہے، کا نہ تو استعمال کرے گا اور نہ کرائے گا۔ اس کے علاوہ کسی بھی شخص کو اس بات کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ اس قسم کا عمل کرے یا کرائے۔

دفعہ 22۔ کسی بھی شخص، تنظیم، جینیٹک کونسلنگ سینٹر یا جینیٹک لیبوریٹری یا جینیٹک کلینک کو اس بات کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ قبل از پیدائش جنس کی تشخیص اپنے ادارے میں ہونے کی بابت کسی بھی طرح کا اشتہار دے یا تشہیر کرے۔ جو کوئی بھی ایسا کرے گا اسے 3 سال تک کی قید کی سزا دی جا سکتی ہے اور اس پر 10 ہزار روپے تک کا جرمانہ کیا جا سکتا ہے۔

قومی خواتین کمیشن ایکٹ 1990

کمیشن کے مختلف ابواب میں سے مذکورہ ابواب:

باب۔3

10۔ **کمیشن کے کارہائے منصبی:**

1۔ کمیشن مندرجہ ذیل تمام کارہائے منصبی یا ان میں سے کوئی کارمنصبی انجام دے گا۔جیسے۔۔۔۔

الف۔ آئین اور دیگر قوانین کے تحت عورتوں کے لیے وضع کیے گئے تحفظات کی نسبت تمام امور کی چھان بین اور جانچ پڑتال کرنا؛

ب۔ مرکزی حکومت کو ان تحفظات کے عمل پر رپورٹیں سالانہ اور ایسے دیگر اوقات پر جنہیں کمیشن سمجھے، پیش کرنا؛

ج۔ ایسی رپورٹوں میں یونین یا کسی ریاست سے عورتوں کے حالات کی بہتری کے لیے ان تحفظات کی موثر عمل آوری کرنا؛

د۔ وقتاًفوقتاً عورت کی نسبت آئین اور دیگر قوانین کی موجودہ توضیعات کا جائزہ لینا اور ان میں ترمیمات کی سفارشات کرنا تا کہ ایسے قوانین میں کسی نقائص، کمیوں یا خامیوں کو پورا کرنے کے لیے انسدادی قانون سازی کے اقدام تجویز کرنا؛

ہ۔ عورتوں کی نسبت آئین اور دیگر قوانین کی توضیعات کی خلاف ورزی کے معاملات متعلقہ حکام کے ساتھ اٹھانا؛

و۔ مندرجہ ذیل امور کی نسبت شکایات کی چھان بین کرنا اور ان پر ازخود توجہ دینا؛

(i) عورت کو حقوق سے محروم رکھنا،

(ii) عورت کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے وضع کیے گئے قوانین اور مساوات اور ترقی کے مقصد کے حصول کی عدم عمل آوری،

(iii) حکمت عملی کے ایسے فیصلوں، رہنما اصولوں یا ہدایات کی عدم تعمیل جن کا مقصد مشکلات کو کم کرنا اور بہبودی کو یقینی بنانا نیز عورت کو امداد فراہم کرنا ہے اور ایسے امور سے پیدا ہونے والے مسائل کو متعلقہ حکام کے ساتھ اٹھانا۔

ز۔ عورت کے خلاف عدم مساوات اور زیادتیوں سے پیدا ہونے والے مخصوص مسائل یا صورت حال کا خصوصی مطالعہ یا تحقیقات کروانا اور بندشوں کی نشاندہی کرنا تا کہ ان کو دور کرنے کی تدابیر کی سفارش کی جائے؛

ح۔ ترقیاتی وتعلیمی تحقیق ہاتھ میں لینا تا کہ تمام امور میں عورتوں کی مناسب نمائندگی کو یقینی بنانے کے طریقے تجویز کیے جا سکیں اور ان کی ترقی کو روکنے کے ذمہ دار عناصر کی نشاندہی کرنا مثلاً مکان اور بنیادی خدمات تک رسائی نہ ہونا، بے جا مشقت اور پیشہ ورانہ مضمرات کو کم کرنے اور ان کی پیداواری صلاحیت کو بڑھانے کے لیے ناکافی امدادی خدمات اور تکنیکی عمل؛

ط۔ عورتوں کو سماجی واقتصادی ترقی کے منصوبہ جاتی عمل میں شرکت کرنا اور مشورہ دینا؛

ی۔ یونین اور کسی ریاست کے تحت عورتوں کی ترقی کی پیش رفت کا اندازہ کرنا؛

ک۔ کسی جیل ریمانڈ ہوم، عورتوں کے ادارے یا تحویل کی ایسی دیگر جگہ کا، جہاں عورتوں کو بحیثیت قیدی یا دیگر طور پر رکھا جائے، معائنہ کرنا یا کروانا اور اگر ضروری پایا جائے تو متعلقہ حکام کے ساتھ انسدادی کارروائی کا معاملہ اٹھانا؛

ل۔ ایسے مقدمے کے لیے رقوم فراہم کرنا جس میں ایسے مسائل شامل ہوں جن سے عورتوں کی ایک بڑی جماعت متاثر ہوئی ہو؛

م۔ حکومت کو عورتوں کی نسبت کسی امر اور خاص طور پر ایسی مشکلات کی میعادی رپورٹیں دینا جن کے تحت عورتوں پریشان

ہوں؛

ن۔ کوئی ایسا دیگر امر جس کی نسبت مرکزی حکومت اس سے رجوع کرے۔

حق اطلاعات ایکٹ 2005

The Right to Information Act

سرکاری محکموں میں بدعنوانی، رشوت خوری، ان کی غیر اطمینان بخش کارکردگی، حکام کی فرائض منصبی میں کاہلی، عوام کو ہونے والی دشواریوں کے سدباب اور سرکاری کام کاج میں شفافیت لانے کی نیت سے حکومت ہند نے 2005 میں حق اطلاع ایکٹ (Right to Information Act) کے نام سے ایک قانون بنایا تھا جسے لوگ عام طور پر آر ٹی آئی کے نام سے جانتے ہیں۔تمام قانونی تحفظات کے باوجود عورتیں ہمارے معاشرے کی سب سے کمزور شئے سمجھی جاتی ہیں۔اس قانون نے ہندوستان کے سارے شہریوں کے لیے دروازہ کھول دیا ہے کہ ہر کوئی اپنے سے اعلیٰ عہدداروں، جہاں تک اس کی رسائی ممکن نہیں ہے، وہاں کی جانکاری حاصل کر سکتا ہے۔قانون ہٰذا معاشرے کی کمزور صنف عورت کے لیے نہایت ہی سودمند ہے۔کبھی کبھی عورتیں بے خبری کے عالم میں اور کبھی کبھی باخبر رہنے کے باوجود بھی اپنا حق حاصل نہیں کر پاتیں، اپنے پر ہو رہے ظلم کی شکایت کو ڈیل کرنے والے افسران کا بے رخ رویہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ہر دن زندگی کے مختلف معاملات کا سامنا کرنا ہوتا ہے جس میں مختلف طرح کے تلخ حالات اسے الجھائے رکھتے ہیں۔اگر کسی عورت نے کسی بھی سرکاری محکمہ میں کسی بھی کام کے لیے کوئی درخواست دی ہے اور کام کی پروسیسنگ میں تاخیر ہو رہی ہے یا اس کے بابت جو فیصلہ لیا گیا ہے اس کی اسے اطلاع نہیں دی گئی ہے، تو وہ مرکزی یا ریاستی اطلاعاتی کمیشن میں درخواست دے کر ضروری معلومات حاصل کر سکتی ہے۔یہ درخواست کس طرح دی جائے گی، کہاں دی جائے گی، اس کے لیے کتنی فیس دینی ہوگی، اس درخواست پر فیصلہ کتنے دن میں کیا جائے گا، کون افسر اس کام میں رُکاوٹ ڈالنے کا ذمہ دار ہے، ان سب کی تفصیل اس ایکٹ میں درج ہے۔

اقلیتی طبقات کی عورتوں کے اندر قیادت کے فروغ کے لیے تیار کی گئی اسکیم (نئی روشنی)

Scheme for Leadership Development of Minority

اس اسکیم کا نفاذ ملک بھر میں کیا جا رہا ہے۔اس اسکیم کا بحیثیت مجموعی مقصد اقلیتی عورتوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے، تاکہ وہ گھر کے حد سے باہر نکل کر سماج میں قائدانہ کردار ادا کر سکیں۔اس اسکیم کے تحت 6 دن کی ٹریننگ دی جاتی ہے، جس کے بعد ایک سال کی مدت تک ہینڈ ہولڈنگ کی جاتی ہے، یعنی انہیں کچھ کرنے کے لیے سہارا دیا جاتا ہے۔اس اسکیم کے تحت تربیت حاصل کرنے والی عورتوں کی کل تعداد 22402 ہے۔جس میں اتر پردیش میں سب سے زیادہ 21525 اور میگھالیہ میں سب سے کم 125 عورتیں تربیت یافتہ ہیں۔ ''نئی روشنی'' اسکیم کی طرح دیگر اسکیمیں ''سیکھو اور کماؤ''، ''نئی منزل'' بھی اقلیتی عورتوں کو بااختیار بنانے کے مقصد کے تحت کارہائے نمایاں انجام دے رہی ہیں۔'سیکھو اور کماؤ' اسکیم کے تحت کل 33 فیصد عورتیں مستفد ہو رہی ہیں اور 'نئی منزل' اسکیم کے تحت کل 30 فیصد عورتیں فائدہ حاصل کر رہی ہیں۔

تعزیرات ہند اور عورتوں سے متعلق جنسی و دیگر جرائم

Indian Penal Code and Women Related Sexual

تعزیرات ہند ہندوستان کا اہم ترین اور عام تعزیری قانون ہے جس میں مختلف جرائم کی تعریفات اور ان کی سزاؤں کی تفصیل واضح طور پر دی گئی ہے۔مذکورہ قانون غیر منقسم ہندوستان میں 1860 میں منظور کیا گیا تھا اور دیگر قوانین کی طرح آزاد ہندوستان میں بھی اس قانون میں وقتاً فوقتاً بہت سی ترامیم کی گئی ہیں اور کچھ نئی دفعات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔اس کے مندرجہ

ذیل دفعات عورتوں سے متعلق جرائم و دیگر امور سے متعلق ہیں اوران دفعات میں سے کسی کی بھی خلاف ورزی کیے جانے پر متعلقہ فوجداری عدالت میں معاملہ دائر کیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ قانونی ویب سائٹس میں ان دفعات سے جُڑی ساری تفصیلات درج ہیں۔

دفعہ 100۔ جب جسم کی نجی حفاظت کا حق کسی کو ہلاک کرنے تک تجاوز کرتا ہے (When the Right of Private Defence of the Body Extends to Causing Deat

دفعہ 228 الف۔ بعض جرائم (بشمول زنا بالجبر) وغیرہ سے ستم رسیدہ شخص کی پہچان کا انکشاف (Disclosure of Identity of the Victim of Offences, etc

دفعہ 294۔ فحش افعال اور گانے (Obscene Acts and Songs)

دفعہ 304ب۔ جہیز موت (Dowry Death)

دفعہ 326 الف۔ تیزاب کے استعمال کے ذریعہ ضرر شدید (Voluntarily Causing Grievous Hurt by Use of Acid, etc.

ب۔ کسی پر تیزاب پھینکنا یا پھینکنے کی کوشش کرنا (Voluntarily throwing or Attempting to through Acid)

دفعہ 354۔ عورت کی عصمت دری کی نیت سے اس پر حملہ یا جبر مجرمانہ کا استعمال (Assult or Criminal Force to Woman with Intent to Outrage her Mode

الف۔ جنسی ایذا دہی اور اس کی سزا (Sexual Harassment and Punishment for Sexual Harassmen

ب۔ کسی عورت کو کپڑے اتارنے یا ننگا ہونے کے لیے مجبور کرنے کی نیت سے اس پر حملہ کرنا یا جبر مجرمانہ کا استعمال کرنا (Assult or Use of Criminal Forces to Woman with

ج۔ شہوت نظری، جنسی حرکات یا اعضاء کے نظارے سے جنسی تسکین (Voyeurism)

د۔ اسٹا کنگ (Stalking): تعاقب کرنا، خفیہ طور پر پیچھا کرنا (اسے چھیڑنے، ستانے، باہمی تعلق پیدا کرنے کے لیے مجبور کرنے، اس کے انٹرنیٹ، ای میل یا کسی الیکٹرانکی ذریعۂ استعمال کی مانیٹرنگ کرنے کی غرض سے۔)

دفعہ 359۔ بھگا لے جانا (Kidnapping)

دفعہ 360۔ ہندوستان سے بھگا لے جانا (Kidnapping from India)

دفعہ 361۔ ولایت جائز میں سے بھگا لے جانا (Kidnapping from Lawful Guardianship

دفعہ 362۔ اغوا (Abduction)

دفعہ 363۔ بھگا لے جانے کی سزا (Punishment for Kidnapping)

الف۔ بھیک مانگنے کی اغراض سے کسی نابالغ کو بھگا لے جانا یا اس کا کوئی عضو بیکار کرنا (Kidnapping or Maiming Minor for Purpose of Begging

دفعہ 364۔ قتل کی غرض سے بھگا لے جانا یا اغوا کرنا (Kidnapping or Abducting in order to Murder

دفعہ 365۔ کسی شخص کو خفیہ طور پر اور حبس بے جا میں رکھنے کی نیت سے بھگا لے جانا یا اغوا کرنا (Kidnapping or Abducting with Intent Secretly and Wrongfully to Con

دفعہ 366۔ کسی عورت کو شادی وغیرہ کے لیے مجبور کرنے کی غرض سے بھگا لے جانا، اغوا کرنا یا ترغیب دینا (Kidnapping, Abducting or Inducing Woman to Compel her Ma

الف۔ نابالغ لڑکیوں کی دلالی (Procuration of Minor Girl

ب۔ بیرون ملک سے لڑکیوں کی درآمد (Importation of Girl from Foreign Country

دفعہ 3 6 ۔کسی شخص کو اس غرض سے بھگا لے جانا یا اغوا کرنا کہ اسے ضرر شدید پہنچایا جائے یا غلام وغیرہ بنا کر رکھا جائے
(Kidnapping or Abducting in order to Subject Person to G

دفعہ 3 6 ۔بھگائے ہوئے یا اغوا شدہ شخص کو بے جا طریقے سے چھپانا یا حبس بے جا میں رکھنا (Wrongfully
(or Keeping in Confinement, Kidnapped or Abdu

دفعہ 3 6 10 برس سے کم عمر بچے کو چوری کرنے کی نیت سے بھگا لے جانا یا اغوا کرنا (Kidnapping or
(under Ten Years with Intent to Steal from

دفعہ 3 7 انسانوں کی ناجائز تجارت (Trafficking

الف۔ خرید کردہ بچے یا کسی شخص کا استحصال (Exploitation of Person

دفعہ 3 7 عادتاً غلاموں کا کاروبار کرنا (Habitual Dea

دفعہ 3 7 ۔عصمت فروشی وغیرہ کی اغراض کے لیے نابالغ کو فروخت کرنا (Selling Minor f
(Prostitution, etc.

دفعہ 3 7 ۔عصمت فروشی وغیرہ کی اغراض کے لیے نابالغ کو خریدنا (Bying Minor for Pur
(etc.

دفعہ 3 7 ۔ناجائز جبری مزدوری (Unlawful Comp

دفعہ 3 7 ۔زنا بالجبر (Rap

دفعہ 3 7 ۔زنا بالجبر کی سزا (Punishment

الف۔ ستم رسیدہ کی موت واقع کرنے یا نتیجتاً اسے مسلسل بے خبری کی حالت میں پہنچانے کے لیے سزا (Punishm
(Causing Death or Resulting in Persistent Vegeta

ب۔ علیحدگی کے دوران شوہر کا اپنی بیوی کے ساتھ مباشرت کرنا (Sexual Intercourse by
(during Separation

ج۔ کسی بااختیار شخص کا کسی عورت کے ساتھ جنسی مباشرت کرنا (Sexual Intercourse b ty

د۔ اجتماعی زنا بالجبر (Gang R

ہ۔ بار بار جرم کرنے والوں کے لیے سزا (Punishment for Re ers

دفعہ 3 7 ۔جرائم خلاف وضع فطری (Unnatural

دفعہ 9 4 ۔کسی شخص کے ذریعہ سے جائز شادی کا یقین دلا کر دھوکہ سے ہم بستری کرنا (Cohabitation
(Man Deceitfully Inducing a Belief of Lawf

دفعہ 9 4 ۔خاوند یا بیوی کا دوران حیات دوسری شادی کرنا (Marrying again diring r
(Wife

دفعہ 9 4 ۔ویسے ہی جرم کا ارتکاب جبکہ ایسے شخص سے جس کے ساتھ دوسری شادی کی جاتی ہو سابقہ شادی کو خفیہ رکھا جائے (Same Offences with Concealment of Former Marriage fror
(Subsequent Marriage is Contracted

دفعہ 9 4 ۔جائز شادی نہ ہوتے ہوئے فریب سے ادا کی گئی شادی کی رسم (Marriage Ceremony
(through without Lawful Marriage

دفعہ 9 4 ۔زنا (Adul

دفعہ 9 4 ۔شادی شدہ عورت کو مجرمانہ نیت سے بہکا کر لے جانا بھگا لے جانا یا حراست میں رکھنا (Enticing

الف۔ کسی عورت پر اس کے خاوند یا خاوند کے رشتہ داروں کے ذریعہ ظلم کیا جانا (Husband or Relat (a Woman Subjecting Her to Cuelty

دفعہ 506۔ اگر دھمکی ہلاک کرنے یا شدید نقصان پہنچانے کے لیے ہو (Criminal Intimidation

دفعہ 509۔ کسی عورت کی عفت میں دخل اندازی کی نیت سے کہی گئی بات، کیا گیا اشارہ یا کی گئی حرکت (Word, Gesture or Act Intended to the Modesty of a W

علاوہ ازایں خصوصاً عورتوں کی اختیارکاری کے متعلق حکومت ہند نے مختلف اقدامات اٹھائے ہیں۔ عورتوں کو بااختیار بنانے سے متعلق قومی پالیسی (National Policy on Empowerment of women) کے نام سے حکومت ہند نے 2001 میں ایک پالیسی وضع کی تھی جس کا مقصد عورتوں کو سماجی و معاشی اعتبار سے بااختیار بنانا تھا۔ اس پالیسی کے تحت عورتوں کی فلاح و بہبودی کے لیے مختلف اسکیمیں تیار کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ معاشی اور سماجی اعتبار سے بااختیار بنانے سے متعلق اسکیمیں جن میں مرد و عورت میں کوئی امتیاز نہیں برتا گیا ہے، جو سب کے لیے دستیاب ہیں، مثلاً آئی سی ڈی ایس (آنگن واڑیاں) سروسکشا ابھیان، گرامین روزگار یوجنا، کشوری شکتی یوجنا، کریچ/دارالاطفال نیشنل کریچ فنڈ، (اسٹیپ) (STEP) عورتوں کی تربیت و روزگار کا پروگرام، سوئم سدھ، عورتوں کے لیے تعلیمی پروگرام، مانوی سزکشن ابھیان، فیملی کونسلنگ مراکز، راشٹریہ مہیلا کوش، معذوروں کے لیے مختلف اسکیمیں و پروگرام وغیرہ۔ ان میں سے کچھ اہم اسکیموں کی مختصراً تفصیل ذیل میں درج ہے۔

عورتوں کی تربیت وروزگار پروگرام کے لیے امداد 2005

Support to Training & Employment Programme f

متذکرہ بالا اسکیم غریب اور بے سہارا عورتوں کو مختلف طرح کی تربیت دینے اور انہیں روزگار حاصل کرنے کا اہل بنانے کی نیت سے 1986 میں شروع کی گئی تھی۔ حکومت کی اس پالیسی میں طبی جانچ، قانونی وطبی خواندگی، بنیادی تعلیم، امتیاز مرد و زن کے خاتمے سے متعلق اسکیمیں وغیرہ شامل ہیں۔ اس پالیسی کے مقاصد کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

1- To provide skills that give employability to wome

2- To provide competencies and skills that enable wom self-employed / entrepreneurs.

اس پالیسی کو 16 سال اور اس سے زائد عمر کی غریب عورتوں کے فائدے کے لیے نافذ کیا گیا ہے۔ اس اسکیم کے تحت مختلف شعبوں میں عورتوں کے اندر صلاحیت پیدا کرنے کو بنیادی فریضہ کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ جن میں زراعت، باغبانی، فوڈ پروسیسنگ (Food Processing)، ہینڈلومس (Handlooms)، سلائی کڑھائی اور زری کے کام، دستکاری، کمپیوٹر اور آئی۔ ٹی شعبہ، جواہرات اور زیوارت، سیر و سیاحت، ہوسپیٹالیٹی (Hospitality)، کھادی، دیہی صنعتیں وغیرہ شامل ہیں۔

نوعمر لڑکیوں کو بااختیار بنانے کے لیے راجیو گاندھی اسکیم 'سبلا' 2011

Rajib Gandhi Scheme for Empowrment of Adolesent

منسٹری آف ویمن اینڈ چائلڈ ڈیولپمنٹ (Ministry of Women and Child Development) کے تحت حکومت ہند نے 1 اپریل 2011 میں ایک پروگرام RGSEAG سبلا کے نام سے شروع کیا۔ نوجوان لڑکیوں میں خوداعتمادی پیدا کرنا، انہیں روزگار کا اہل بنانا، ان کی صحت اور غذا کو بہتر بنانا، ان میں حفظان صحت، اڈولسینٹ ریپروڈکٹیو اینڈ سیکچوال ہیلتھ (Adol e…c… Reproductive and Sexual Healt) ARSH، فیملی اور بچوں کی دیکھ بھال وغیرہ کے تئیں باشعور بنانا اس پالیسی کے بنیادی مقاصد میں شامل ہیں۔

عورتوں کی اختیار کاری کے لیے قومی مشن 2010

National Mission for Empowerment of Wor

حکومت ہند نے اس مشن کو 8 مارچ 2010 میں لانچ کیا تھا۔اس کا مقصد عورتوں کو سماجی، معاشی اور سیاسی اعتبار سے با اختیار بنانا، جنسی استحصال اور تشدد وغیرہ سے محفوظ رکھنا ہے، عورتوں کو اس قابل بنانا کہ وہ تعلیم حاصل کر پائیں، اپنی صحت اور غذا کے تئیں باشعور رہنے کے ساتھ ساتھ مختلف سرکاری اداروں کے ذریعہ فراہم کردہ طبی اور دیگر سہولیات تک رسائی حاصل کر پائیں۔

راشٹریہ مہیلا کوش 1993

Rashriya Mahila Kosh-(National Credit Fund

منسٹری آف ومین اینڈ چائلڈ ڈیولپمنٹ کے تحت حکومت ہند نے راشٹریہ مہیلا کوش، ایک خودمختار شعبہ مارچ 1993 میں قائم کیا تھا۔اس کا بنیادی مقصد ضرورت مند غریب عورتوں کو آسان شرائط پر قرض فراہم کرنا جس سے ان کی مالی پریشانیوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔

عورتوں کی معاشی اختیار کاری کے لیے جنڈر بجٹنگ

Gender Budgeting and Economic Empowerment of

جہاں بجٹ قومی آمدنی کو متاثر کرتا ہے وہیں سرکاری سرمایہ کاری کے رجحانات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔اور اس بجٹ سے یہ بھی پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ مساوات مرد وعورت کے معاملے میں اس کا کیا رول ہے۔صنفی امتیازات کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت ہند نے اس جنڈر بجٹنگ کو ایک کارگر آلے کے طور پر استعمال کیا ہے جس سے یہ پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ عورت، مرد کی طرح اس ارتقائی فوائد سے برابر خط حاصل کر پا رہی ہے یا نہیں؟ بجٹنگ کا سب سے بڑا مقصد متعلقہ شعبوں میں صنفی امتیازات کو کم سے کم کیا جائے۔عورت کو جہاں تک ہو سکے مین سٹریم میں لانے کی کوشش کی جائے۔اس سلسلے میں جنڈر بجٹ سے متعلق گوشوارے کے ذریعے اس پورے کام پر نگرانی رکھی جا رہی ہے۔

مرکزی سماجی بہبود بورڈ 1953

Central Social Welfare Board(CS

عورتوں سے متعلق شعبہ جات سے جُڑی تنظیمیں عورتوں کی فلاحی اسکیموں کے لیے اس بورڈ سے گرانٹ لے سکتے ہیں۔

ملازمت کرنے والی عورتوں کے لیے ہوسٹل، 1972، 73

Hostel for Working Women

اس اسکیم کے تحت حکومت کے معالی تعاون سے مختلف شہروں میں عورتوں کے لیے ہاسٹل بنائے جا رہے ہیں، اگر زمین کی سہولت نہیں ہے تو کرائے پر مکان لے کر بھی ہوسٹل قائم کیے گئے ہیں جہاں انہیں خود اعتماد بنانے کے لیے پیشہ ورانہ تربیت بھی دی جاتی ہے۔

راجیو گاندھی نیشنل کریچ اسکیم 2006 (نیشنل کریچ اسکیم 2017)

Rajiv Gandhi National Creche Sc

ایسی عورتیں جن کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، انہیں گھر سے باہر نکل کر کام کرنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔حکومت نے اس مشکل کے ازالے کی خاطر 2006 میں اس اسکیم کی داغ بیل ڈالی جس کے تحت 6 ماہ سے 6 سال تک کے بچوں کو کریچ کی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔اس اسکیم کو غیر سرکاری اداروں اور حکومت کے مختلف اداروں کے ذریعہ عمل میں

لایا جاتا ہے NCS کے تحت 1 مارچ 2010 تک کے سروے کے مطابق پورے ہندوستان میں 645 کریچس اپنا کام انجام دے رہے ہیں۔

اندرا گاندھی ماترتو سہیوگ یوجنا (حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کو امداد فراہم کرنے سے متعلق اسکیم) 2010

Indira Gandhi Mat'ritva Sahyog Y

اس اسکیم کے تحت حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کو مالی امداد کے ساتھ ساتھ زچگی کے وقت معقول انتظامات بہم پہنچایا جاتا ہے، تاکہ عورتیں اپنا اور اپنے بچے کی صحت کا خیال رکھ پائیں۔

زنا بالجبر کا شکار عورتوں کو مالی و دیگر امداد بہم پہنچانے کے لیے اسکیم

Financial Assiatance and Support Services to V

جنسی تشدد کے بڑھتے ہوئے واقعات کے زیر اثر، بین الاقوامی دستاویزات، ملک کے قوانین اور عورتوں سے متعلق قومی پالیسی کا احترام کرتے ہوئے اور مساواتِ مرد وزن کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کے ارادے سے یہ اسکیم عمل میں لائی گئی ہے۔ تاکہ اس قسم کی صورت حال سے دوچار عورتوں کو مالی مدد بہم پہنچایا جائے، مصیبت کے وقت ان کو سہارا دیا جائے اور انہیں تربیتی پروگراموں کے ذریعہ اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ زندگی جینے کے لیے کسی دوسرے فرد پر منحصر نہ ہوں اپنا بوجھ خود اٹھا پائیں۔

بالیکا سمردھی یوجنا (بچیوں کے مفادات کے لیے اسکیم) 1997

Balika Samriddhi Yojana(BSY)

اس اسکیم کے تحت بچی کی پیدائش اور اس کی تعلیم میں مدد پہنچائی جاتی ہے۔لڑکیوں کی پیدائش پر مبنی معاشرے کے منفی سوچ کو بدلنا، شادی کی عمر میں اضافہ کرنا، لڑکیوں کو خود کے پیروں پر کھڑا ہونے میں مدد کرنا جیسے مقاصد بھی اس اسکیم میں شامل ہیں۔

کشوری شکتی یوجنا (نوعمر لڑکیوں کی اختیار کاری کی اسکیم)

Kishori Shakti Yojana(KSY)

اس اسکیم کے اغراض میں نوعمر لڑکیوں کے لیے بہتر غذا، بہتر طبی سہولیات وغیرہ فراہم کرنا، انہیں عام صحت، حفظان صحت، عام خاندانی امور، ہنرمندی، تعلیم، سماجی ماحول وغیرہ سے متعلق معلومات سے ہم آہنگ کرنا شامل ہے۔ 11 سے لے کر 18 سال تک کی لڑکیاں ہی اس اسکیم سے فیض اٹھا سکتی ہیں۔ اس اسکیم کے اغراض میں سے ایک اہم غرض یہ ہے کہ بچیاں اس قابل بن جائیں کہ اپنی زندگی کو لے کر خود فیصلہ لے پائیں اور صحیح وغلط کے درمیاں امتیاز کر پائیں۔

قومی خواندگی مشن 1988

National Literacy Mission(NL

یہ مشن 5 مئی 1988 میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کے ذریعہ "تعلیم سب کے لیے" نام سے ایک تحریک چلی۔ اس مشن کا مقصد یہ تھا کہ 15 سے 35 سال کی عمر کے 80 میلین لوگوں کو خواندہ بنایا جائے۔ اس مشن میں دیگر امور بھی شامل ہیں جیسے مساوات مرد وزن اور عورتوں کو با اختیار بنانے اور عوام کے مختلف طبقات کے مابین باہمی میل جول پیدا کرنا۔

جن شکشن سنستھان

Jan Shikshan Sansthan

اس ادارے کا مقصد سماجی، معاشی اور تعلیمی اعتبار سے محروم شہری اور دیہی علاقے میں رہنے والے غیر خواندہ، نیم خواندہ

افراد کے لیے ووکیشنل (Vocat) ٹریننگ فراہم کرنا جس سے ان کے اندر پیشہ ورانہ طور پر کسی ایک صلاحیت کا پیدا کرنا جو ان کے علاقے کے مطابق ہو، جس سے انہیں اپنی زندگی جینے میں معاشی اعتبار سے کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ یہ ادارہ عورتوں کو پیشہ ورانہ ہنرمندی سے متعلق اسکیموں وغیرہ میں حصّہ لینے کے لیے بھی آمادہ کرتا ہے۔ آج تک کے اپ ڈیٹ کے مطابق پورے ہندوستان میں اس اسکیم کے تحت 3 2 ادارے کام کر رہے ہیں جن کے ذریعے 3,59 افراد کو ٹریننگ ملا ہے اور اندازے کے مطابق 3,49 افراد کو فائدہ پہنچا ہے۔ ہندوستان کی آبادی کے سامنے یہ کوئی بڑا اشاریہ نہیں ہے پھر بھی کہیں سے ایک لو جلتی ہوئی دکھے تو دل کو سکون ملتا ہے۔

سروشکشا ابھیان 2000

Sarva Shiksha Abhiyan (SSA)

اس اسکیم کے تحت ملک کے تمام ضلعوں میں ایک تحریک "Educatio..." کے نام سے چلائی گئی۔ اس کا مقصد 6 سے 14 سال کی عمر تک کے تمام بچوں کو مفت اور لازمی بنیادی تعلیم فراہم کرنا ہے۔ آج یہ اسکیم ہندوستان کے ہر شہر اور دیہی علاقوں میں عام ہے۔ اس کے تحت پورے ملک میں "پڑھے بھارت بڑھے بھارت" کے نام سے ایک ذیلی پروگرام بھی عمل میں لایا گیا۔ اس کا مقصد بھی بچے، جو چند ایک موضوعات میں کمزوری کے باعث بنیادی تعلیم حاصل کر نہیں پاتے ہیں انہیں کلاس 1 اور 2 میں ہی اس طرح کی تعلیم دیے جانے پر زور دیا گیا جس سے ان کی پڑھنے، لکھنے اور ریاضی کی مہارت میں اضافہ ہو۔ اگر بچہ تعلیم ترک کر بھی دیتا ہے تو اس کی اس طرح کی بنیادی مہارتیں اسے زندگی جینے میں آسانیاں فراہم کریں گی۔

مڈ ڈے مل اسکیم 1995

Mid Day Meal Scheme (MDM)

مذکورہ اسکیم 15 اگست 1995 کو "National Programme of Nutriti... to Primary Educ..." (NP-NSPE) کی حیثیت سے رو بہ عمل لائی گئی۔ اکتوبر 2007 میں اس کا نام بدل کر "Mid Day Meal in Schools" رکھا گیا۔ اس کے تحت پرائمری اور اپر پرائمری میں یعنی 6 سے 14 سال کی عمر تک کے تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کو سرکاری، نیم سرکاری، لوکال بوڈیز اسکولوں، مخصوص ٹریننگ سینٹرس (Special Training Centres-STC)، مکتب اور مدرسے جو سروشکشا ابھیان کے تحت آتے ہیں، میں دوپہر کا کھانا دیا جاتا ہے۔

ضلع ایجوکیشن پرائمری پروگرام 1994

District Primary Education Program...

یہ پروگرام پرائمری تعلیمی نظام میں ایک نئی تازگی لانے کے مقصد سے 1994ء میں عمل میں لایا گیا جس میں پرائمری تعلیمی عالمگیریت کے حصول کو اوّلیت دی گئی۔ اس پروگرام کے تحت ایسے علاقے جہاں غیر خواندہ عورتیں کی تعداد زیادہ ہے وہاں عورتوں کے لیے بھی تعلیم کا میسر انتظام فراہم کیا جاتا ہے۔

مہیلا سمکھیا اسکیم 1988

Mahila Samakhya Scheme

مرد وزن مساوات کو مدنظر رکھتے ہوئے ملک میں معاشی اعتبار سے پچھڑے اور دیہی علاقوں میں موجود عورتوں کو تعلیم فراہم کرنے، انہیں بااختیار بنانے میں ان کی سوچ کو بدلنے کے لیے حکومت نے اس اسکیم کی شروعات کی ہے۔

اس کے علاوہ ریاستی حکومتوں نے بھی مرکزی اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے کے ساتھ ساتھ اپنے علاقے کی ضروریات کو مد

نظر رکھتے ہوئے عورتوں کی فلاح و بہبودی کے لیے مختلف اسکیمیں تیار کی ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے کئی ایک غیر سرکاری ادارے بھی موجود ہیں جنہیں سرکار کی طرف سے منظوری حاصل ہے کہ وہ عورت ہی کی بہتری کے لیے جائز طریقوں کے استعمال سے مختلف اقدامات اٹھاتے رہیں۔

درج بالا قوانین کی تفصیلی وضاحت آئین ہٰذا سے متعلق ویب سائٹس پر درج ہیں۔ طوالت کے خوف نے اختصاری راہ اپنانے پر مجبور کیا۔ اس لیے کہیں آئینی وضاحت کو ضروری سمجھ کر تفصیل سے کام لیا گیا ہے اور کہیں کہیں صرف اشاروں پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ اس آئینی مطالعے نے ایک بات تو واضح کر دی ہے کہ عورت کے وجودی تحفظ اور فلاح و بہبودی کے لیے قوانین جن تعداد میں تحریر کیے گئے ہیں وہ صرف کاغذ کے پنّوں کی زینت نہ بن کر صحیح معنوں میں زمینی سطح پر عمل میں لائے جائیں تو یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ عورتیں بھی مردوں کی طرح بلا خوف وخطر، بنا کوئی جبر وتشدد کے اپنی وجودی شناخت کے ساتھ معاشرتی نظام کی فلاح و بہبودی میں مردوں کے شانہ بشانہ اہم کردار نبھاتی نظر آئیں گی۔ مگر یہ نہایت ہی افسوس کا مقام ہے کہ عورتوں کے ساتھ ہو رہے ظلم وتشدد کے ایک ایک نقطوں پر گہری نظر رکھتے ہوئے بنائے گئے قوانین آج بھی صرف اور صرف قانونی کتابوں میں دھرے رہ جاتے ہیں اور عورت اپنی جگہ تشدد کا نشانہ بن رہی ہے، لُٹ رہی ہے، جل رہی، مر رہی ہے، جبر کا دہانہ اسے جبراً اپنا نوالہ بنا لیتا ہے۔ کاش ایسے مفید قوانین زمینی سطحوں پر بھی عمل میں لائے جائیں اور ان آئین سے جُڑا ہوا ہر فرد پوری ایمانداری کے ساتھ ان قوانین کا اطلاق کرتے ہوئے مظلوم و بے بس عورتوں کی زندگی کو پُر بہار بنانے میں پیش پیش نظر آئے تو شاید حالات نہایت ہی پُر امن ہوں گے۔

☆☆☆

حوالہ جات

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	صفحہ نمبر
1۔	A. S. Altekar	The Position of Woman in Hindu Civilization From the Prehistoric times to the Present day	1
2۔	A. S. Altekar	sodhganga:inflibent.ac.in/bitstream/10603/52365/9/09/chapter%201	
3۔	A. S. Altekar	sodhganga:inflibent.ac.in/bitstream/10603/52365/9/09/chapter%201	30
4۔	ڈاکٹر محمد شہزاد شمس	عورت اور سماج	31
5۔	A. S. Altekar	The Position of Woman in Hindu Civilization From the Prehistoric times to the Present day	1
6۔	ابوزید	ہمارا قدیم سماج	129
7۔	سید سخی حسن نقوی	ہمارا قدیم سماج	123
8۔	ڈاکٹر محمد شہزاد شمس	عورت اور سماج	34
9۔	A. S. Altekar	The Position of Woman in Hindu Civilization From the Prehistoric times to the Present day	3
10۔	Vasistha Smriti	sodhganga:inflibent.ac.in/bitstream/10603/52365/9/09/chapter%201	35
11۔	Manu	sodhganga:inflibent.ac.in/bitstream/10603/52365/9/09/chapter%201	38
12۔	سید سخی حسن نقوی	ہمارا قدیم سماج	120-121
13۔	محمد مجیب	تاریخ تمدن ہند	95
14۔	ڈاکٹر شہزاد شمس	عورت اور سماج	38
15۔	ڈاکٹر شہزاد شمس	عورت اور سماج	40
16۔	پوران	مشمولہ: عورت اور سماج	42
17۔	سید سخی حسن نقوی	ہمارا قدیم سماج	125
18۔	محمد زبیر صدیقی	مشمولہ: نذر ذاکر	379
19۔	صالحہ بیگم	آج کل، اردو ماہنامہ	35
20۔	ستیش چندرا	مشمولہ: مرزا رسوا کے ناولوں کے نسوانی کردار	48
21۔	مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا آزاد کی نگاہ میں عورت کا مقام	60
22۔	قرۃ العین حیدر	مشمولہ: عورت اور سماج	51
23۔	ڈاکٹر آمنہ تحسین	مطالعات نسواں	54
24۔	پپن چندر	مشمولہ عورت اور سماج	56

25۔	ہاشم انور	مشمولہ: شاہ لطیف کی شاعری میں عورت کا روپ	59
26۔	عیسائی قول	مشمولہ: مطالعات نسواں	75
27۔	زاہدہ حنا	عورت: زندگی کا زنداں	9
28۔	اسیر ادروی	مشمولہ: عورت قرانِ کریم اور بائبل کی روشنی میں	140
29۔	مولانا ابوالکلام آزاد	ترجمان القران	880
30	ڈاکٹر محمد طاہر القادری	اسلام میں انسانی حقوق	366
31	مولانا مودودی	تفہیم القران	138
32۔	مولانا امین احسن اصلاحی	تدبر قران	245-246
33۔	راشد شاذ	پردہ مگر کس حد تک؟	31
34۔	راشد شاذ	پردہ مگر کس حد تک؟	32
35۔	مولانا سید جلال الدین عمری	عورت اور اسلام	12
36۔	عبد الماجد دریا آبادی	مشمولہ: عورت قران کریم اور بائبل کی روشنی میں	143
37۔	حدیث	مشمولہ: عورت قران کریم اور بائبل کی روشنی میں	144
38۔	حدیث	مشمولہ: عورت قران کریم اور بائبل کی روشنی میں	144
39۔	امام احمد	مشمولہ: عورت اور اسلام	28
40۔	مولانا سید انصاری	مشمولہ: مسلم خواتین کی تعلیم و ترقی میں دینی مدارس کا رول	131
41۔	اروی بنت عبد المطلب	مشمولہ: اسلام اور دیگر مذاہب و معاشروں میں عورت کے حقوق اور مسائل	216
42۔	طالب الہاشمی	مشمولہ: مسلم خواتین کی تعلیم و ترقی میں دینی مدارس کا رول	136

☆☆☆

باب سوم: مرد اور عورت کے مابین مختلف سطوح پر افتراقات اور اشتراکات

1:-حیاتیات
2:-نفسیات
3:-معاشرت
4:-معیشت

دُنیا کی تخلیق ہوئی، زمین و آسمان اپنی تکمیل کو پہنچے۔ مرئی، غیر مرئی، جاندار، غیر جاندار اشیا کی نمود، کامل دُنیا کا اہم ترین حصہ بنیں۔ خالق کا ایک بڑا مقصد وجود میں آیا۔ دُنیا کے آغاز کا پہلا دن، مغربی اُفق سے آفتاب کی آنکھ کھُلی، دھیرے دھیرے اس کی تعجب خیز روشن نگاہوں نے زمین پر نورانی خوشیاں بکھیر دیں، زمین پر موجود ہر ایک عنصر نے اپنے وجود کو محسوس کیا کرنوں کے لمس نے نباتات کو سرسبزی عطا کی، پتے جھومنے لگے کلیاں پھُوٹنے لگیں، نئے احساسات سے لبالب ہر کوئی عالم سرور میں وجدی کیفیت کے ساتھ اپنے معین مدار پر گردش کرنے لگا، یہی حرکات اعوامل دُنیا کو خوب سے خوب تر بنانے میں معاون ثابت ہوئے مگر سب کچھ بے سود ہوتا یا پھر فطری حسن پر خاک اُڑنے لگتی، نظارے وحشت ٹپکانے لگتے: آفتاب کی کرنیں بے نور ہو جاتیں کلیاں پھُوٹنا بھول جاتیں، پھول بے رنگ ہو جاتے، ندی جھرنے پیڑ پودے کوہ و آبشار بے رونق ہو جاتے جب خالق کی اشرف تخلیق، انسان خلق نہ کیا جاتا۔ خالق نے اپنے خوبصورت مخلوق کے لیے خوبصورت دُنیا کی تعمیر کی۔ یہ حسین انسان ہی تو ہے جس کی نمود سے یہ خوبصورت دُنیا سانس لے رہی ہے، اس کی دھک دھک قائم ہے۔ انسان کا ہونا ہی اس بات کا ضامن ہے کہ دُنیا کی سرسبزی اپنے شباب پر ہے، اس کی موجودگی سے دُنیا میں موجود دیگر عناصر اپنی اپنی منفرد اہمیت کے ساتھ مستقبل کی اور محوِ گردش ہیں۔ خالق کی یہ تخلیق اس قدر پُر معنی اور پُر اہم ہے کہ اس کا وجود دُنیا اور اس میں موجود تمام تخلیقات کے ہونے کو اس قدر متاثر کرتا ہے کہ بغیر انسان کے ان کا ہونا اور نہ ہونا یک برابر ہے۔

موجود دُنیا کی معنویت ذاتِ انسان کی موجودگی پر منحصر ہے۔ یہی انسان، دو اصناف میں منقسم ہے، مرد اور عورت۔ دُنیا کا نظام ایسا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے بغیر دُنیا کا حُسن درہم برہم ہو جائے۔ دونوں اپنے منفرد وجود کے ساتھ منسلک مختلف فطری قوانین و فرائض کے دائرے میں سرگردانِ عمل ہیں، اِن کا یہی عمل فطرت کی متوازی صفت کو برقرار رکھنے میں اہمیت کا حامل ہے۔ مرد اپنے دائرے کو لانگ کر عورت نہیں بن سکتا اور نہ ہی عورت اپنے حدود بھول کر مرد بننے میں کامیاب ہو سکتی ہے اور نہ ہی دونوں یک دوسرے کی انسانیت زائل کر کے یا فطرت سے ٹکر کر یک دوسرے کو یا خود کو انسان سے علیحدہ یا حیوان کے زُمرے میں داخل کر سکتے ہیں گر ایسا ہو تو یہ جنّت نُما دنیا جہنّم بن جائے. مگر افسوس! کہ ایسا ہو رہا ہے۔ دُنیا کی فطری قوانین کے ساتھ چھیڑ خانی کی جا رہی ہے، اپنی صنفی برتری کو ثابت کرنے کی ہوڑ میں مذہب کا سہارا لے کر ان قوانین میں تعجب کی حد تک تبدیلیاں کی گئیں جو آج بھی جدیدیت کی آڑ میں کی جا رہی ہیں۔ صدیوں سے مرد نے اپنی مردانہ جبریت اور حاکمیت کا دبدبہ قائم کرنے کے جنون میں اپنی مخالف صنف کے ساتھ حیوانوں کا سا سلوک روا رکھا اور صدیوں سے ایسی جابرانہ تشدد کی شکار عورت تقریباً دو سو سال سے اپنے انسان ہونے کی اہمیت کو منوانے اور وجودی شناخت حاصل کرنے کے دُھن میں چند یک میدانوں میں فطرت پر قاری ضرب لگا رہی ہے۔ نہ صدیوں کا مرد حاوی معاشرہ جو آج بھی اپنی کمزور روایت کے ساتھ موجود ہے صحیح ہے اور نہ آج کی شدّت پسند عورتیں دُرست ہیں۔ باشعور انسان شعور سے عاری ہو چُکا ہے جس کا خمیازہ بھی بُھگت رہا ہے۔

کیوں فطرت ایسے تلخ تجربات سے گزر رہی ہے؟ ایسے کون سے حالات ہیں جن کی بدولت حسنِ فطرت آہستہ آہستہ قبیح صورت اختیار کرتی جا رہی ہے؟ مرد اور عورت میں حیاتیاتی اعتبار سے ایسے کون کون سے افتراقات ہیں جو ان کے درمیان تمیز کی لکیر کھینچتے ہیں، اور ایسی کون کون سی خاصیتیں ہیں جن میں دونوں شریک ہیں؟ قدرت نے دونوں کو انسانی جون میں تو پیدا

کیااور دائرے قائم کردیے، باوجود اس کے دُنیا کی فطری توازن میں جنبش کیوں پیدا ہوئی کیوں اس کا خالص حسن داغدار ہوا، کس طرح نظامِ فطرت میں اپنے فائدے کے مطابق تصرّف کر کے معاشرتی تہذیب کا بِگ اپنے قبضے میں لے لیا گیا؟ یک صنف سردار تو بن بیٹھی مگر سرداری کے منصفانہ قوانین کو قدموں تلے روند گیا اور یک طرفہ حکومت کس طرح صدیوں تک قائم رہی؟ اس یک صنفی معاشرتی نظام نے کس طرح سے انسان کی نفسیات، معیشت، زبان، زندگی جینے کا طرز مکمل طور پر پوری انسانی زندگی کو متاثر کیا، اصلی نظام کی کایہ پلٹ دی؟ تعلیم یافتہ، حسّاس، انصاف پسند، حسنِ جہاں کا شعور رکھنے والے باشعور جدید ذہن نے کس طرح روایتی معاشرے کا سامنا کیا؟ کس حد تک اس معاشرے میں تبدیلیاں آئیں؟ کیوں غالب مرد حاوی معاشرے کی مغلوبیت میں کسی حد تک کمی کے باوجود آج بھی فطرت اپنی تباہی کا رونا رو رہی ہے؟ یہ سارے ایسے سوالات ہیں جو باشعور روشن ذہن کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ آیئے مرد اور عورت کے درمیان حائل مختلف سطوح میں جھانک کر ان سوالات کے جوابات ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حیاتیات

حیاتیات وہ سائنس ہے جو جانداروں کی اصل، ارتقاء اور خصوصیات کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کے عمل، ان کے طرز عمل اور ایک دوسرے کے ساتھ اور ماحولیات کے ساتھ ان کے تعامل کا بھی مطالعہ کرتی ہے۔ "BIOLOGY" ایک اصطلاح ہے جسے سب سے پہلے Lemarck and Treviranus نامی فرانسیسی سائنس داں نے 1802 میں استعمال کیا۔ بایولوجی، جس کی اردو اصطلاح علم حیاتیات ہے گریک زبان کا لفظ ہے جو گریک لفظ "Bios" سے مشتق ہے جس کے معنی ہے حیات (Life) Logy یا Logos لفظ کے معنی ہے علم یا مطالعہ کرنا۔ یعنی بایولوجی کی یوں تعریف بیان کی جاسکتی ہے کہ:

"Study about living organisms are called as biology"

"کسی بھی قسم کے جاندار اشیاء کے متعلق مطالعہ کو حیاتیات کہتے ہیں۔"

میرا یہ باب حیاتیاتی اعتبار سے مرد اور عورت میں افتراقات اور اشتراکات پر مبنی ہے اس لیے یہاں ہمارا مقصود صرف انسانی حیاتیات کا ذکر ہوگا۔ مرد اور عورت میں موجود حیاتیاتی اشتراکی پہلو پر بات کریں تو اندرونی اور بیرونی جسمانی اعضا زیادہ تر ایسے ملیں گے جن میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا سوائے مرد اور عورت کے تولیدی نظام کے، جن کا پورا ڈھانچہ ہی یک دوسرے سے الگ ہے اور دیگر حصّوں میں جو بھی فرق دکھائی دیتا ہے اس کی نوعیت اس طرح کی ہے کہ اسے بنیاد بنا کر کسی کمتر یا کسی کو برتر ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ مرد اور عورت کے تولیدی نظام بھی اپنی منفرد خاصیت کے ساتھ موجود ہیں جو دونوں کو جنسی اعتبار سے یک دوسرے سے الگ ضرور کرتے ہیں مگر یہ انفرادیت کمتر یا برتر کے زمرے میں رکھ کر نہیں دیکھے جاسکتے۔

مرد اور عورت کے اندرونی اور بیرونی اعضاء کی مختصر تعریف:

سب سے پہلے بیرونی اعضاء پر غور کرتے ہیں جو یک دوسرے سے مشترک ہیں۔ مرد اور عورت دونوں کی بیرونی جسمانی ہیئت دیکھنے سے یک برابر لگتی ہے۔ دونوں کے دو آنکھ، دو کان، یک ناک، یک سر، یک زبان، دو ہاتھ، دو پیر، پیٹھ، پیٹ اور سینہ اپنی اپنی جگہ پر موجود، دونوں کے سر میں بال، ہاتھوں اور پیروں میں دس دس انگلیاں، دونوں کا جسم گوشت پوشت کا جو اوپری چمڑے سے ڈھکا ہوتا ہے۔ دونوں کی جسمانی ساخت لگ بھگ یک برابر محسوس کی جاسکتی ہے۔ یک گر انسان ہے تو کسی بھی طور دوسرا کوئی اور مخلوق نہیں کہا جاسکتا۔ جب دونوں نابالغ ہوتے ہیں تو بنا عضوئے تناسل کو دیکھے کوئی نہیں بتا سکتا کہ کون لڑکا ہے اور کون لڑکی۔ سن بلوغ کے بعد جب لڑکی کے پستان بڑھنے لگتے ہیں اور لڑکے کا جسم لڑکی سے چوڑا ہونے لگتا ہے تب دونوں میں جسمانی اعتبار سے ہلکا سا فرق محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اب جسم کے اندرونی اعضاء پر غور کرتے ہیں۔

نظام عصبی کے اشتراکی پہلو (NERVOUS SYSTEM):

اس کی دو قسمیں ہیں۔ نخی (دماغی) و نخاعی نظام عصبی (CEREBRO SPINAL NERVOUS SYSTEM) اور نظام اعصاب مستقلہ (AUTONOMIC NERVOUS SYSTEM)۔ ان دونوں کی دو دو قسمیں ہیں، مرکزی (CENTRAL) اور طرفانی (PERIPHERAL)۔ طرفانی نظام اعصاب مستقلہ کی شرکیہ اور مقابل شرکیہ نام کی دو قسمیں ہیں۔ مخ (دماغ) و نخاع (حرام مغز) کے بیرونی محافظ پردے اغشیہ دماغ (MENINGES) کہلاتے ہیں۔ دماغ مرکزی نظام اعصاب کا بالائی پھیلا ہوا حصّہ ہے جو کھوپڑی کے اندر واقع ہوتا ہے۔ ابتدائی زندگی میں دماغ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی دماغ

مقدم، دماغ متوسط اور دماغ موخر۔ یہ حصے کھوکھلے ہوتے ہیں اور کچھ عرصہ بعد آپس میں کچھ حد تک مل جاتے ہیں لیکن پھر بھی الگ الگ شناخت کیے جا سکتے ہیں۔ عام طور پر مخ یا دماغ دو حصّوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک دماغ مقدم (PROSEN CEPHALON OR FORE BRAIN) دوسرا دماغ موخر (RUOMBEN CEPHALON OR HIND BRAIN)۔ دماغ مقدم دماغ قریب اور دماغ بعید اس طرح دو حصوں پر مشتمل ہے۔ دماغ قریب چھ اجزاء پر مشتمل ہے اور دماغ بعید دو نصف کروں پر مشتمل ہے جس میں آٹھ فرجات (شقوق) پائے جاتے ہیں۔ ان فرجات کے مابین دماغی نصف کروں میں چھ فصوص پائے جاتے ہیں۔ دماغ نفی پانچ اجزا پر مشتمل ہے۔ دماغی نصف کروں کے چار اندرونی اجزا ہیں۔ دماغ متوسط تین اجزا پر مشتمل ہے اور دماغ موخر چار اجزا میں منقسم ہے۔ دماغی نصف کرے میں تین سطحیں پائی جاتی ہیں، بیرونی اندرونی اور زیریں سطح۔ دماغی اعصاب (CRANIAL NERVES) خاص دماغ سے شروع ہو کر کھوپڑی کے قاعدہ کے سوراخوں سے نکل کر جسم کے مختلف اعضاء میں پھیلتے ہیں جو پورے جسم میں بارہ جوڑی ہوتے ہیں۔ مخصوص حسّی اعصاب، محرک اعصاب اور مشترک اعصاب اس طرح دماغی اعصاب کی تین قسمیں ہیں۔ نخاعی اعصاب (SPINAL NERVES) نخاع سے مقدم و موخر دو جڑوں کے ذریعہ شروع ہوتے ہیں۔ یہ دو جڑیں ایک جگہ ملتی ہیں جس سے ایک چھوٹا سا عصبی تنا (NERVE TRUNK) بن جاتا ہے۔ یہ تنا باہر آ کر دو شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اگلی شاخ اگلا ابتدائی شعبہ اور پچھلی شاخ پچھلا ابتدائی شعبہ کہلاتی ہے۔ نخاعی اعصاب تعداد میں کتیس جوڑے ہیں۔

افتراقی پہلو: دماغ کی بناوٹ ساخت مرد اور عورت میں برابر ہے فرق صرف دونوں کے وزن میں ہے۔ بالغ مرد میں اس کا وزن تقریباً 1380 گرام اور بالغ عورت میں 1250 گرام ہوتا ہے۔ مردوں میں زیادہ سے زیادہ وزن 1840 گرام اور کم از کم 964 گرام دیکھا گیا ہے اور عورت میں دماغ کا وزن زیادہ سے زیادہ 1585 گرام اور کم از کم وزن 879 گرام پایا گیا ہے۔

دیوار صدر کے اشتراکی پہلو (THORACIS WALL):

اس میں ایک عظمی غضروفی ڈھانچہ پایا جاتا ہے جس کے اندر مخصوص اعضائے حیوانیہ مثلاً قلب، بڑے عروق دمویہ، صدری اعصاب اور پھیپھڑے وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ اس ڈھانچے کی دیواریں پیچھے بارہ صدری مہروں، سامنے عظیم القصص اور جانبی اطراف میں پسلیوں کے بارہ جوڑے پائے جاتے ہیں۔ پسلیوں کی درمیانی خلاؤں میں عضلات وعروق اور اعصاب بین الاضلاع پائے جاتے ہیں۔ یہ صدری ڈھانچہ مخروطی شکل کا ہوتا ہے اس کا مدخل جو اوپر ہوتا ہے اور مخرج جو نیچے ہوتا ہے، کشادہ ہوتا ہے۔ ہر دو پسلی کے درمیان جو خلاء پائی جاتی ہے وہ خلاء بین الاضلاع (INTERCOSTAL SPACES) کہلاتی ہے۔ ہر خلا میں دو قسم کے عضلات بین الاضلاع (INTERCOSTAL MUSCLES) اور ایک اعصاب وعروق بین الاضلاع (INTERCOSTAL NERVES AND VESSELS) پائے جاتے ہیں۔ اب اعضائے تنفس (ORGANS OF RESPIRATION) کے بارے میں بات کرتے ہیں جو اسی دیوار صدر میں محدود ہوتے ہیں اور دیوار صدر بھی تنفس میں معاون ہوتی ہے۔ اعضائے تنفس میں انف یا ناک (NOSE)، حُلقوم (PHARYNX)، حنجرہ (LARYNX)، قصبۃ الریہ (TRACHEA)، شعبتین (BRONCHI) اور ریتین یا پھیپھڑے (LUNGS) شامل ہیں۔

ناک مخروطی شکل کی ہوتی ہے اس کے نیچے دو سوراخ پائے جاتے ہیں جو منخرین (NOSTRILS) کہلاتے ہیں۔ اس کا ڈھانچہ بالائی حصہ میں عظام الانف سے بنتا ہے۔ زیریں حصہ غضروفی ہوتا ہے جس میں منخرین پائے جاتے ہیں۔ تنفس کی نالی کا ابتدائی حصہ تجاویف انف (NASAL CAVATIES) کہلاتی ہے جو منخرین سے حلقوم انفی تک ہوتی ہے۔ ہر تجویف میں ایک چھت، ایک فرش اور اندرونی و بیرونی دو دو دیواریں پائی جاتی ہیں۔

حُلقوم یا حلق ایک عضلی نالی ہے جو قاعدہ الراس سے چھٹے عنقی مہرے تک بڑھتی ہے۔ حلق اوپر سے نیچے انف، دہن اور

حنجرہ سے تعلق رکھتا ہے۔اور حلق انفی (NASOPHAYRYNX)، حلق فمی (OROPHARYNX) اور حلق حنجری (LARYNGO PHARYNX) اس طرح تین حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔

حنجر تنفس کی نالی کا وہ حصہ ہے جو حلقوم اور قبصۃ الریہ (TRACHEA) کے درمیان واقع ہوتا ہے۔اس کا ڈھانچہ متعدد غضاریف سے بنتا ہے جو اس کے سوراخ کو محیط کئے ہوتے ہیں۔یہ یک غضروف درقی (THYROID CARTILAGE)، یک غضروف حلقی (CRICOID CARTILAGE)، یک غضروف لکمی (EPIGLOTTIC CARTILAGE) اور غضاریف ترجھالیہ (ARYTENOID CARTILAGES) کی یک جوڑے سے بنتا ہے۔غضروف درقی دو پھیلے ہوئے صفیحات پر مشتمل ہوتا ہے۔غضروف حلقی حنجرہ کے زیریں کنارے کے قریب پایا جاتا ہے۔یہ انگوٹھی کی مانند ہوتا ہے۔غضروف لکمی یک پتہ کی شکل کا غضروف ہے۔اس کا پتلا نچلا سرا غضروف درقی کے حدبۂ حنجیرہ کے پیچھے چسپاں ہوتا ہے اور اس کا بالائی پھیلا ہوا آزاد سرا اوپر کی طرف زبان کے پیچھے بڑھتا ہے۔غضاریف ترجھالیہ دو چھوٹے مخراطی شکل کے غضاریف ہوتے ہیں۔ گفتگو اور تقریر اور زور سے چیخنے کے دوران غضروف درقی و غضاریف ترجھالیہ اوتار الصوت کی لمبائی اور تناؤ کا تبدیل کرتے ہیں اور لقمہ نگلتے وقت مکمل حنجرہ اوپر اٹھتا ہے اور نیچے گرتا ہے اور غضروف لکمی حنجرہ کے بالائی منفذ کو ڈھکتا ہے تاکہ لقمہ کا کوئی جز حنجرہ میں داخل نہ ہو۔

قبصۃ الریہ تنفس کی نالی کا وہ حصہ ہے جو حنجرہ سے چھٹے عنقی مہرے کے مقابل شروع ہوکر نیچے عنق (گردن) اور پھر صدر (سینہ) میں اتر کر چوتھے صدری مہرہ کے زیریں کنارے کے مقابل دو شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے جو شعبتیں (BRONCHI) کہلاتی ہیں۔ان کی لمبائی تقریباً دس سینٹی میٹر ہوتی ہے اور ان کا قطر دو سینٹی میٹر ہوتا ہے۔دایاں شعبۃ الریہ (RIGHT BRONCHUS) تقریباً تین سینٹی میٹر لمبا ہوتا ہے یہ بائیں شعبہ کے مقابلہ میں زیادہ چوڑا اور زیادہ عمودی ہوتا ہے۔بایاں شعبۃ الریہ (LEFT BRONCHUS) تقریباً پانچ سینٹی میٹر لمبا ہوتا ہے۔

تجویف صدر میں غشاء الریہ کی دو تھیلیاں پائی جاتی ہیں جن میں غشاء مائی (SEROUS MEMBRANE) کا استر ہوتا ہے۔ان تھیلیوں میں پھیپھڑے محفوظ ہوتے ہیں۔غشاء الریہ کے دو طبقات ہوتے ہیں۔یک بیرونی طبقہ یا جداری طبقہ (PARIETAL PLEURA) اور دوسرا اندرونی طبقہ یا احشائی طبقہ (VISCERAL PLEURA)۔

رئتین یعنی پھیپھڑے دو ہوتے ہیں۔یک دایاں پھیپھڑا دوسرا بایاں پھیپھڑا۔پھیپھڑے ہی اصل اعضائے تنفس ہیں ہر پھیپھڑا کیس ریوی (PLEURAL SAC) میں ملفوف ہوتا ہے۔ہر پھیپھڑے میں یک راس (APEX) اور یک قاعدہ (BASE) راس گردن کی جڑ میں ہوتی ہے۔بائیں پھیپھڑے میں یک شق افقی (OBLIQUE FISSURE) پایا جاتا ہے جو اس پھیپھڑے میں دو شقوق یک افقی اور دوسرا مستعرض (TRANVERSE) پایا جاتا ہے جو اس پھیپھڑے کو تین فصص، بالائی، وسطی اور زیرین فص میں تقسیم کر دیتے ہیں۔دونوں پھیپھڑوں کے اندرونی مجاورات مختلف ہوتے ہیں۔بائیں پھیپھڑے کی اندرونی سطح پر یک گہرا نشیب قلب کے بائیں بطن (LEFT VENTRICLE OF THE HEART) کے لیے پایا جاتا ہے۔ دائیں پھیپھڑے کی اندرونی سطح پر نشیب ہلکا ہوتا ہے۔یہ قلب کے دائیں اذن کے لیے ہوتا ہے۔

افتراقی پہلو: غضروف درقی دو پھیلے ہوئے صفیحات پر مشتمل ہوتا ہے جو سامنے مردوں میں 120 درجہ پر اور عورتوں میں 90 درجہ پر باہم ملتے ہیں اور ان کے ملنے سے یک اُبھار آگے کی طرف بنتا ہے۔یہ زیر جلد رہتا ہے اسے حدبۂ حنجرہ (LARYNGEAL PROMINENCE) کہتے ہیں۔اسے ADAM'S APPLE بھی کہا جاتا ہے۔مرد اور عورتوں میں غضروف درقی کے دو پھیلے ہوئے صفیحات کا باہم ملنے کے درجات میں جو فرق پائے جاتے ہیں ان سے حرکات حنجرہ میں کوئی کمی بیشی پائی نہیں پائی جاتی۔

قلب یا دل کے اشتراقی پہلو (HEART):

اعضائے حیوانیہ میں عضو رئیس ہے۔اس کی راس نیچے اور قاعدہ اوپر ہوتا ہے یعنی یہ عضو صدر میں الٹا واقع ہوتا ہے اس بنا پر اس کو قلب کہا جاتا ہے۔قلب یک مجوّف عضلی عضو ہے۔اس کی شکل مخروطی ہوتی ہے۔یہ تجویف صدر میں قص اور غضاریف ضلعیہ کے پیچھے،حجاب حاجز کے اوپر اور دونوں پھیپھڑوں کے درمیان واقع ہوتا ہے اور غشاء القلب میں ملفوف ہوتا ہے۔قلب چار حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔دایاں اُذن (RIGHT ATRIA)، دایاں بطن (RIGHT VENTRICLE)، بایاں اُذن (LEFT ATRIA)، بایاں بطن (LEFT VENTRICLE)۔قلب میں یک قاعدہ، یک راس تین کنارے پائے جاتے ہیں۔قاعدہ (BASE) مستطیل شکل کا ہوتا ہے۔اُس کا رُخ پیچھے کی اور دہنی جانب ہوتا ہے۔یہ سیدھ کھڑا ہونے کی حالت میں چھ سے نو صدری مہروں کے مقابل ہوتا ہے۔قلب کا جوف یک درمیانی عضلی دیوار کے ذریعہ دائیں اور بائیں دو خانوں میں تقسیم ہوتا ہے اور پھر ان میں سے ہر یک خانہ دوسری غشا بطن القلب (ENDOCARDIUM) کے فاصل (پردے) کے ذریعہ دروازہ کی طرح کھلتا اور بند ہوتا ہے۔بالائی اور زیرین دو حصّوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔اوپر والے دو حصوں کو اُذنین (ATRIA) اور نیچے والے دونوں حصوں کو بطنین (VENTRICLES) کہتے ہیں۔اس طرح قلب دو اذنین اور دو بطنین چار خانوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔

افتراقی پہلو: مرد کے قلب کا وزن 280 سے 340 گرام یا 25 سے 30 تولہ تک ہوتا ہے اور عورت کے قلب کا وزن 230 سے 280 گرام یا 20 سے 25 تولہ تک ہوتا ہے۔قلب کی لمبائی 5 انچ چوڑائی 3 1/2 انچ اور موٹائی 2 1/2 انچ ہوتی ہے۔راس (APEX) بائیں بطن سے بنی ہے۔اس کا رخ نیچے، آگے اور بائیں جانب ہوتا ہے یہ پانچویں فضائے بین الاضلاع میں قص کے خط سطحی سے تقریباً 8 سینٹی میٹر کے فاصلہ پر واقع ہوتی ہے اور عورتوں میں بائیں حلمہ 4 سینٹی میٹر نیچے اور 9 سینٹی میٹر اندرونی جانب واقع ہوتا ہے۔قلب کی حرکت یک منٹ میں بہتر مرتبہ ہوتی ہے۔یعنی ہر حرکت 1/72 منٹ یا 8 سیکنڈ میں ہوتی ہے۔اس آٹھ سیکنڈ میں سے اُذن کا انقباض 5. سیکنڈ میں اور انبساط 75 سیکنڈ میں ہوتا ہے اور بطن کا انقباض 3. سیکنڈ میں اور انبساط 5. سیکنڈ میں ہوتا ہے۔مرد اور عورت کے قلب کے وزن اور اس کے راس (APEX) کے وقوع پذیری کا فرق دونوں کے حرکت قلب میں کوئی بھی فرق ظاہر نہیں کرتا ہے۔پورے جسم میں دوران خون کا عمل بھی دونوں جنسوں میں یک برابر ہوتا ہے۔فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ شریان تناسلی ظاہر سطحی (SUPERFICIAL EXTERNAL PUDENDAL ARTERY) مردوں میں قضیب (PENIS) اور کیس خصیہ (SCROTUM) میں پھیلتی ہے اور عورتوں میں شفران کبیران (LABIA MAJORA) میں پھیلتی ہے۔

جلد کے اشتراقی پہلو (Skin):

قوت لامسہ کا وسیع و عریض عضو جلد ہے۔اس کے ساتھ ہی یہ بدن کے لیے یک وسیع پوشش (لباس) بھی ہے جس کی وجہ سے اعضاء کی حفاظت ہوتی ہے۔علاوہ ازایں جلد کے ذریعہ رطوبت جسمانی کے افراز اور انجذاب کا کام بھی انجام پاتا ہے۔جلد دو طبقات پر مشتمل ہوتی ہے۔یک بیرونی طبق جو بشرہ (EPIDERMIS) کہلاتا ہے اور دوسرا اندرونی طبق جو اَدمہ (DERMIS) کہلاتا ہے۔جلد کی ساخت اور عمل میں بھی مرد اور عورتوں میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

نظام ہضم کے اشتراکی پہلو:

اعضائے ہضم میں زبان، حلقوم، مری، معدہ، امعاء صغیرہ کبیرہ، جگر، طحال، بانقراس شامل ہیں۔حلقوم کا ذکر اوپر آچکا ہے۔زبان (TONGUE) یک عضلی عضو ہے جو منھ اور حلق کے فرش پر پایا جاتا ہے۔زبان میں احساس ذائقہ کی قوت پائی جاتی ہے۔اس کی نوک آگے نکلی ہوتی ہے اور آزاد ہوتی ہے۔اس کی بالائی سطح غشا مخاطی سے پوشیدہ ہوتی ہے اور یک V کی شکل کی میزاب سے اگلے دو تہائی اور پچھلے یک تہائی حصہ میں تقسیم ہوتی ہے۔زبان کی پشت کے اگلے حصہ کے غشاء مخاطی

میں کچھ بڑے اور چھوٹے ابھار پائے جاتے ہیں جو حُلیمات (PAPILLAE) کہلاتے ہیں۔

مری کے اشترا کی پہلو (OESOPHAGUS):

یہ یک عضلی نالی ہے جو حلق سے معدہ تک ہوتی ہے اس کی لمبائی دس انچ ہوتی ہے۔ یہ غضروف لا سمی کے زیرین کنارے کے مقابل شروع ہو کر گیارہویں صدری مہرے کے مقابل ختم ہوتی ہے۔ یہ ابتداء میں گردن اور صدر کے بالائی حصہ میں قصبتہ الرّیہ کے انقصام کے نیچے: قلب اور عمودی فقری کے درمیان ہوتی ہے اور آخر میں کچھ بائیں جانب مائل ہوتی ہے۔

معدہ کے اشترا کی پہلو (STOMACH):

معدہ مجرائے غذائی کا پھیلا ہوا حصّہ ہے جو مشک کے مانند ہوتا ہے۔ یہ مری (OESOPHAGUS) کے زیرین سرے اور اثناعشری کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ بطن کے نو حصوں میں سے معدہ شرسیفی (EPIGASTRIC REGION) بائیں قسم تحت الشراسیف (LEFT HYPOCONDRIAL REGION) اور قسم سُرّی (UMBILICAL REGION) کو گھیرتا ہے۔ آب و غذا سے پُر ہونے کی حالت میں معدہ کی لمبائی بیس انچ اور چوڑائی چار انچ ہوتی ہے۔

جگر کے اشترا کی پہلو (LIVER):

یہ جسم کا سب سے بڑا غُدّہ ہے۔ یہ دائیں قسم تحت الشراسیف (RIGHT HYPOCHONDRIAC REGION) کے تمام تر حصہ کو قسم شراسیف (EPIGASRIC REGION) کے زیادہ تر حصہ کو قسم قطنی (LUMBAR REGION) کے کچھ حصے کو اور بائیں قسم تحت الشراسیف (LEFT HYPOCHONDRIAC REGION) کے کچھ حصہ کو گھیرے رہتا ہے۔ اس کی سطحیں چکنی ہوتی ہیں اور اس کا رنگ گہرا کتھئی ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی دائیں سے بائیں 7 سے 10 انچ، چوڑائی اوپر سے نیچے 6 انچ ہوتی ہے اور اس کا وزن 3 تا 4 پونڈ ہوتا ہے۔ جگر کا وزن پورے جسم کے وزن کا 1/3 ہوتا ہے مگر نوزائدہ بچے میں جگر کا وزن جسم کے وزن کا 1/16 ہوتا ہے۔ جگر میں پانچ سطحیں پائی جاتی ہیں۔

بانقراس (PANCREAS) یک غُدّہ ہے جو معدے اور باریطون کے پیچھے بطن کی پچھلی دیوار پر واقع ہوتا ہے۔ اس کو اطبائے قدیم نے دُمِ طحال کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس کی لمبائی چھ انچ، چوڑائی 1 1/2 انچ اور موٹائی 1 1/4 انچ ہوتی ہے۔ اس کے چار حصے ہوتے ہیں سر گردن، جسم، دم۔ اس کا وزن تقریباً 180 گرام ہوتا ہے۔ اور یہ ناف سے 3 یا 4 انچ اوپر پہلے و دوسرے قطنی مہروں کے مقابل عرضاً واقع ہوتا ہے۔ اس غدہ سے رطوبت بانقراس کا افراز ہوتا ہے۔ غدہ بانقراس میں دو قسم کے خلیہ پائے جاتے ہیں جو مختلف افعال ہضم انجام دیتے ہیں۔

طحال (SPLEEN) جسم کا یک بڑا غدّہ ہے جو بائیں قسم تحت الشراسیف (LEFT HYPOCHONDRIAC REGION) میں نویں سے گیارہویں بائیں پسلیوں کے مقابل واقع ہوتا ہے۔ اس کی شکل بیضوی اور ساخت اسفنجی ہوتی ہے اور رنگ گہرا کتھئی ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی پانچ انچ چوڑائی تین انچ ہوتی ہے۔ اس میں دو سطحیں حجابی (DIAPHRAGMATIC SURFACE) اور احشائی (VISCERAL SURFACE) اور چار کنارے پائے جاتے ہیں۔ طحال، ناف کے علاوہ مکمل طور پر باریطون میں ملفوف ہوتی ہے۔ طحال کے باریطونی رباطات دو ہوتے ہیں۔ رباط معدی طحال اور رباط کُلوی طحال۔ ہم نے دیکھا کے نظام ہاضمہ کی تمام ساختوں میں ایسا کوئی فرق موجود نہیں ہے جو مرد اور خواتین کے درمیان نابرابری پیدا کرے۔

گُردہ کے اشترا کی پہلو (KIDNIES):

اعضائے بول یعنی کُلیتین یا گُردے کے متعلق جانتے ہیں۔ گردے تعداد میں دو ہوتے ہیں۔ یک دایاں گردہ اور دوسرا بایاں گردہ۔ دونوں گردے پچھلی دیوار بطن کے سامنے باریطون کے پیچھے واقع ہوتے ہیں۔ دایاں گردہ، بائیں گردے سے

کچھ نیچے واقع ہوتا ہے کیونکہ دائیں جانب جگر واقع ہوتا ہے اور اس کے دباؤ سے دایاں گردہ کچھ نیچے کھسک جاتا ہے۔ دائیں گردے کا بالائی سرا گیارہویں پسلی کے زیریں کنارے کے مقابل ہوتا ہے اور گردوں کے زیریں سرے عرف الخاصرہ سے 1 1/2 انچ اور یک انچ کے فاصلے پر ہوتے ہیں۔ گردہ کی لمبائی 4 انچ چوڑائی 2 1/2 انچ ہوتی ہے اور موٹائی 1 1/2 انچ ہوتی ہے۔ وزن 4 1/2 اونس ہوتا ہے۔ گردے یک لیفی غلاف (FIBROUS CAPSULE) میں ملفوف ہوتے ہیں جس کو با آسانی جدا کیا جا سکتا ہے۔ گردوں کی اگلی اور پچھلی دو سطحیں اندرونی اور بیرونی دو کنارے ہوتے ہیں۔ حالبین (URETERS) دو بیساب کی عضلی نالیاں ہوتی ہیں جو ناف الکلیہ (HILUS OF KIDNEY) سے مثانہ تک جاتی ہیں۔ سر حالب کا بالائی سرا پھیلا ہوا ہوتا ہے اور حوض حالب PELNIS کہلاتا ہے۔ سر حالب کا بالائی نصف حصہ دیوا بطن مقدم پر اور باقی حصہ عانہ میں رہتا ہے۔

افتراقی پہلو: مردوں میں حالب کا عانی حصہ عروق مشترکہ کا مفصل عجزی خاصری کے سامنے عبور کرتا ہے اور عانہ میں شوکہ و کیہ (ISCHIAL SPINE) تک اترتا ہے جہاں مجرائے منوی (DUCTUS SEFERENCE) اس کو اوپر سے عبور کرتی ہے۔ عورتوں میں حلاب کا یہ حصہ شوکہ و کیہ تک مردانہ حالب کی طرح اترتا ہے اور پھر یہاں سے یہ آگے و اندرونی جانب رباط عریض (BROAD LIGAMENT) کی جڑ کے نیچے سے گزرتا ہے اور یہاں اس کو اوپر سے شریان رحمی (UTERINE ARTERY) عبور کرتی ہے اور یہ مہبل کے جانبی طاق (LATERAL FORNIX OF VAGINA) سے مجاور ہوتی ہے۔

مثانہ کے اشتراکی پہلو (BLADDER):

یک عضلی کیس (تھیلی) ہے جس میں بول یعنی بیساب (URINE) گردوں سے حالبین کے ذریعہ آتا ہے اور پھر اس سے بول مجری البول (URETHRA) خارج ہوتا ہے۔ مثانہ عانہ میں واقع ہوتا ہے اور نسیج لیفی (FIBROUS TISSUE) سے ملفوف ہوتا ہے۔ بیساب کی مقدار کے مطابق یہ پھیلتا ہے۔ بول سے کھالی ہونے پر یہ مخراطی شکل کا ہوتا ہے اس کی راس (APEX) PUBIS SYMPHYSIS کے پیچھے واقع ہوتی ہے اور اس کا قاعدہ (BASE) پیچھے واقع ہوتا ہے۔

افتراقی پہلو: مثانہ کی بالائی سطح خواتین میں رحم (UTERUS) سے اور مردوں میں امعاء کے پیچ و خم سے متصل رہتی ہے۔ مثانہ کا قاعدہ، معاء مستقیم (RECTUM) کے سامنے رہتا ہے۔ عورتوں میں یہ مہبل کے ذریعہ اور مردوں میں مجرائے منوی و خزانہ منوی کے ذریعہ معاء مستقیم سے جدا رہتا ہے۔ نیچے کی طرف عنق المثانہ، مردوں میں غدہ مذی (PROSTATE) کے حلقہ سے اور خواتین میں حجاب بول تناسل (UROGENITAL DIAPHRAGM) سے محدود ہوتی ہے۔

یہاں تک ہم نے دیکھا کہ انسانی جسم کی اندرونی اور بیرونی ساخت کے اشتراکی اور افتراقی عناصر کسی بھی پیمانے پر یک کو بڑا اور دوسرے کو چھوٹا ثابت نہیں کرتے ہیں۔ آیئے اب دیکھتے ہیں چند یک بڑے افتراقات جو مرد اور خاتون کے جسم میں نمایاں ہے۔ یہ اعضائے تناسل کا حصہ ہے جو دونوں میں مختلف ہوتا ہے۔

مردانہ اعضائے تناسل:

یہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ظاہری اعضائے تناسل اور باطنی اعضائے تناسل۔ ظاہری اعضائے تناسل دو حصوں میں بٹا ہوتا ہے۔ یک قضیب یا ذکر (PENIS) و مجری البول (URETHRA) اور دوسرا خصیتین واغدیداس (TESTES AND EPIDIDYMIS) کیس خصیہ (SCROTUM)۔ باطنی اعضائے تناسل غدہ منوی (PROSTATE)، قناۃ منوی (VAS DEFERENCE)، خزانہ منی (SEMINAL) اور قناۃ دافعہ (EJACULATORY DUCT)۔

قضیب تین طویل اسطوانی اجسام سے مرکب ہوتا ہے جو نسیج العاشیہ (ERECTILE TISSUE) سے بنتے ہیں۔ سطی جسم، جسم اسفنجی (CORPUS SPONGIOSUM) اور دو جانبی اجسام، اجسام اجوف (CORPORA CAVERNOSA)

کہلاتے ہیں۔ قضیب کی جڑ کا اتصال غشاء عجانیہ(PERINEAL MEMBRANE) اور یک معلق اُسطوانی جسم سے ہوتا ہے۔ جسم اسفنجی نیچے کی طرف بصلۂ غشاء عجانیہ(BULB OF PERINEAL MEMBRANE) سے اتصال کرتا ہے۔ جسم اسفنجی سے مجری البول(URETHRA) گزرتا ہے جو حشفہ کی راس پر منفذ بولیہ ظاہرہ(EXTERNAL URETHRAL ORIFICE) پر کھلتا ہے دونوں اجسام اجوفیہ پشت پر باہم یک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں اور ان کے اگلے سرے حشفہ کے ساتھ مدغم ہوتے ہیں اور پیچھے التحام عانہ کے نیچے یک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں اور ساقین ذکر (CRURA OF THE PENIS) بناتے ہیں۔ لفافۂ سطحیہ کا غشائی طبقہ ذکر کو ملفوف کرتا ہے اور اجسام اجوفیہ کے ساتھ حشفہ کے ٹھیک پیچھے مدغم ہو جاتا ہے۔ ذکر کے اوپر جلد بھی پتلی اور بے بال ہوتی ہے اور نیچے و آگے کی طرف حشفہ کا غلاف بناتی ہے جو قلفتہ الحشفہ (PREPUCE) کہلاتا ہے اس میں یک چھوٹی شریان پائی جاتی ہے جس کی بندش ختنہ کے وقت ضروری ہے۔

مجریٰ البول مردانہ(URETHRA) نالی کی مانند ہوتا ہے اس کی لمبائی بیس سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ یہ تین حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ مجرائے بول مذوی (PROSTATIC URETHRA)، مجرائے بول غشائی (MEMBRANOUS URETHRA)، مجرائے بول اسفنجی (SPONGY URETHRA)۔ مجرائے بول مذوی پیشاب کی نالی کا چوڑا اور پھیلا ہوا حصّہ ہے۔ جو غدّہ مذی میں ملفوف ہوتا ہے یہ تین سینٹی میٹر لمبا ہوتا ہے اور غدّہ مذی میں آگے کی طرف بڑھتا ہے۔ مجرائے بول غشائی یک تنگ حصہ ہے جو زیادہ سخت ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی یک سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ مجرائے بول اسفنجی کی لمبائی سولہ سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ غدد وَدی (BULBOURETHRAL GLAND) دو چھوٹی چھوٹی گول زرد رنگ کی گلٹیاں ہیں۔ ہر یک مٹر کے دانہ کے برابر ہوتی ہے۔ یہ غشاء مجری البول کے پیچھے و بیرونی جانب واقع ہوتے ہیں۔ ہر نالی یک تنگ عضلی مجریٰ ہے جسے مجریٰ منی(VAS DEFERENCE) کہتے ہیں۔ مجرائے منی پیچ در پیچ ہر یک مضبوط جھلّی میں ملفوف ہوتی ہے جو خزانۂ منی (SEMINAL VASICLE) کہلاتی ہے۔

ظاہری اعضائے تناسل کے خصیتین واغدیدوس(TESTES AND EPIDIDYMIS) یہ دونوں خصیے بیضوی شکل کے ہوتے ہیں جو کیس خصیہ(SCROTUM) میں حبل المنی(SPIRMATIC CORD) کے ذریعہ لٹکے رہتے ہیں۔ حبل المنی کی لمبائی چار سینٹی میٹر ہوتی ہیں اور ہر یک خصیہ سوا سے دو انچ تک لمبا یک انچ چوڑا اور سوا انچ موٹا ہوتا ہے۔ خصیہ کے پچھلے کنارے پر یک لمبا چپٹا جسم اس سے متصل ہوتا ہے جو اغدیدوس(EPIDIDMIS) کہلاتا ہے۔

زنانہ اعضائے تناسل:

یہ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ظاہری اعضائے تناسل اور باطنی اعضائے تناسل۔ جبل العانہ(MONS PUBIS)، شغران کبیران (LABIA MAJORA) اور شغران صغیران(LABIA MINORA) ظاہری اعضائے تناسل ہیں۔ مہبل(VAGINA)، رحم(UTERUS)، خصیتہ الرحم(OVARIES) اور وقاذفین(FALLOPIAN TUBE) باطنی اعضائے تناسل ہیں۔

جبل العانہ کے اوپر یک شحمی ابھار ہے۔ بعد بلوغ بال اس پر اُگتے ہیں۔ شغران کبیران فرج کے دو ظاہری بڑے لب ہیں۔ ان کے اندر دو چھوٹے لب پائے جاتے ہیں جو شُفران صغیران کہلاتے ہیں۔ لبوں کے مابین جو فضا پائی جاتی ہے دہلیز(VASTIBULAE) کہلاتی ہے۔ اس فضا میں اوپر مجرائے بول اور پیچھے کی طرف مہبل کے منافذ پائے جاتے ہیں۔ منفذ مجرائے بول کے سامنے ذکر کے مانند یک چھوٹا ابھرا ہوا زائدہ پایا جاتا ہے جو بعض عورتوں میں بڑا اور مردوں کی ذکر(PENIS) کے مانند ہوتا ہے۔ زنانہ مجرائے بول کی لمبائی تقریباً تین سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ یہ مثانہ کی گردن سے نیچے اترتا ہے۔ اس کا منفذ (دہانہ) نظر اور منفذ مہبل کے مابین کھلتا ہے۔ مہبل یک نالی ہے جس کی لمبائی آٹھ سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ یہ رحم

سے شق فرجیہ (PUDENDAL CLEFT) تک بڑھتی ہے اور معا مستقیم کے سامنے مثانہ و مجرائے بول کے پیچھے واقع ہوتی ہے۔ مہبل کا دہانہ، ہر کرہ یک، مکمل پردہ کے ذریعہ کچھ بند رہتا ہے یہ پردہ پردۂ بکارت کہلاتا ہے۔ بعض لڑکیوں میں اس پردہ کے اندر باریک سوراخ پائے جاتے ہیں اور بعض لڑکیوں میں یہ بالکل بند رہتا ہے۔ جس کی بنا پر ان کا خون حیض خارج نہیں ہو پاتا۔ پردۂ بکارت پہلی دفعہ کے جمع کے بعد شق ہو جاتا ہے۔ رحم یک مجوف عضلی عضو ہے۔ اس کی دیواریں دبیز ہوتی ہیں یہ مثانہ اور معا مستقیم کے مابین واقع ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی آٹھ سینٹی میٹر، چوڑائی پانچ سینٹی میٹر اور موٹائی تین سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ یہ نیچے مہبل میں کھلتا ہے اور مہبل سے زاویہ قائمہ پر ملتا ہے۔ رحم تین حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ قاع الرحم (FUNDUS)، جسم رحم (BODY) اور عنق الرحم (CERVIX)۔ خصیتہ الرحم (OVARIES) بادام کی شکل کی دو گلٹیاں ہیں جو رحم کے دونوں جانب رباط عریض کے بعیدی سروں کے ساتھ باریطونی تہوں والے جھالردار حصہ پر چسپاں ہوتی ہیں۔

پستان (MAMMARY GLANDS):

پستان چھاتی کے غدد ہیں۔ جوان عورت کے پستان نرم و نصف کروی ہوتے ہیں۔ یہ صدر کے سامنے واقع ہوتے ہیں اور نسیج غدوی (GLANDULA TISSUE) سے بنے ہیں۔ پستان کے راس یعنی حلمہ (NIPPLE) کے گرد یک رنگین حاشیہ ہوتا ہے جو حلقۂ ثدویہ (AREOLA) کہلاتا ہے۔ حمل کے زمانے میں پستان کی جسامت بڑھ جاتی ہے اور بچہ کے لیے دودھ کا افراز بڑھ جاتا ہے۔

مذکورہ بالا افتراقات متفرق تولیدی نظام کے سبب مرد اور عورت کے جسم میں نمایاں فرق کے ساتھ موجود ہیں۔ نہیں بنیاد بنا کر حیاتیاتی اعتبار سے یک کو دوسرے سے بڑا ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ مگر عورت کے ساتھ اس بنیاد پر ہی نابرابری کے سلوک روا رکھے گئے ہیں۔ علم الابدان کے ماہر جنہوں نے انسان کی طرح نہیں بلکہ مرد بن کر عورت پر نگاہ مرکوز کی، دونوں کے جسم میں موجود افتراقات کا یوں ذکر کرتے ہیں کہ عورت کا دماغ مرد کے دماغ سے چھوٹا ہوتا ہے، عورت قد اور وزن میں بھی مرد سے کم ہے، اس کی ہڈیاں اپنے حجم اور مضبوطی میں مرد کی ہڈیوں سے کمزور ہوتی ہیں، اس کا قلب مرد کے قلب سے چھوٹا ہوتا ہے، یہاں تک کہا گیا کہ عورت کی طبعی حرارت مرد کے مقابلہ میں بہت کم یا نصف سے کچھ زائد ہے۔1۔ فرید وجدی آفندی یہاں تک بھی لکھتے ہیں کہ علامہ نیکولس اور علامہ بیلی نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے حواس خمسہ مرد کے حواس خمسہ سے ضعیف تر ہیں۔2۔ یہاں تک کہ وہ مرد سے کم عقل ہے، اس کے اخلاق بھی مرد سے بالکل الگ ہیں۔ وہ قوت شامہ ہو یا قوت ذائقہ یا قوت سامع، ان معاملات میں بھی عورت مرد سے کمتر ہے۔ فرید وجدی آفندی یہاں تک بھی لکھتے ہیں کہ علامہ نیکولس اور علامہ بیلی نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے حواس خمسہ مرد کے حواس خمسہ سے ضعیف تر ہیں۔3۔ عورت کا خون مرد کے خون سے مقدار اور ترکیب دونوں میں مختلف ہے۔ محمد اجمل اپنی تصنیف ''اردو نظم میں عورت کا تصور'' میں ایم عبدالرحمٰن کی تحریر درج کرتے ہیں:

> ''عورت کے خون کی مقدار مرد سے کم ہوتی ہے اور اس ۔۔۔ میں نمکین اجزا اور اسی طرح ہیمو گلوبین کم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سرخ خون کے اجزا عورت میں زیادہ ہوتے ہیں اور مرد میں سفید خون کے اجزا کی کثرت ہوتی ہے۔''4۔

فرید وجدی آفندی انسائیکلوپیڈیا میں درج ڈاکٹر فاریٹی کا قول درج کرتے ہیں:

> ''مجموعی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو عورت کے جسم کے عضلات مرد کے عضلات سے اس درجہ مختلف ہیں اور حجم و قوت کے لحاظ سے عورت کے عضلات اس قدر ضعیف ہیں اگر ان کی طبعی قوت کے تین حصے کیے جائیں تو دو حصے قوت مرد کے حصے میں آئے گی اور صرف یک حصہ قوت عورت میں ثابت ہو گی۔ عضلات کی حرکت کی سرعت اور ضبط کا بھی یہی حال ہے۔ مرد کے عضلات جسمی عورت کی نسبت حرکت میں زیادہ

تیز اور اپنے فعل میں زیادہ قوی ہیں۔''5

انیسویں صدی کے انسائیکلو پیڈیا کا مصنف عورت کے اعضاء پر دقیق بحث کر کے یہ نتیجہ نکالتا ہے:

''درحقیقت عورت کی جسمانی ترکیب قریب قریب بچے کی جسمانی ترکیب کے واقع ہوئی ہے۔اس لیے تم دیکھتے ہو کہ بچے کی طرح عورت کا بھی حافظہ ہر قسم کے اثر سے بہت جلد اور بہت زیادہ متاثر ہو جاتا ہے۔بچے کا قاعدہ ہے کہ اگر کوئی رنج یا افسوس کا واقعہ پیش آئے تو فوراً رونے لگتا ہے،اور اگر کوئی خوشی کی بات ہو تو بے اختیار ہو کر اچھلنے کودنے لگتا ہے۔قریب قریب یہی حال عورت کا ہے کہ بہ نسبت مرد کے بہت زیادہ اس قسم کے جذبات سے متاثر ہوتی ہے کیونکہ یہ موثرات اس کے تصور پر اس طرح اثر ڈالتے ہیں کہ عقل کو ان سے لگاؤ نہیں ہوتا۔یہی وجہ ہے کہ ان میں استقلال نہیں ہوتا اور اسی لیے سخت اور خوفناک موقعوں پر عورت ثابت قدم نہیں رہ سکتی۔''6

تعجب ہے کہ برتری کا نشہ اور حکم بنے رہنے کی ہوس ذہانت پر کس طرح مخل انداز ہوتی ہے کہ انسان اپنے طور پر کیسے کیسے تصورات گھڑ لیتا ہے۔عورت کے برخلاف درج بالا باتیں حقیقت سے زیادہ نفسیات پر مبنی ہیں۔جن جن جسمانی اختلافات کی نمائش کر کے عورت کو کمزور، ناقص العقل،ضعیف بنانے کی کوشش کی گئی ہے اس میں بھی صدیوں سے تربیت یافتہ عورت متعلق نفسیات کا ہی زیادہ عمل دخل ہے نہ کہ جسمانی افتراقات کا۔بظاہر برابر دکھنے والے دو جنس کس طرح ایک دوسرے سے اتنے الگ ہو سکتے ہیں۔تولیدی نظام کے سبب جو بھی جسمانی فرق دونوں میں موجود ہیں اس کے پیچھے بھی خالق کا ایک مقصد انسانی تعداد میں اضافہ ہے کہ دُنیا پھلتی پھولتی رہے۔اس کے علاوہ دونوں میں اگر خالق نے کوئی فرق نہیں کیا تو پھر اتنی اونچ نیچ پیدا کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ضرورت، اقتدار کا ہوس،حکومت کرنے کی للک ظلم کرنے کے رجحان میں مضمر تھی۔پروفیسر وارث میر لکھتے ہیں:

''کیا عورت کے کانوں کی ساخت مرد کے کانوں سے مختلف۔ کیا عورت کی آنکھوں کا مصرف مرد کی آنکھوں سے مختلف ہے۔ اگر قدرت کا کوئی ایسا منشا ہوتا کہ عورت اس کی عطا کردہ صلاحیتوں کا صرف محدود استعمال کر سکتی ہے تو قدرت عورت کی ان صلاحیتوں کو خود ہی کوئی مختلف ساخت دے دیتی۔''7

یہ بات قابل از قبول ہے کہ قدرت کا ایسا کوئی بھی منشا نہیں ہے، اگر ہوتا تو ہمیں انسان اور دیگر جانوروں کے جسمانی ساخت میں فرق کی طرح مرد اور عورت میں بھی افتراقات نمایاں نظر آتے۔قدرت مرد سے الگ عورتوں کو مختلف ساخت عطا کر دیتی۔ایسی ساخت جو دیگر جانداروں کی طرح شعور اور حس سے عاری ہوتی مگر نہیں عورتیں بھی مردوں کی طرح شعور اور جذبے کا احساس رکھتی ہیں۔اچھے برے میں فرق کی تمیز ان کے پاس موجود ہے۔اب دوسرے دانشوروں کی آراء دیکھتے ہیں کہ وہ مرد عورت کی حیثیت کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔جان اسٹورٹ مل لکھتے ہیں:

''عورتیں جو کچھ اب ہیں یا ہو سکتی ہیں وہ محض اس لیے نہیں کہ ان کی فطرت میں کوئی خاص کمزوری ہے۔اب تک تو فی الجملہ ان کا وجود ایک غیر فطری فضا میں رہا ہے جس سے ان کی ہر قسم کی باڑھ مرتی رہی اور میرا خیال یہی ہے کہ اگر اُن پر (سوائے ان پابندیوں کہ جو معاشرت انسانی کے حالات کے لحاظ سے بالکل ضرور ہیں) پابندیاں عائد نہ ہوں تو جہاں تک عمل کا تعلق ہے فی الجملہ ان میں اور مردوں میں کوئی اہم فرق بالآخر نہ پایا جائے گا۔''8

میں بھی اس کی تائید کرتی ہوں کہ صدیوں کا مرد حاوی نسخہ عورت کی ضعف کا ضامن ہے نہ کہ وہ خود صلاحیت نہیں رکھتی۔ آج اسے ہر میدان میں مواقع میسر آرہے ہیں تو اسے کون روک پا رہا ہے۔ضروری نہیں ہے کہ جو جسمانی اعتبار سے طاقتور اور وزنی ہو اس میں دیگر صلاحیتیں بھی پھوٹ پڑیں۔چاہے وہ مرد ہو یا عورت ہر کوئی اپنے عمل سے پہچانا جاتا ہے حجم سے

نہیں۔ویسا گر ہوناتو بھی اپنے بھاری کم جسم کے ساتھ انسان سے زیادہ عقل منداور عمل ہونا۔چھوٹا قد کم حجم کسی کی صلاحیت وقابلیت کوناپنے کے آلے نہیں بن سکتے۔اس کے حرکت عمل اور ذہانت سے اس کی شخصیت کا معیار پتہ لگایا جاسکتا ہے۔یہاں یک اور بات شرمندگی کا باعث ہے کہ جتنی ساری صفات عورت کوعورت بناتی ہیں نہیں ہی بنیاد بنا کر اسے کمزور ثابت کیا جارہا ہے۔یک اس کا حیض اور دوسرا تولیدی معاملہ۔عورت کے وجود کے ساتھ جڑے ہوئے یہ دو عناصر اس کی ضعف نہیں بلکہ اس کی بلندی کوظاہر کرتے ہیں۔کیوں کہ جو تخلیقی عمل وہ سرانجام دیتی ہے وہ مرد کے بس کی بات نہیں ہے۔جو مر کرنا ہے وہ سارے کام عورت کرسکتی ہے۔مگر دنیا کا سب سے اہم کام جوعورت سرانجام دیتی ہے اس کے بارے میں مرد سوچ بھی نہیں سکتا۔بچے کی پیدائش کے وقت وہ جس اذیت سے گزرتی ہے مرد اس کا یک چھوٹا سا حصہ بھی گر برداشت کرے تو ہونے والے بچے کے تصور سے بھی خوف کھائے۔تو پھرعورت کس طرح یک بچے کی سی صلاحیت رکھتی ہے۔یہ ضرور ہے کہ دوران حیض ہر ماہ اسے مختلف طرح کی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔

1۔ جسم میں حرارت روکنے کی قوت کم ہوجاتی ہے۔اس لیے حرارت زیادہ خارج ہوتی ہے اور درجہ حرارت گر جاتا ہے۔

2۔ نبض سست ہوجاتی ہے۔خون کا دباؤ کم ہوجاتا ہے۔خلایائے دم کی تعداد میں فرق واقع ہوجاتا ہے۔

3۔ درون افرازی غدد (Endocrines) گلے کی گلٹیوں (Tonsils) اور غدد لمفاوی (Lympyatic Glands) میں تغیر واقع ہو جاتا ہے۔

4۔ پروٹینی تحول (Protien Metabolism) میں کمی آجاتی ہے۔

5۔ فاسفیٹس اور کلورائیڈ کے اخراج میں کمی اور ہوائی تحول (Gaseous Metabolism) میں انحطاط رُنما ہوتا ہے۔

6۔ ہضم میں اختلاط واقع ہوتا ہے اور غذا کے پروٹینی اجزا اور چربی کے جزو بدن بننے میں کمی آجاتی ہے۔

7۔ تنفس کی قابلیت میں کمی اور گویائی کے اعضا میں خاص تغیرات واقع ہوتے ہیں۔

8۔ عضلات میں سستی اور احساسات متاثر ہوتے ہیں۔

10۔ ذہانت اور خیالات کو مرکوز کرنے کی طاقت کم ہوجاتی ہے۔9

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ اتنی اذیت ہر ماہ جھیلنے کے بعد بھی وہ بلا چوں و چرا ان دنوں میں معمول کی طرح زندگی گزارتی ہے۔گھریلوعورت چوبیس میں سے بائیس گھنٹے مصروف رہتی ہے۔صبح تڑکے اٹھنا رات میں آخر میں سونا،بچوں کی تربیت گھر کے سارے کام،بزرگوں کی خدمت،شوہر کی دلجوئی سب کچھ مشین کی طرح کرتی رہتی ہے۔کوئی اس کے بارے میں نہیں سوچتا کہ اسے بھی آرام کی ضرورت ہے۔گر مرد کے جسم میں یک پھوڑا بھی نکل آئے تو اس کے سارے کام کاج ٹھپ پڑ جاتے ہیں اور اسی بیوی سے پوری خدمت کروانا ہے۔یہاں گر دونوں کی جسمانی قوت برداشت کا موازنہ کیا جائے تو یہاں بھی عورت مرد سے کہیں آگے نکل جائے گی۔اور یہ بات ثابت بھی ہے کہ عورت حیض کی وجہ سے اتنی مفلوج نہیں جتنا مرد دیگر بڑی بڑی بیماریوں سے مفلوج رہتا ہے۔عورت کے لیے یک اور حمل کا معاملہ ہے جس دوران وہ جسمانی طور پر دیگر دنوں سے زیادہ نازک ہوجاتی ہے۔وہ اپنے دیگر ایام کی طرح ان دنوں میں ذہنی اور جسمانی اعتبار سے نہایت ہی کمزور رہتی ہے،اس کے حالات گواہی نہیں دیتے کہ وہ اس وقت کسی ذہنی الجھن یا پھر مشقت آمیز جسمانی محنت کرے۔ان دنوں اسے اچھی غذا اور بھرپور توجہ کی ضرورت رہتی ہے۔مگر معاشرے میں اس کا بالکل الٹا دیکھنے کوملتا ہے۔ان نازک دنوں میں بھی اس کی دیکھ بھال کو کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا،اس کے برعکس وہ خود سب کی خدمت میں لگی رہتی ہے۔وضع حمل سے لے کر رضائی ایام کے خاتمے تک انسانی تخلیق،غذا کی فراہمی جیسے عظیم کام انجام دینے میں یک عورت جن ذہنی اور جسمانی الجھنوں اور پریشانیوں کا شکار رہتی ہے وہ ناقابل بیان ہے۔مگر مرد کی نگاہ میں اس عمل کی عظمت کی کوئی وقعت نہیں ہے۔زیادہ تر مرد اور خصوصاً گھر کی تجربہ کار دقیانوس عورتوں کی یہی سوچ رہتی ہے کہ یہ کون سا بڑا کام ہونے جارہا ہے یہ تو ہرعورت انجام دیتی

ہے۔

: کورہ باتوں سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ مرد اساس معاشرے نے حیاتیاتی اور فطری افتراقات کی بدولت عورت کے درجات متعین کیے جسے وہ صدیوں سے جھیلتی آرہی ہے۔ مگر صحیح معنوں میں گر غور کیا جائے تو مرد اور عورتوں کے جسمانی افتراقات دونوں کے درمیان اونچ نیچ کی کوئی لکیر نہیں کھینچتے ہیں۔ بلکہ دنیاوی نظام میں دونوں کی شمولیت کی حیثیت متعین کرتے ہیں۔

☆☆☆

نفسیات

متحرک جاندار جسم اور نفس کا مرکب ہیں۔ حرکت کرنے والے جاندار قوت احساس و ادراک کا جذبہ رکھتے ہیں جن کی مقدار ہر ذی روح میں یکساں نہیں رہتی کسی میں کم کسی میں زیادہ ہوتی ہے۔ دیگر جانداروں کے مقابل انسان ان جذبوں سے کچھ زیادہ ہی مقدار میں معمور نظر آتا ہے۔ ان عناصر کی صداقت ایک مثال سے واضح ہو سکتی ہے کہ چونکہ انسان ایک حرکت کرنے والا جاندار ہے اس لیے پیڑ پودوں کی طرح صرف جسمانی نشو و نما اس کے لیے کافی نہیں ہے۔ جیسے ایک درخت کو لیجیے اس کا جسم بڑھتا رہتا ہے مگر اس میں اپنی جگہ بدلنے کی طاقت موجود نہیں ہے، اور نہ ہی وہ سوچنے سمجھنے یا محسوس کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ اسے یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ کوئی اسے چوٹ پہنچانے یا کاٹنے آ رہا ہے۔ اگر خالق نے اسے واقعات اور خطرات کی پیش بینی یا پیش بندی کی صلاحیت بخشی ہوتی تو اسے قوت حرکت سے محروم نہیں رکھا ہوتا۔ وہ بھی خطرہ محسوس کرنے پر دیگر متحرک جانداروں کی طرح اس خطرے سے بچنے کی سبیل کر رہا ہوتا۔ خطرے کی آہٹ اگر اس میں پیدا ہو بھی جائے تو اس کے لیے سود مند نہیں ہے کیوں کہ وہ اس سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا کہ وہ خود حرکت کرنے سے قاصر ہے۔

الفرڈ اڈلر اپنی کتاب ''مقصد زندگی'' ترجمہ ''سید محمد حسین جعفری'' میں رقم طراز ہے:

> تمام حرکت کرنے والی ہستیاں پیش بینی کی صلاحیت رکھتی ہیں اور تصفیہ کر سکتی ہیں کہ انہیں کس جانب حرکت کرنی چاہیے اور اس بنا پر ہم کو ماننا پڑتا ہے کہ یہ سب نفس یا روح رکھتی ہیں۔ شیکسپیر کہتا ہے:
> ''تو عقل و حواس رکھتا ہے ورنہ تو متحرک نہیں ہوتا'' (ہیملٹ۔ ایکٹ 3 سین 4) ''[10]

جاندار میں ہمارا موضوع انسانی مطالعہ ہے تو ہمارا فوکس انسانی نفسیات ہی ہے۔ انسان کے جسم اور نفس میں کون کس پر حکومت کرتا ہے اس بارے میں الفرڈ اڈلر لکھتا ہے:

> ''کسی ذی روح کا اپنی حرکت کا رخ قرار دینے کی صلاحیت رکھنا نفس کا مرکزی اصول ہے۔ اگر ہم اس اصول کو مان لیں تو ہم آسانی سے سمجھ لیں گے کہ کس طرح نفس جسم پر حکومت کرتا ہے۔۔۔ محض حرکتوں کا صادر ہو جانا کافی نہیں ہے بلکہ یہ حرکتیں کسی خاص مقصد سے ہونی چاہئیں۔ چونکہ نفس کا یہ کام ہے کہ حرکت کا رُخ قائم کرے حرکت کا مقصد قرار دے اس لیے ہم کہتے ہیں کہ نفس جسم پر حکومت کرتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جسم بھی نفس پر اپنے اثرات رکھتا ہے مثلاً نفس کی ہدایت پر حرکت کرتا ہے نفس جسم کو اتنا ہی متحرک کر سکتا ہے جتنی کہ جسم میں حرکت کی صلاحیت اور قابلیت موجود ہو یا تربیت سے اس میں پیدا کی جائے۔[11]

یہاں اس اقتباس کا ذکر اس لیے ضروری تھا کہ اس کے حوالے سے اِن اہم پہلوؤں کی وضاحت ہو جائے کہ انسان اور نفس کا کتنا گہرا تعلق ہے اور یہی نفس حاکم بن کر کس حد تک انسانی حرکت عمل کو متاثر کرتا ہے۔ ناموافق حالات میں انسان اپنے آپ کو کمزور محسوس کرنے لگتا ہے، ناقابل برداشت حرکتیں دیکھ کر غصہ کرنے لگتا ہے، بعض اوقات دلچسپ اور ڈراؤنے خواب بے چین کر دیتے ہیں جو اصل زندگی سے شعوری طور پر مطابقت نہیں رکھتے کسی عزیز کی موت پر غم کا دریا بہا دیتا ہے تو اپنی یا کسی اپنے کی ترقی اسے خوشیوں کا گلدستہ پکڑا جاتی ہے، انسان جب اپنی زندگی میں ایسے تجربات کا سامنا کرتا ہے تو ایک حقیقت بے طرح ذہن کو کریدنے لگتی ہے کہ ان ساری حرکتوں کے پیچھے انسانی نفسیات ہی کارفرما ہے، یہ نفسیات کا غالب

رُجحان ہی ہے جو کسی کو حکم او کسی کو محکوم بننے پر مجبو کرتا ہے۔صدیوں کے مردحاوی معاشرے میں مردوں کی حکومت اور خواتین کی محکومیت کا معمار یہی نفسیات ہی ہے،اور اس نفس کی تعمیر میں دو ہی عناصر فعال کردار نبھاتے ہیں،وہ ہیں توارُث (Heredity)اور ماحول(Environment)۔ہر فرد کو اپنے والدین سے مخصوص قسم کے جینین وراثت میں ملتے ہیں،ان جنین کا ظہور اس ماحول سے مکمل طور پر متاثر ہوتا ہے جس ماحول میں اس کی پرورش و پرداخت ہوتی ہے۔یعنی بچوں کے عادات و اطوار کی تعمیر میں ان سے متعلق ماحول اہم او مخصوص رول اد کرتا ہے۔اس ضمن میں مزید وضاحت سے پہلے علم نفسیات کسے کہتے ہیں؟اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔

لفظ نفسیات Greek الفاظ Psyche اور Logos سے ماخوذ ہے،'سائیک' کا مطلب ہے روح اور 'لاگس' کا مطلب ہے سائنس۔علم نفسیات انسان کے Behaviour،برتاؤ یا رویے کا علم ہے۔نفسیات کی تعریف کرتے ہوئے الفریڈ ایڈلر کہتا ہے:نفسیات وہ علم ہے جس کے ذریعے ہم کسی شخص کے چہرے اور اس کے حرکات وسکنات سے اس کے اندرونی جذبات اور خیالات کا پتہ چلاتے ہیں اور اس کے مقاصدِ دلی معلوم کر سکتے ہیں کہ اس نے زندگی کے کیا معنی سمجھ رکھے ہیں،زندگی کا نصب العین کیا قرار دے لیا ہے اور پھر اس کے نصب العین کا دوسروں کے نصب العین سے مقابلہ کرتے ہیں۔اپنے اس خیال میں اضافہ کرتے ہوئے آگے ایڈلر لکھتا ہے نفسیات وہ علم ہے جس سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے اعضاء جسمانی کے ذریعہ جو احساسات حاصل کرتا ہے ان سے وہ کیا کام لیتا ہے او کیا فائدہ اٹھاتا ہے۔اسی علم نفسیات کے ذریعہ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی نفسیاتی حالت یک دوسرے سے بہت جُدا ہوتی ہے۔''''نفس اور جسم'' کے متعلق وضاحتی معلومات بہم پہنچانے کے بعد آخر میں اپنے خیال کا نچوڑ بیان کرتے ہوئے وہ نفسیات کی یک اور تعریف بیان کرتا ہے۔ نفسیات وہ علم ہے جو ہم کو انسانوں میں تعاون اور امداد باہمی کی صلاحیت کا نہ ہونا کم ہونا معلوم کرنے کے قابل بناتا ہے۔

Watson کہتا ہے برتاؤ یک ایسا ردِّعمل ہے جو انسان کے باہری برتاؤ اور اندرونی حالات کو کھاتا ہے۔یعنی نفسیات انسانی برتاؤ،عادات واطوار،رویّوں کو اپنے تعمیری میکانیزم کے لحاظ سے حرکت میں لاتی ہے۔یک انسان اپنے حرکت عمل کے ذریعہ خوشنامی حاصل کرتا ہے تو دوسرا انسان اپنی منفی حرکتوں کے ذریعہ کسی کے لیے آزار رجان ہوجاتا ہے یا اپنی ذات سے پورے علاقے کے لیے بدنامی کا باعث بن جاتا ہے۔یہ انسانی نفس پر ہی منحصر ہے کہ وہ کس طرح کے برتاؤ یا رویے کا مظاہرہ کرتا ہے۔اس نفس کی تعمیر میں توارُث کا رول تو رہتا ہی ہے مگر اُس سے کہیں زیادہ نفس ماحول کے ذریعہ متاثر ہوتا ہے کس طرح کے ماحول میں بچے کی پرورش ہو رہی ہے وہ اُس کی شخصیت کے حرکت عمل سے پتہ لگایا جاسکتا ہے،مردحاوی مشرقی معاشرے کی بنا کی تعمیر یک صنف کی برتری اور یک کی کمتری کے اصول پر ہوئی ہے۔بچپن سے ہی جہاں یک کو حکم بنے رہنے کی تعلیم دی جاتی ہے تو وہیں مخالف صنف کو خادم بنے رہنے کے طور طریقے سکھائے جاتے ہیں۔بچے ایسے ہی ماحول میں پرورش پاتے ہیں جہاں عورتیں اپنی مرضی سے پرے یک انچاہی غلامانہ زندگی گزار رہی ہوتی ہیں اور مرد یک آزادانہ ماحول میں حکم بنے اپنی مرضی کی زندگی جی رہے ہوتے ہیں۔ایسے میں بچوں کی نفسیاتی تعمیر بھی اسی طرح ہوتی ہے کہ اُن میں یک کے خدمت کرنے اور یک کے خدمت لیسے والی فطرت پروان چڑھتی رہتی ہے۔معاملات نفس کو چند ماہرینِ نفسیات کے نظریے سے جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

سگمنڈ فرائڈ

جدید دور کے ماہرین نفسیات میں سے غالباً سگمنڈ فرائڈ وہ پہلا شخص ہے جس نے مرد اور عورت کو الگ کرکے جنس کو بنیاد بنا کر ان کا منفرد نفسیاتی نظریہ پیش کیا۔شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرکے فرائڈ نے جنس جیسے اہم عنصر کو دریافت کیا۔ بچوں کی نفسیاتی اور جنسی نشو ونما کا نظریہ پیش کرتے ہوئے فرائڈ لڑکے اور لڑکی کی نشو ونما کی امتیازی خصوصیات پر روشنی ڈالتا

ہے۔فرائڈ نفسیاتی جنسی ارتقاء(Psychosexual Development) کے دور کو پانچ حصّوں میں تقسیم کرتا ہے۔Oral Phase (اورال دور) جو ابتدا سے لے کر تقریباً 18 مہینے تک رہتا ہے۔Anal Phase (اینل دور) غالباً 18 مہینے سے 3 سال تک رہتا ہے۔Phallic Phase (پھیلک دور) تقریباً 3 سال سے 6 سال تک رہتا ہے۔Latency Phase (لیٹنسی دور) لگ بھگ 6 سال سے سنِ بلوغت کی ابتدا تک۔Genital Phase (جینیٹل دور) سنِ بلوغت کی ابتداء سے لے کر موت تک۔

فرائڈ کے مطابق بچہ جب اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو سب سے پہلی شخصیت جو اپنے وجود کی لمس کے ساتھ اسے اپیل کرتی ہے وہ اس کی ماں ہوتی ہے، ماں کا دودھ جسے وہ آہستہ آہستہ اپنے وجود کا حصّہ سمجھنے لگتا ہے، یعنی ہر شیر خوار بچہ سب سے پہلے زبانی (Oral) مرحلے سے گزرتا ہے جو اسے ماں کی چھاتیوں تک دودھ حاصل کرکے اپنی بھوک مٹانے کے لیے پہنچا دیتی ہے، پھر جب اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک الگ وجود کا مالک ہے مگر اس کا خیال وہ خود سے بڑھ کر رکھتی ہے وہ اس کے ہی آغوش میں اپنا تحفظ محسوس کرتا ہے تب اسے اپنی محبت کا مرکز بنالیتا ہے۔اس درمیان باپ کو اپنی ماں کے زیادہ قریب تر جان کر اسے اپنا رقیب سمجھ لیتا ہے کہ یہ تیسرا وجود اس سے اس کا تحفظ نہ چھین لے۔فرائڈ کے مطابق اس کے اندر ایک خوف بھی پیدا ہوتا ہے کہ چونکہ اس کے عضوِ تناسل کی طرح دیگر بچیوں اور یہاں تک کہ اس کی ماں کے پاس بھی وہ عضو موجود نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ ایک دشمن جو باپ کا وجود رکھتا ہے اور اس کے پاس یہ مخصوص عضو موجود ہے اس نے سزا کے طور پر ماں اور دوسری بچیوں سے ان کا عضو چھین لیا ہے کہیں وہ اس کو بھی اس عضو سے محروم نہ کردے، جس سے بچہ Castration Complex نامردی یا آختہ الجھاؤ کا شکار ہوجاتا ہے، اس لیے جہاں وہ اپنی ماں کی محبت میں گرفتار رہتا ہے وہیں اپنے باپ سے نفرت کا جذبہ اس کے اندر عود کر آتا ہے۔فرائڈ لڑکے کے اس رویے کو ایڈیپس الجھاؤ (Oedipus Complex) کا نام دیتا ہے۔یہ نام ایڈیپس کے مشہور کہانی سے لیا گیا ہے، جس میں تھیبس ملک کا ایڈیپس نامی شہزادہ غلطی سے اپنے باپ کو قتل کرکے اپنی ماں سے شادی کرلیتا ہے، اور جب ماں کو پتہ چلتا ہے کہ اس کا شوہر ایڈیپس جو صحیح معنوں میں اس کا بیٹا ہے، تو وہ پھانسی لگا کر خودکشی کرلیتی ہے، باپ کا بلاواسطہ قتل اور ماں کی خودکشی کے سبب ایڈیپس خود کو اندھا کرلیتا ہے کہ اب وہ اس دنیا کو اور دیکھنا پسند نہیں کرتا جہاں اس کے ساتھ ایسے حادثے ہوئے ہیں۔فرائڈ نے کہانی کے اس المیے میں پیش آنے والی انہونی کے ساتھ اپنے نظریے کو جوڑ کر لڑکوں کے اندر بچپن میں پیش آنے والے مذکورہ الجھن کو ایڈیپس کامپلکس کا نام دیا ہے۔حالانکہ اس کہانی میں ایڈیپس اس الجھن کا شکار نہیں ہے جس کا ذکر فرائڈ کرتا ہے مگر بدقسمتی سے ایڈیپس سے جو حرکتیں سرزد ہوتی ہیں وہ فرائڈ کے نظریے کے انتہائی منزل کی عکاسی کرتی ہیں۔جہاں بچپنے میں لڑکا اپنی ماں سے جنسی قربت محسوس کرتا ہے وہ اسے اس رشتے کو لے کر اتنا غیر محفوظ بنا دیتا ہے کہ وہ ہر اس شئے کو ختم کردینا چاہتا ہے جو وہ اور اس کی ماں کے درمیان حائل ہونے کی جرائت کرتی ہے۔پھر بچے میں فوق الانا (Super Ego) فروغ پانے لگتی ہے، اپنے خونی رشتوں سے جنسی تعلق بنانے (Incest) کی جبلّت کو رد کرتی ہے اور اسے عیب شمار کرتی ہے۔پھر آہستہ آہستہ بچے کے اندر سے ایڈیپس الجھاؤ کا خاتمہ ہوجاتا ہے، Castration Complex سے بچّہ نجات پالیتا ہے، اب باپ اس کے لیے اخلاقی ہدایت کا مجسمہ بن جاتا ہے۔اس طرح کے الجھن سے صرف لڑکے ہی دوچار نہیں ہوتے بلکہ بچیاں بھی اس طرح کے ایک المیے کا تجربہ کرتی ہیں جب انہیں پتہ لگتا ہے کہ ان کے پاس لڑکوں کے عضوئے تناسل کی طرح کوئی جسمانی عضو موجود نہیں ہے نہیں ایسا لگتا ہے کہ یا تو وہ عضو اس سے کھو گیا ہے یا پھر ٹوٹ پھوٹ گیا ہے، جس کی وجہ سے وہ (Castration Anxiety) نامردی یا آختہ الجھاؤ کی شکار ہوتی ہیں، اور وہ اپنی ماں کے جسم میں بھی ایسا کوئی عضو نہیں دیکھتیں تو وہ اپنی اس کمی کا ذمّہ دار اپنی ماں کو ہی سمجھ لگتی ہیں، اپنی ماں سے نفرت کرنے لگتی ہیں اور اپنے مخالف جنس یعنی باپ کے جسم میں اس عضو کی موجودگی ان کی اس کمی کے احساس کو کم کردیتی ہے اور وہ باپ سے محبت کرنے لگتی ہیں۔لڑکیوں میں اپنے مخالف صنف کے لیے مذکورہ جذبے کو فرائڈ Feminine Oedipus

Carl Jung ماہر نفسیات تھی یک سر ہی کا فرائڈ ہے،دیتا نام کا Nagetive Oedipus Complex یا Attitude مادّہ بچوں میں موجود اس جبلّت کے لیے Electra Complex کی اصطلاح رائج کرتا ہے،شروع میں فرائڈ اسے رد کر دیتا ہے مگر بعد کے ماہرین اس طرح کے الجھن کے لیے الیکٹرا کامپلیکس اصطلاح کو ہی موزوں مانتے ہیں۔اس کے بین السطور میں بھی یک گریک مائی تھولوجیکل المیے کا تصور موجود ہے جس میں Electra نامی شہزادی اپنے بھائی Orestes کے ساتھ مل کر اپنی ماں Clytemnestra اور اپنے سوتیلے باپ Aegisthus کو قتل کروا دیتی ہے کہ اس کی ماں نے اس کے باپ Agamemnon کو Aegisthus کے ساتھ مل کر مروا دیا تھا۔اس ڈرامے کو کردار الیکٹرا نے چونکہ اپنے باپ کی اُنسیت میں اپنی ماں سے بدلہ لیا تھا یہاں اس ارادے کے پیچھے جو انتہائی نفرت کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے اسی جذبے کے تحت لڑکیوں کے اندر ماں سے نفرت کی جبلت کو الیکٹرا کامپلیکس کا نام دیا گیا ہے۔لڑکے اور لڑکی کے اندر اڈیپس اور الیکٹرا کامپلیکس کی ابتداء پھیلک دور (Phallic Phase) میں یعنی تین سے لے کر چھ سال کی عمر تک رہتا ہے۔یہاں بھی لڑکی میں فوق الانا نمو پذیر ہوتی ہے۔اور اپنے محرم رشتوں سے جنسی خواہشات بنانے کے رجحان (Incestous) کی تدارک کرتی ہے۔لڑکی کی فوق الانا لڑکوں کے مقابل زیادہ طاقتور نہیں ہوتی۔ کیوں کہ الیکٹرا الجھن، اڈیپس الجھن کی طرح یک رُخی نہیں ہوتی بلکہ شروع میں ماں سے اُنسیت اور بعد میں باپ سے قربت لڑکی کے ارادے کو دو رُخی بنا دیتی ہے۔الگ الگ وقت میں دو مخالف اجناس کی طرف جھکاؤ فوق الانا کو کمزور بنا دیتا ہے۔اس لیے لڑکے کے بہ نسبت سارا جنسی کھیل لڑکی کے لیے بہت پیچیدہ ہو جاتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی نسائیت کو نظر انداز کر کے Castration الجھاؤ سے باہر ہی نہ نکل پائے ،مردانہ عضوئے تناسل کی خواہش آسمان چھونے لگے اور خود کو اپنے باپ کے ساتھ شناخت کرنے لگے،ایسا رجحان اس کے بدستور بظری (Clitoral) مرحلے میں مستقل طور پر رہنے کا باعث بن سکتا ہے،جس سے اس کے جسم کی گرماہٹ ختم ہو سکتی ہے یا وہ ہم جنس پرستی میں مبتلا ہو سکتی ہے۔اس کو اور بہتر طریقے سے اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ فرائڈ ان دونوں جنسوں میں یک فرق بیان کرتا ہے کہ لڑکی شروع میں ماں کے ساتھ منسلک ہوتی ہے لیکن لڑکا کسی بھی موقع پر باپ کے لیے جنسی کشش نہیں رکھتا۔12۔فرائڈ نے یک اور حقیقت پر روشنی ڈالی ہے یعنی مردانہ شہوانیت (Erotism) صرف عضو تناسل میں واقع ہے،جبکہ خاتون میں دو الگ الگ شہوانی نظام موجود ہیں پہلا بظری (Clitoral) نظام جو بچپن میں پیدا ہوتا ہے،اور دوسرا فرجی (Vaginal) نظام جو عنفوانِ شباب کے بعد ہی ملتا ہے۔تناسلی مرحلے میں پہنچ کر لڑکے کی نشو و نما مکمل ہو جاتی ہے،البتہ اسے خود کا شہوانی رغبت (Auto Eritism ،جس میں لطف موضوعی ہوتا ہے) میں سے گزر کر مختلف شہوانی جبلّت (Hetero Erotism ،جس میں لطف کا تعلق معروضی یعنی کسی شئے خصوصاً عورت کی طرف ہوتا ہے) کی طرف عبور کرنا ہوتا ہے۔یہ تغیر سن بلوغ کے وقت خود پرستی کے مرحلے سے گزرنے کے بعد وقوع پذیر ہوتا ہے مگر عضو تناسل بچپن ہی کی طرح اب بھی اور آخر تک بھی بدستور شہوانیت کا مخصوص آلہ رہتا ہے۔عورت کی جنسی طلب (جسے فرائڈ لبیڈو (Libido) کا نام دیتا ہے) بھی خود پرستی کے مرحلے سے گزر کر معروضیت کی طرف سفر شروع کرتی ہے۔جس طرح لڑکوں کا معروض عورت ہوتی ہے اسی طرح لڑکیوں کا معروض عموماً مرد ہوتا ہے۔لڑکیوں کا یہ عمل لڑکوں کے عمل سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے کیوں کہ عورت کو بظری مسرت سے فرجی مسرت کی طرف جانا ہوتا ہے۔مرد کے لیے صرف یک تناسلی مرحلہ ہے جبکہ عورت کے لیے دو۔اس لیے عورت کو اپنے جنسی ارتقاء کی آخری منزل تک نہ پہنچنے،ابتدائی مرحلے میں ہی بنے رہنے کے سبب اعصابی خلل سے دوچار ہونے کا خدشہ کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

بارہ تیرا سال کے بچے میں جنسی ہارمون کی کارگی کے باعث مختلف طرح کی جسمانی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں،جس کے باعث اپنی جنسی طلب (Libido) کی تکمیل کی دھن میں وہ اپنے مخالف جنس کی طرف رغبت محسوس کرتا ہے،ان تقاضوں کے حصول کی راہ میں آگے بڑھتا ہے لیکن اس راہ میں بچے کے بچپن کے لاشعوری محرکات الجھن بن کر اس کے

ارادے پر اثر انداز ہوتے ہیں جو کبھی خود جنسیت اور کبھی ہم جنسیت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ایسے ماحول میں پریشان کن مسئلہ یہ ہے کہ جنسی جبلت کے تقاضے اور ان کی تکمیل ایک مشکل ترین امر ہے،اس مہم میں کبھی اندرونی اور کبھی بیرونی رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں۔مذہب،اخلاق،قانون،معاشرہ غرض معاشرتی دباؤ اور نفسیاتی رکاوٹیں لیبیڈو کے اظہار کی راہ میں مضبوط دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔اگر بچہ ان رکاوٹوں کو عبور نہیں کر پاتا تو وہ مراجعت اختیار کر لیتا ہے یعنی طفلانہ جنسیت کے دور کی طرف واپس لوٹ جاتا ہے،طفلانہ جنسیت مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے،یعنی خود جنسیت،ہم جنسیت اور ایک اور شکل جس میں جنسی جبلت کسی اور بے ضرر حرکت میں خود کو منتقل کر کے اپنی تسکین کا انتظام کر لیتی ہے،مثلاً بچوں کو مارنا، دوسروں کو نقصان پہنچانا،بزرگوں کی بے عزتی کرنا اس طرح سے وہ کجرو ہو جاتا ہے۔فرائڈ نے ارتفاع پر زور دیتے ہوئے یہ خیال پیش کیا کہ لیبیڈو اپنے ارتقائی مرحلے میں چند ایک اندرونی یا بیرونی رکاوٹوں کو عبور نہ کر سکنے کی بنا پر جنسی تسکین کے لیے اپنی توجہ غیر جنسی فنون (جن فنون کے ساتھ جنسی چاہت کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) کی طرف کر دیتا ہے اور اپنی توانائی کے اخراج کی راہ نکال لیتا ہے۔جن فنون کو وہ اختیار کرتا ہے ان میں جنسی قوت ارتفاع پذیر ہو کر غیر معمولی ایجاد کا باعث بنتا ہے۔

فرائڈ اعصابی خلل کے وقوع پذیر ہونے میں لاشعوری ہم جنسیت کو بنیاد قرار دیتا ہے۔لیکن بعد کے ماہرین اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ شخصیت کے عمومی مسائل کی ایک علامت ہے جو کرداری الجھنوں کے خاتمے سے ختم ہو جاتی ہے۔فرائڈ کے نظریے کے مطابق لاشعوری ہم جنسیت ارتفاع پذیر نہ ہو سکے تو ایک مرض کی شکل اختیار کر لیتی ہے،فرائڈ کے مطابق لیبیڈو کا ایک اہم حصہ ہم جنسیت پر مبنی ہوتا ہے اسے مخالف جنسیت میں بدلنا نہایت ہی مشکل امر ہے۔جنسی نشو و نما کے دوران ان دونوں میں سے ایک شدت اختیار کر لیتا ہے اور دوسرا یا تو ارتفاع پذیر ہو کر کسی غیر جنسی عمل میں خود کو ملوث کر کے اپنی تسکین کا سامان کر لیتا ہے یا ارتقائی عمل میں رکاوٹ کے باعث اعصابی خلل کا موجد بن جاتا ہے۔

لڑکے اور لڑکی کے تئیں فرائڈ کے درج بالا نظریات آگے چل کر ماہرین نفسیات کے ذریعہ مختلف پہلوؤں پر تنقید کا نشانہ بنے،بے شمار اعتراضات کئے گئے۔اس کے باوجود فرائڈ ایک ایسا ماہرین نفسیات ہے جس نے نفسیاتی جنسی تھیوری کی بنیاد ڈالی،فرائڈ سے پہلے جنس کے متعلق بات کرنا بھی خلاف اقدار سمجھا جاتا تھا۔اس کے نظریات میں کئی ساری کمیاں تو رہ گئیں مگر اس نے آگے آنے والے نفسیاتی ماہرین کے لیے فکری راہیں ہموار کر دی۔

کارل یونگ

ماہر نفسیات کارل یونگ،فرائڈ کے پیروکاروں میں سے تھا مگر چند ایک نظریاتی اختلافات کی بنا پر فرائڈ سے الگ ہٹ کر اس نے اپنا مکتب فکر قائم کیا جس کو وہ Analytical psychology کہتا تھا۔چونکہ اس کے نظریے کی بنیاد فرائڈ کی نظریاتی عمارت پر قائم ہے،اس نے جنس کو مکمل نفس کی حیثیت سے پرکھا۔فرائڈ نے شخصیت کو تین حصّوں میں تقسیم کیا تھا یعنی اڈ،انا اور فوق الانا،اسی طرح یونگ نے بھی اس کو تین حصوں میں ہی بانٹا ہے،شعور کے لیے ایگو(Ego)،تحت الشعور کے لیے ذاتی لاشعور(Peronal Unconscious)اور آخری اور اہم حصّہ اجتماعی لاشعور(Collective Unconscious)۔ذاتی لاشعور سے یونگ کا مفہوم یہ تھا کہ ذاتی لاشعور ذہن کا ایک ایسا مواد جس کا فرد کو اس وقت شعور نہ ہو لیکن مستقبل میں ضرورت پڑنے پر شعور میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔اجتماعی لاشعور سے یونگ کا مطلب اس لاشعوری مواد سے تھا جو فرد پیدائش کے وقت اپنے ساتھ لے کر آتا ہے اور اس میں وہ تجربات،خواہشات اور احساسات شامل ہوتے ہیں جو فرد کو اپنے آباو اجداد سے ورثہ میں ملتے ہیں۔ یونگ کے خیال میں اجتماعی لاشعور انسان کے ذاتی تجربات اور احساسات سے بالکل لاتعلق ہوتا ہے،اس لیے اس کا مواد شعور میں کبھی نہیں آتا۔اجتماعی لاشعور عالمگیر ہوتا ہے۔مثلاً پہلی ہی نظر میں کسی کی جانب ایک کشش محسوس کرنا،کسی اجنبی جگہ جا کر یہ خیال کرنا کہ ہم یہاں پہلے بھی آ چکے ہیں،کسی کی بات سن کر یہ محسوس کرنا کہ یہ ہم پہلے بھی سن چکے ہیں،یہ ایسی

خصوصیات ہیں جو افراد کے مشترک آبا و اجداد اور مشترک تہذیب کے ذریعہ ان کے لاشعور میں آ گئی ہیں۔ یونگ نے اپنے اسی نظریے کو بنیاد بنا کر Archetype (سید اقبال امروہی نے اس لفظ کے لیے اپنی کتاب ''نفسیات کے معمار میں'' آثار اُولیٰ'' اور حمیرا ہاشمی نے اپنا مقالہ ''نسوانیت اور نفسیات''، جو کشور ناہید کی ترتیب شدہ کتاب ''عورت: زبانِ خلق سے زبانِ حال تک'' میں شامل ہے، میں اس لفظ کے لیے ''مُختمثال'' کی اصطلاح استعمال کیا ہے) کا تصوّر پیش کیا۔ آر کی ٹائپ سے متعلق مواد فرد کے اجتماعی لاشعور سے جُڑے ہوئے مواد ہیں۔

یونگ نے آر کی ٹائپ کے مختلف اقسام کا ذکر کیا ہے، ان میں سے چند ہیں: Mother Archetype, Mana, Persona, Anima, Animus, Shadow, Self وغیرہ۔ Persona یعنی ظاہری شخصیت کے معنی اس نقاب کے ہیں جو ایک ڈراما کے مختلف کردار استعمال کرتے ہیں، اس سے یونگ کا مطلب ہر اس پہچان سے ہے جو ہر فرد معاشرے میں اپنی شناخت قائم کرنے کے لیے رکھتا ہے، ایک ہی انسان مختلف حیثیتوں میں مختلف رشتوں میں اتنے مختلف کردار ادا کرتا ہے کہ اس کی اصلی پہچان کہیں کھو سی جاتی ہے، یعنی کوئی فرد حقیقت میں کچھ بھی ہو مگر معاشرے میں اس نے اپنی شخصیت پر جو نقاب چڑھایا ہوا ہے اسی نقابی چہرے سے وہ پہچانا جاتا ہے، اور وہی چہرہ اس کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے، جس سے اس کی اصل شناخت تاریکی میں چلی جاتی ہے۔ مثلاً معاشرے نے مرد اور عورت کے لیے جیسی شخصیت کی تعمیر کی اور نہیں جن اصولوں پر چلایا آج بھی وہی تصور ان دو صنفوں کے ساتھ رائج ہے، مرد کی شخصیت جہاں قوت و اقتدار کا مالک، دلیر، طاقتور، شجاع، پہل کرنے والا، حکم جیسے مردانہ اوصاف سے پہچانی جاتی ہے وہیں عورت کی شخصیت خادمہ محکوم کمزور، نازک، بے زبان، بے دماغ، بے چوں و چرا تکلیف برداشت کرنے والی، خوشی خوشی قربانیاں دینے والی جیسے زنانہ اوصاف کی مالک ہوتی ہے۔ ان میں سے کوئی گر اپنے مخالف صنف کا وصف اپنا تا ہے تو یہ اس کے لیے عیب شمار کیا جاتا ہے۔ دونوں صنفوں سے متعلق تصورات آر کی ٹائپ تھیوری کی ہی نمائندہ مثالیں ہیں۔ سماج کے بنائے گئے نقاب کے پیچھے ان افراد کی اصل شخصیت کہیں دب سی جاتی ہے کیوں کہ ہر مرد نام نہاد مردانہ اوصاف کا مالک نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر عورت معاشرتی زنانہ اوصاف رکھنے والی ہوتی ہیں، مجبوراً نہیں اس چولے کو پہننا پڑتا ہے کیوں کہ یہی معاشرے کا حکم ہے۔ مگر آج وقت بدل رہا ہے کثر افراد اپنی اصل صورت سامنے لانے کی کوشش میں ہیں۔ اپنی وجودی شناخت کے ساتھ معاشرے میں ایک آزادانہ زندگی گزارنے پر مصر ہیں۔

یونگ نے انسانی نفس یا ذات کی دو مختلف توضیحات پیش کی ہیں، یعنی مردانہ نفس اور زنانہ نفس۔ اس کا ماننا تھا کہ ایک مرد اور ایک عورت میں کئی ایک پہلو مشترک ہوتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی سوچ اور جذبات میں بہت واضح قسم کے اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ اسی سلسلے کا ایک نظریہ وہ آر کی ٹائپ تھیوری سے متعلق تصویر زن (Anima) کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ اس نے اپنا یہ نظریہ اپنے خوابوں سے اخذ کیا ہے جس میں وہ اکثر ایک بزرگ ہستی کو دیکھا کرتا تھا جن کے لیے وہ اپنے دل میں بے انتہا عقیدت رکھتا تھا۔ ان کے ساتھ ہمیشہ ایک چھوٹی سی لڑکی کو بھی دیکھا کرتا تھا۔ اسی خواب نے اسے تصویر زن (Anima) کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے تحت اس کا خیال تھا کہ ہر مرد کے ساتھ ایک مونث روح موجود ہوتی ہے جسے وہ تصویر زن کا نام دیتا ہے۔ ہر عورت کے ساتھ ایک مذکر روح موجود رہتی ہے جسے وہ تصویر مرد (Animus) کا نام دیتا ہے۔ اینیما ایک مرد کے اجتماعی لاشعور میں پائی جانے والی عورت ہے اور اینیمس ایک عورت کے اجتماعی لاشعور میں پایا جانے والا مرد ہے۔ یونگ کے مطابق ان دونوں قسم کی روحوں کی وجہ سے مرد اور عورت میں ایک قسم کی ابدی کشش پائی جاتی ہے۔ یونگ اس نظریے کو اس حقیقت کے ساتھ جوڑ کر دیکھتا ہے کہ کچھ مردوں میں عورت کی طرح لباس زیب تن کرنے اور ان میں سجنے سنورنے کی خواہش پوشیدہ رہتی ہے، اور کچھ عورتوں میں بھی مردوں کی طرح بننے کی خواہش موجود ہوتی ہے۔ آج کل تو یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ کئی مرد اور عورتیں اپنا جنس بدل کر مخالف جنس کا جسم اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسے مرد عورت بننا پسند کرتے ہیں اور

ایسی عورتیں مرد بننے میں سکون محسوس کرتی ہیں۔

یونگ یہ بھی سمجھتا ہے کہ اینیما اور اینی مس پر جنسی فریق کا انحصار ہوتا ہے۔ صنف مخالف میں وہ جسے پسند کرتے ہیں وہ خاصیتیں دراصل ان کے اجتماعی لاشعور میں موجود تصویر کی بدولت وقوع پذیر ہوتی ہیں یعنی اپنے محبوب میں پائی جانے والی خصوصیات ان کے اجتماعی لاشعور میں موجود اینیما اور اینی مس کے ذریعہ منتخب کی جاتی ہیں۔ مرد اپنی منتخب کردہ عورت کو اینیما کی روشنی میں اور عورت اپنے پسندیدہ مرد کو اینی مس کی روشنی میں دیکھتی ہے۔ اس نظریے کے مطابق یونگ کہتا ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے ایک دوسرے سے مختلف انداز میں سوچتے ہیں محسوس کرتے ہیں اور ان کے عمل کا طریقہ بھی الگ ہوتا ہے۔

الفریڈ ایڈلر

الفریڈ ایڈلر کہتا ہے کہ اس دنیا میں ہر انسان کے تین تعلقات یا بندھن ہوتے ہیں، چونکہ انسانی زندگی کا مدار ان بندھنوں پر ہوتا ہے اس لیے ہر انسان کو چاہیے کہ وہ ان بندھنوں کو اچھی طرح سمجھ لے۔ پہلا بندھن ہمارا اس دنیا کے ساتھ ہے جہاں ہم رہتے بستے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور کرہ نہیں ہے جہاں انسان کے رہنے کی گنجائش ہو۔ پس ہمیں چاہیے کہ اسی دنیوی حدود میں رہ کر اس کے قانون کے تحت جسمانی اور نفسیاتی ترقی کرتے رہیں تاکہ دنیا میں ہم صحت و تندرستی کے ساتھ کامیاب زندگی بسر کریں اور ہمارا زندگی جینے کا طریقہ ایسا ہو کہ ہم اپنے اور بنی نوع انسان کے ہونے کا باعث بن سکیں۔ دوسرا بندھن یہ ہے کہ نوع انسانی کے صرف ہم ہی نمائندے نہیں ہیں بلکہ ہمارے آس پاس اور بھی تو میں بستی ہیں اس لیے چاہیے کہ اکیلے اپنی زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھانے سے بہتر ہے کہ اپنی اور نوع انسان کی بھلائی کی خاطر دوسروں سے میل جول پیدا کریں۔ انسان میں نفسیاتی اور طبعی کمزوریاں کچھ ایسی ہیں کہ ہمیں اس دنیا میں اکیلے جدوجہد کرنے کی اجازت نہیں دیتیں، ہم تنہا رہنے کی کوشش کریں گے تو ہلاک ہو جائیں گے۔ تیسرا بندھن یہ ہے کہ بنی نوع انسان کے دو جنس ہیں مرد اور عورت۔ محبت اور شادی بیاہ کا مسئلہ اس تیسرے بندھن سے تعلق رکھتا ہے۔ زندگی میں ہر مرد اور عورت کو یہ مسئلہ حل کرنا پڑتا ہے۔

یہ تین بندھن تین مسائل پیش کرتے ہیں، اقتصادی مسئلہ، سماجی مسئلہ اور جنسی مسئلہ۔ پہلا مسئلہ یہ کہ ہم دنیا میں کون سا مشغلہ اختیار کریں کہ باوجود اپنی کمزوریوں اور پابندیوں کے جو اس دنیا میں قائم کر دی گئی ہیں، ہم زندہ اور باقی رہ سکیں۔ دوسرے یہ کہ ہم اپنے ہم جنسوں میں کس طرح اپنی جگہ پیدا کریں کہ ہم ان کے ساتھ مل جل کر کام کریں اور اس تعاون سے فائدہ اٹھائیں۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس حقیقت کا کہ نوع انسان دو جنسوں پر مشتمل ہے اور نسل انسانی کی بقا کے لیے عشق و محبت اور شادی بیاہ کی ضرورت ہے کس طرح مقابلہ کریں۔ انسانی زندگی کی راہیں متعین کرنے میں الفریڈ ایڈلر نے مرد اور عورت کے زندگی جینے کے طریقوں میں کہیں بھی کوئی امتیاز نہیں برتا، چاہے وہ اقتصادی مسئلہ ہو، سماجی مسئلہ ہو یا جنسی مسئلہ، مرد اور عورت دونوں کے مقصد حیات میں جنسی برابری کو مدِّنظر رکھتے ہوئے محبت اور اخوت کو قائم رکھ کر بنی نوع انسان کی بقا کے لیے اپنی زندگی کو ارتقا کی راہ پر گامزن رکھنے کا درس دیتا ہے۔ شادی اور مقصد زندگی کے حوالے سے کہتا ہے کہ:

> ''اگر ہم کو اپنی شریک زندگی سے ذرا سی بھی دلچسپی ہو، اس کی بھلائی کا ہمیں تھوڑا سا بھی خیال ہو۔۔۔ تو ہمارے لیے لازمی ہوگا کہ زندگی کے صحیح معنی اور مقصد کو سمجھ کر اپنی اصلاح کریں اگر ہم زندگی کا مقصد صرف ذاتی فائدہ، ذاتی راحت اور آرام سمجھ کر خودغرضانہ زندگی بسر کریں گے تو یقیناً ہمارا سلوک اپنی شریک زندگی کے ساتھ محض تحکمانہ رہے گا اور آپس کے تعلقات دوستانہ اور محبت بھرے ہونے کے بجائے بےلطف اور ناخوشگوار ہوں گے۔'' 13

یہاں الفریڈ ایڈلر زندگی کو لطف اندوز اور خوشگوار بنانے کے لیے جنسی رشتے میں دوستانہ اور محبت بھرا توازن برقرار رکھنے کی بات کر رہا ہے، اس کے مطابق خلق کی خدمت انجام دینے کے لیے لازمی ہوگا کہ فرد پہلے اپنے میں سماجی جذبات پیدا کرے اور مشق کے ذریعے ان جذبات کو درجۂ کمال پر پہنچائے۔ اس دوران جب اس کے سماجی جذبات پختہ ہو جائیں گے تو پھر وہ تینوں مسائلِ زندگی یعنی معاشی، سماجی اور جنسی مسائل آسانی سے حل کر سکتا ہے۔ یہاں الفریڈ نے مرد اور عورت میں کوئی تمیز نہیں کی۔ اب تفصیل سے جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ الفریڈ ایڈلر انسانی نفسیات (خصوصاً مرد اور عورت) پر کس طرح سے بات کرتا ہے۔

الفریڈ ایڈلر انسان میں پیدا ہونے والے احساسِ کمتری کے متعلق رائے دیتا ہے کہ جب کسی شخص کے سامنے ایسا مسئلہ پیش آتا ہے جس کے حل کرنے کی وہ اپنے اندر قابلیت و صلاحیت نہیں رکھتا اور اپنی اس کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے مسئلہ کے حل کر سکنے سے اپنی عاجزی ظاہر کر دیتا ہے تو اس وقت اس میں کمتری کا وہم پیدا ہو جاتا ہے۔ فرائڈ کے ایڈیپس الجھن کی بنا پر ایڈلر کہتا ہے کہ اس الجھن سے نہ ابھر پانے کی وجہ سے انسان اعصابی خلل کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس الجھن کو اپنے تیسرے بندھن کے ساتھ منسلک کر کے کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس دنیا میں عشق و محبت اور شادی کے مسئلے کا مقابلہ کرنے سے ڈرتا ہو تو وہ نہ تو عشق بازی میں کامیاب ہوگا اور نہ شادی کر سکے گا۔ ایسا شخص اپنی فیملی تک ہی اپنی محبت کو محدود رکھے گا۔ اس کی جنسی کوششیں گھر کی چہار دیواری کے اندر تک ہی ہوں گی کیوں کہ اسے یہ خوف ہمیشہ لگا رہے گا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اجنبی لوگوں پر حاوی نہ ہو سکے گا۔ ایڈلر کے مطابق اس الجھن کا وہی بچے شکار ہوتے ہیں جو اپنی ماں کا بیجا لاڈ و پیار پاتے ہیں، مائیں بے موقع نہیں اپنی لاڈ سے بگھرے میں رکھی ہیں اور جن کی نشو و نما اس سوچ کے تحت ہوتی ہے کہ دنیا میں نہیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ہر خواہش پوری کریں یا اوروں سے کروالیں۔ ایسے بچوں کے پاس یہ تصور ہی نہیں ہوتا کہ انہیں گھر سے باہر اوروں کی محبت کا مرکز بننے کے لیے کوششیں کرنی پڑیں گی، والدین کی طرح کوئی بلا غرض یا بنا کوئی رشتے کے ان سے اندھوں کی طرح پیار نہیں کرے گا۔ ایسے بچے ماں کا پلّو عمر کے کسی بھی درجے میں چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔ Insecurity کا خوف انہیں گھر سے باہر اپنے ہم درجہ مخالف جنس سے عشق و محبت قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس قسم کے لوگ اپنی ماؤں سے زیادہ کسی دوسری عورت کو اطاعت گزار اور ان کی مرضی کے موافق عمل کرنے والی نہیں پاتے اس لیے کسی عورت سے بھی عشق و محبت نہیں کرتے اور اپنی محبت اپنی ماں تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ ایڈلر کے مطابق اگر ہم چاہیں تو کسی بھی بچے میں ایڈیپس الجھن پیدا کر سکتے ہیں، ماں سے کہہ دیا جائے کہ وہ اپنے بچے سے بیجا لاڈ و پیار کرے اور باپ اس بچے سے دوری بنائے رکھے تو کچھ سال بعد وہ بچہ اس الجھن کا شکار ہو جائے گا۔

الفریڈ ایڈلر ماؤں کے کردار کو سب سے اہم گردانتا ہے۔ اس کے مطابق بچہ پیدا ہوتے ہی سب سے پہلے اپنی ماں سے مانوس ہوتا ہے اور پوری طرح سے ماں کا ہی محتاج ہوتا ہے۔ شروع کے مہینے بچے کے لیے نہایت اہم ہوتے ہیں کہ انہی زمانے میں بچے کے اندر دوسروں سے تعاون کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ گویا ماں ہی بچے، اور سماج کے درمیان پل کا کام کرتی ہے، اس لیے یہ ماں کی ہی ذمّہ داری ہوتی ہے کہ بچّے کو گھر اور سماج کے دوسرے افراد کے ساتھ ملائے اور بچّے میں اپنے سوا سماج کے دوسرے لوگوں کے تئیں بھی دلچسپی پیدا کرے۔ ایڈلر کے مطابق ماں کا تعلق بچّے کے ساتھ اس قدر گہرا ہوتا ہے اور بچّے پر اس تعلق کا اس قدر دور رس اثر پڑتا ہے کہ بچّہ بڑا ہونے کے بعد اس کے موروثی اثرات اور خصوصیات معلوم کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ بچّہ جو موروثی میلانات اور رجحانات لے کر پیدا ہوتا ہے وہ ماں کی تعلیم و تربیت سے مسخ ہو جاتے یا بالکل بدل جاتے ہیں۔ اس لیے وہ اس بات پر زیادہ زور دیتا ہے کہ ماں کو بچوں کی پرورش اور تربیت کے طریقوں سے واقف ہونا چاہیے۔ اس لیے ایڈلر کہتا ہے کہ مادریت میں بچیوں کو ماہر بنانے کے لیے ان کی اس طرح سے تربیت ہونی چاہیے کہ وہ

آئندہ مائیں ہونا پسند کریں، اس عمل کو یک تخلیقی فعل تصور کریں اور جب مائیں بنیں تو اپنی اس حالت سے مایوس اور نجیدہ نہ ہوں۔ ایڈلر اس مردحاوی سوچ پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"بدقسمتی سے ہماری تہذیب میں بسا اوقات عورت کی مادریت کو بہت کم وقعت اور اہمیت دی جاتی ہے۔ گر ہم ۔۔۔لڑکوں کے مشاغل کو لڑکیوں کے مشاغل سے اعلیٰ سمجھتے رہے تو ظاہر ہے کہ لڑکیاں اپنے فرائض کو ناپسند کریں گی۔ کیونکہ کوئی بھی کمتر موقف میں رہنا پسند نہیں کرتا۔۔۔ گر مائیں اپنے مادری فرائض کو ناپسند کریں، ان میں دلچسپی نہ لیں اور ان کی انجام دہی میں ناکامیاب رہیں تو پھر نوع انسان معرض خطر میں پڑ جاتی ہے۔"14

ہر ملک میں عورتوں کے مشاغل اور فرائض کمتر درجے کا سمجھا جاتا ہے، کثر ایسا دیکھا جاتا ہے کہ گھر کے کام کاج میں لڑکے اپنی شمولیت شان کے خلاف سمجھتے ہیں، یہ کام یا تو گھر کے ملازم کا ہوتا ہے یا گھر کی عورتوں کا۔ خانہ داری مردوں کے لیے باعثِ ذلت تصور کیا جائے تو عورتیں اپنے لیے کیوں اسے یک اہم اور برتر شغل کا درجہ دیں گی۔ ایڈلر کہتا ہے کہ ظاہر سی بات ہے ایسے حالات میں عورتیں ایسے مشاغل سے نفرت کا اظہار کریں گی جنہیں مرد اپنے لیے باعث ذلت تصور کرتے ہیں، وہ ضرور سوال اٹھائیں گی کہ کیا وہ ہر بات میں مردوں کے برابر نہیں؟ کیا نہیں بھی اپنی صلاحیتوں کی نشو ونما کا موقع ویسا نہیں ملنا چاہیے جیسا کے مردوں کو حاصل ہے؟ ایسی عورتوں کی زندگی کا نصب العین اپنے بچوں کے نصب العین کے مطابق نہیں ہوتا وہ ہمیشہ اپنی برتری کے اظہار کی فکر میں کھوئی رہتی ہیں، اور بچوں کا وجود ان کے لیے وبال جان بن جاتا ہے۔ اس لیے عورتیں جب کے دُنیا کا سب سے اہم کام انجام دے رہی ہوتی ہیں تو نہیں اور ان کے کام کو اہمیت دیا جانا نہایت ضروری ہے۔

قوت مادریت کے متعلق الفریڈ کہتا ہے کہ اس قوت کے متعلق ہر کوئی آگاہی رکھتا ہے، مادریت کی طرف میلان جنسی خواہش کی وجہ نہیں ہوتا بلکہ تعاون کی خواہش کی وجہ سے ہوتا ہے۔ آگے ایڈلر کہتا ہے کہ ماں کے دو اہم فرائض قرار پاتے ہیں، یک یہ کہ وہ بچے کو اپنے ساتھ مانوس کرے اور بچے پر یہ ثابت کر دے کہ وہ یک قابلِ بھروسہ ہستی ہے جس پر وہ آنکھ بند کر کے اعتنا کر سکتا ہے۔ دوسرا یہ کہ بچے میں اپنے تئیں محبت اور بھروسے کے دائرے کو وسعت عطا کر دے کہ بچہ اس کے علاوہ پورے سماج پر بھروسہ کر سکے اور اس سے دوستانہ تعلق قائم کر سکے۔ گر ماں بچے کو صرف اپنے ہی تک محدود رکھے گی تو بچہ بڑا ہو کر دوسروں سے ملنے جُلنے میں یا دوستی پیدا کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس امر کی سخت مخالفت کرے۔ اس قسم کا بچہ بڑے ہونے کے بعد بھی ہر کام کے لیے اپنی ماں کا محتاج رہے گا اور جو کوئی بھی اس کے اور اس کی ماں کے درمیان حائل ہونے کی کوشش کرے گا وہ از خود اس کا جانی دشمن بن جائے گا۔ اس ضمن میں فرائڈ کے نظریے کی مخالفت کرتے ہوئے ایڈلر کہتا ہے فرائڈ کے اڈیپس وہم کا نظریہ یہ ہے کہ لڑکا اپنی ماں کا عاشق ہو جاتا ہے اور اس سے شادی کر لینا چاہتا ہے اور باپ سے نفرت اور عداوت رکھتا اور اسے مار ڈالنا چاہتا ہے۔ ایڈلر کے مطابق بچوں کی نشو ونما کے متعلق گر بخوبی سمجھ لیا جاتا تو یہ غلط نظریہ قائم نہیں کیا جاتا۔ "ایڈیپس وہم اسی بچے میں پایا جاتا ہے جس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کی ماں اس کے لیے مخصوص رہے اور وہ دوسرے کسی سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ یہ خواہش جنسی خواہش نہیں ہے۔ یہ الجھن ان بچوں میں بھی پیدا ہوتا ہے جو ماں کی بے جا لاڈ و پیار سے بگڑ چکے ہوں۔ ایسے بچے ماں کو اپنی زندگی کے ہر فیصلے میں مرکز مانتے ہیں۔ پھر نتیجے کے طور پر لکھتا ہے کہ:

"ایڈیپس وہم یک غلط تربیت کی مصنوعی پیداوار ثابت ہوتا ہے۔ ہمارے لیے قطعاً اس کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم یہ فرض کر لیں اس وہم کا محرمات کے ساتھ مباشرت کی موروثی جبلّت سے تعلق ہے یا ہم یہ تصور کر لیں کہ اس فتور (یعنی ایڈیپس الجھن) کے کسی میں پائے جانے کی اصل وجہ جنسی کشش یا شہوانیت ہے۔"15

اس لیے ایڈلر اس الجھن کو صرف لڑکوں تک محدود نہیں کھا بلکہ اس کے مطابق لڑکیاں بھی اس الجھن کا شکار ہوتی ہیں اس ضمن میں وہ کئی یک مثالیں بھی پیش کرتا ہے۔وہ یہاں بھی لڑکے اور لڑکیوں میں کوئی تخصیص نہیں کرتا۔آگے لکھتا ہے کہ گر والدین کی زندگی میں تعاون نہ ہو اور ان کی سماجی زندگی خراب ہو تو یہ چیز بچے کی سماجی زندگی کی نشوونما اور تعاون کی تعلیم وتربیت میں یک رکاوٹ بن جاتی ہے۔شادی کا مطلب سمجھاتے ہوئے ایڈلر کہتا ہے کہ شادی کا مطلب باہمی فلاح و بہبود، بچوں کی بہتری اور سماج کی بھلائی کے لیے دو افراد تعاون اور اتحاد کے ساتھ عمل کریں گر ان میں سے کوئی یک چیز بھی موجود نہ ہو تو زندگی کا مطالبہ پورا نہیں کیا جاسکتا۔چونکہ شادی مرد اور عورت کی باہمی رفاقت ہے اس لیے اس میں کسی یک کی کن کے اعلیٰ ہونے کا سوال پیدا نہ ہونا چاہیے۔گر باپ تند مزاج ہوتا ہے اور فیملی میں دوسروں پر حکومت کرنا چاہتا ہے، تو لڑکوں میں بھی ایسے منفی اثرات پیدا ہو جاتے ہیں کہ مرد کی ذات تند مزاجی اور اپنے ماتحتوں پر حکومت کرنے کے لیے تخلیق کی گئی ہے۔لڑکیوں میں اور بھی زیادہ برے اثرات گھر کر جاتے ہیں یہ بڑی ہو کر یہ خیال کرنے لگ جاتی ہیں سارے مرد ان کے باپ کی طرح ظالم ہوتے ہیں اور شادی کو، تحتی اور غلامی سے تعبیر کرتی ہیں اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مردوں کی دہشت سے بچانے کے لیے خلافِ فطرت افعال کی عادی بن جاتی ہیں کسی فیملی میں گر بیوی شوہر پر مسلط ہو جاتی ہے اپنے سسرالی رشتوں پر ہمیشہ لعنت وملامت کرتی رہتی ہے تو معاملہ بالکل اس کے برعکس ہو جاتا ہے۔ان حالات میں لڑکیاں ماں کی تقلید میں بدمزاج بن جاتی ہیں اور ہمیشہ دوسروں پر نکتہ چینیاں کرنے لگتی ہیں۔اور لڑکوں کے لیے ساری عورتیں ایسے کردار کی حامل ہوتی ہیں اور وہ ان سے اپنے بچاؤ کی فکر میں لگے رہتے ہیں، ساری عورتیں ایسی ہی دق کرنے والی ہوں گی اس لیے ان سے بھاگنے لگتے ہیں اور ان کی صحبت پسند نہیں کرتے۔کچھ لڑکے تنہائی پسند ہو جاتے ہیں اور سماج سے تعاون نہیں کر پانے کے سبب دوری اختیار کر لیتے ہیں۔

جس طرح ماں کی زندگی کا یا اس کی تربیت کا بچوں پر دوررس اثرات پڑتے ہیں اسی طرح باپ کا بھی اولاد پر اس قدر زبردست اثر پڑتا ہے کہ بچے کثر باپ کی شخصیت کو یا تو اپنے لیے آئیڈیل تصور کر لیتے ہیں یا اس کے قول فعل سے اُکتا کر اس کے جانی دشمن بن جاتے ہیں۔اس لیے باپ کے فرائض پر روشنی ڈالتے ہوئے ایڈلر لکھتا ہے، باپ کو چاہیے کہ وہ اپنی بیوی، بچوں اور سماج کے لیے اپنی شخصیت کو مثالی بنائے، زندگی کے تین مسائل یعنی پیشہ، دوستی اور عشق ومحبت کا عمدگی کے ساتھ مقابلہ کرے، اپنی اولاد کی پرورش وپرداخت میں اپنی بیوی کے ساتھ مساوی طور پر تعاون کا معاملہ کرے۔اسے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ بچوں کی پیدائش کے معاملے میں عورت کی اہمیت لائقِ فراموش نہیں ہے، اس کی اس برتری پر وہ کسی بھی طرح سبقت نہیں لے جاسکتا۔اور یک بات کا خیال رکھا جانا ضروری ہے کہ وہ جو کماتا ہے اور گھر کو مالی مدد پہنچاتا ہے، اس کا یہ عمل انفرادی نہیں ہے اس پر سب کا حق ہے، وہ اس بات کو بے کر اپنے بیوی بچوں پر احسان نہ جتائے کر گرو، کمانے کے لیے باہر جاتا ہے تو گھر کو سنبھالنے کی ذمّہ داری بیوی پر ہوتی ہے، اس لیے روپیہ کمانے کے عمل پر اپنی حکومت قائم نہیں کرنی چاہیے۔آگے ایڈلر لکھتا ہے کہ:

> ''باپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ محض عورت ہونے کی وجہ اور اس لیے کہ وہ کماتی اور گھر والوں کی مالی امداد نہیں کرتی اس سے کسی طرح کم تر ہے۔بیوی چاہے گھر والوں کی مالی مدد کرتی ہو یا نہ کرتی ہو گر فیملی کے ارکان میں حقیقی تعاون ہو تو یہ سوال ہی پیدا نہ ہوگا کہ کون کماتا ہے اور کمایا ہوا روپیہ کس کی ملک ہونی چاہیے۔۔۔۔ میاں بیوی میں حقیقی اور سچا تعاون اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ یہ دونوں مجموعی بھلائی اور بہتری کو انفرادی بھلائی اور بہتری پر مقدم سمجھیں۔''16

جنسی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے ایڈلر کہتا ہے شوہر بیوی آپس کے جنسی تعلقات کو غیر اہم اور معمولی تصور نہ کریں اور اسی طرح جنسی مسائل کے متعلق باپ لڑکوں سے اور ماں لڑکیوں سے اس وقت تک خود کچھ نہ پوچھیں اور نہ اس معاملے میں کوئی

بات کریں جب تک کہ لڑکے اور لڑکیاں خود سوال نہ کریں۔ جب وہ سوال کریں تو ضرورت کے مطابق اور ان کی عمر اور سمجھ کا لحاظ رکھتے ہوئے جواب دیں کہ ان کے جنسی جذبات قبل از وقت ابھر نہ جائیں۔ مدرسوں میں جنسی تعلیم دینے کے بارے میں ایڈلر کہتا ہے کہ جنسی تعلیم کے لیے مدرسہ موزوں مقام نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر مدرس پوری جماعت کو جنسی تعلیم فراہم کرے تو اس کے لیے یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ جماعت کا ہر ایک بچہ اس کی گفتگو سے صحیح نتیجہ اخذ کر رہا ہے یا نہیں اور اس بات کا اندیشہ زیادہ رہتا ہے کہ طلبہ جنسی باتوں کے سننے اور سمجھنے کے لیے تیار ہیں بھی یا نہیں اور جنسی جانکاریوں کو اپنی زندگی میں کس طرح اختیار کریں گے جوان کے اندر جنسی امور پیدا کر دے گا جو کم عمر ہونے کے باعث ان کی جنسی خواہش ایک ہیجان کی شکل اختیار کر لے گی۔ اگر بچے تنہائی میں مدرس سے جنس سے متعلق سوالات کرے تو مدرس کو چاہیے کہ بچے کو صحیح اور سیدھے سادے جوابات دے۔ جماعت میں جنس کے متعلق ہمیشہ گفتگو کرنا نقصان دہ امر ہے۔

جنسی تعلقات کے متعلق آگے ایڈلر لکھتا ہے لڑکے اور لڑکیاں دونوں نوجوانی کے زمانے میں جنسی تعلقات کو غیر ضروری اہمیت دیتے ہیں اور اپنے حرکات سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اب بڑے ہو گئے ہیں اور اپنے بڑپن کے اظہار میں وہ حد سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں مثلاً ایک لڑکی ہمیشہ اس بات کو لے کر لڑتی جھگڑتی رہتی ہے کہ اس کو بے موقع طور پر دبایا جا رہا ہے عام طور پر وہ احتجاجاً گھر سے باہر دوسرے مرد سے جنسی تعلق بنا لیتی ہے، اس عمل کے پیچھے اس کا مقصد اپنے والدین کو پریشان کرنا ہوتا ہے۔ بعض لڑکیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنی جنس کو پسند نہیں کرتیں، یہ تصور عنفوانِ شباب میں شدت اختیار کر جاتا ہے، یہ خیال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ عام طور پر سماج مردوں کو عورتوں پر ترجیح دیتا ہے یہی تصورِ برتری لڑکیوں کو مرد بننے پر اکساتی ہے۔ ایسی جبلت رکھنے والی عورتیں مردانہ دعویٰ کرنے لگتی ہیں۔ اور یہ دعوے کئی شکلوں میں سامنے آتے ہیں۔ بعض لڑکیاں اس عمر میں لڑکوں کے حرکات اپناتی ہیں، لڑکوں کی تقلید کرنا چاہتی ہیں، تمباکو نوشی، شراب پینا اور گالیاں بکنا جیسے افعال سے منسلک ہو جاتی ہیں، بدمعاش لڑکوں کی ٹولیوں میں شامل ہو جاتی ہیں اور جنسی آزادی کا بے باکی سے مظاہرہ کرتی ہیں۔ جب لڑکیوں میں اپنی جنس سے نفرت شدت اختیار کر جاتی ہے تو پھر یہ ہم جنسی مباشرت، عصمت فروشی اور دوسری خلافِ فطرت عادتیں اختیار کر لیتی ہیں۔ کئی دفع ایسا دیکھا گیا ہے کہ ایسی عورتیں مردوں کو ناپسند کرتی ہیں ان سے دور بھاگتی ہیں، بعض دفع یہ ہوتا ہے کہ وہ مردوں کو پسند تو کرتی ہیں مگر جب ان سے روبرو ہوتی ہیں تو بوکھلا جاتی ہیں اور کوئی بات نہیں کر پاتیں ایسی محفلوں میں شامل نہیں ہوتیں جہاں مرد ہوں، لیکن اپنے اس ڈر کو پوشیدہ رکھتے ہوئے باتیں بڑی بڑی کرتی ہیں لیکن ان پر عمل پیرا نہیں ہوتیں۔ ایسی کجروی کا انحصار ایڈلر کے مطابق ہمارے سماج میں رائج تذکیری برتری پر ہے۔ بچوں میں برابری کے تصور پر ایڈلر کہتا ہے کہ یہ بہت ضروری ہے کہ والدین کبھی یہ ظاہر نہ کریں کہ وہ اپنے کسی ایک بچے سے دوسروں کے بہ نسبت زیادہ محبت رکھتے ہیں۔ اگر لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دی جائے تو لڑکیوں میں احساسِ کمتری کا پیدا ہو جانا لازم ہے۔ یہ احساس عضوِ تناسل کی محرومی کی وجہ سے نہیں بلکہ عورت کی مجموعی حالت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ بچے بہت حسّاس ہوتے ہیں، والدین کا یہ ایک خیال کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دیا جانا، انہیں غلط راہ کا مسافر بنا دیتا ہے۔ جب تک بچے یہ تصوّر نہ کریں کہ وہ سب برابر ہیں، ان میں آگے چل کر سماجی دلچسپی پیدا نہ ہو گی۔ اسی طرح جب لڑکے اور لڑکیاں خود کو ایک دوسرے کے برابر تصوّر نہ کریں، دو جنسوں میں خوشگوار تعلقات قائم ہونے میں دشواریاں پیش آئیں گی۔ ان سب کا حل ایڈلر ایک ہی عمل میں بتاتا ہے کہ بچوں کو بچپن سے ہی تعاون کا سبق پڑھایا جائے اور گھر کا ماحول بھی ان کے موافق بنایا جائے کہ وہ کجروی اختیار کیے بنا تینوں مسائل یعنی پیشہ، دوستی اور شادی و محبت کے درمیان باہمی توازن برقرار رکھتے ہوئے ایک خوشگوار زندگی گزاریں۔ یہاں ایڈلر اور فرائڈ دونوں کے نظریوں کے تقابل سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ فرائڈ صرف جنسیت کی بنیاد پر پوری انسانی زندگی کی وضاحت کرتا ہے۔ اس کے مطابق پورا انسانی رویہ خواہش یعنی مسرت کی تلاش کا نتیجہ

لگتا ہے: لیکن ایڈلر کا نظریۂ حیات صرف جنس تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کے مطابق انسان مخصوص مقاصد کا حامل ہے، وہ جنسی طلب کو مختلف تحریکات، مقاصد اور منصوبوں کے ساتھ تبدیل کر دیتا ہے۔ ایڈلر کے نظریے نے ذہانت کو اعلیٰ درجہ عطا کرتے ہوئے وسیع تناظر میں پرکھنے کی کوشش کی جہاں جنس صرف یک علامتی قدر بن کر رہ جاتا ہے۔

سیمون دی بوا

سیمون دی بو کہتی ہے:

> ''عورت اس طرح پیدا نہیں ہوتی جس طرح بنا دی جاتی ہے۔ یہ ہماری سماجی، معاشی، نفسیاتی اور جسمانی ضروریات ہوتی ہیں جو کہ تہذیب و تمدن کے پردے میں خنثی اور مرد کے درمیان کی یک شکل کو عورت کا نام دے دیتی ہیں۔''[17]

آگے لکھتی ہے لڑکا ہو یا لڑکی دونوں کی پرورش ماں کے پیٹ میں یکساں ہوتی ہے، دونوں کی پیدائش کے وقت درد بھی یکساں ہوتا ہے اور دونوں کے دودھ پینے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے عمل میں بھی کوئی فرق نہیں کھا۔ دونوں اپنے اپنے جسموں کی شناخت اور اس میں تبدیلیوں اور میلانات کو اپنی منفرد دلچسپیوں اور انہماک کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ دوسرے بچّے کی پیدائش پر پہلے کا حاسدانہ رویہ اس کی اس حس کی طرف توجہ مبذول کرواتا ہے جہاں وہ اپنے کل اختیاری رویے پر ضرب لگتا محسوس کرتا ہے، یہاں لڑکے اور لڑکی میں کوئی تمیز نہیں ہے بلکہ دونوں یکساں طور پر اس طرح کے ردِعمل کا مظاہر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ضد، بیساب کرنا، رونا چیخنا چلاّنا اور بزرگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے مخصوص انداز کے ردِعمل کا مظاہرہ، دونوں مخالف جنس کی تمیز کے بغیر یکساں ہوتا ہے۔ 12 سال کی عمر تک دونوں ہر معاملے میں یکساں قوت (جسمانی اور ذہنی) کا مظاہرہ کرتے ہیں، قدرت نے دونوں میں چند یک جسمانی فرق کے علاوہ دیگر فطری معاملات میں کوئی تمیز نہیں کی مگر ہمارا معاشرہ دیکھو اس طرح سے دونوں کے تئیں امتیاز برتتا ہے کہ یک صنف ہمارے سامنے طاقتور، حکم سمجھدار عظیم بن کر سامنے آتی ہے تو دوسری صنف گویا کمزور محکوم کمتر او کند ذہنی کی علامت بن جاتی ہے۔

بوا کے مطابق بچّوں میں عورت، مرد کے رویوں کی تمیز گھر کا ماحول کرتا ہے۔ عورتوں کی طرح باتیں کرنا، عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں وہ بھلا کیا فیصلہ کریں گی، عورت کی طرح بکے جانا وغیرہ ایسے بہت سے مضحکہ خیز فقرے ہمیں اپنے معاشرے یا اپنے گھر پہ سننے کو ملتے ہیں جنہیں صرف مذاق کے طور پر لیا جاتا ہے مگر یہ بات مستحکم ہے کہ یہی اور ان جیسے فقرے بچّوں کی بنیاد تعمیر کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ غرور اور انا مردوں کے خصائص سمجھے جاتے ہیں، یہی وہ خصائص ہیں جو بچپن میں گھروں پر ہی یک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے لڑکے کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ کھڑے ہو کر بیساب کرے، لڑکیوں کی طرح بیٹھ کر نہیں، تب لڑکے کو احساس ہوتا ہے کہ اس کے بدن میں یک عضو ایسا ہے، جو بیساب کرنے کے معاملے میں اسے لڑکیوں سے مختلف کرتا ہے، یہ احساس اس کے اندر خود کو بڑا اور برتر سمجھنے کے رجحان کو مستحکم بناتا ہے۔ اور وہ اپنے مخالف جنس کو کمتری کا احساس دلانے اور اپنا رعب ان پر جمانے کے لیے اپنے عضوئے تناسل کو پکڑ کر کھانے، نمائش کرنے اور خود کو ان سے برتر ثابت کرنے میں استعمال کرتا ہے اور اس طرح عضوئے تناسل قوت، جواں مردی اور احساسِ تفاخر کا استعارہ بن جاتا ہے۔ لڑکیوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے کہ اسے جنسی عضو کے بارے میں کچھ بتایا نہیں جاتا کیوں کہ اس کا عضو لڑکوں کی طرح کھا نہیں ہے اس لیے صرف اسے بیساب کرنے کی جگہ سمجھا دی جاتی ہے۔ بوا لکھتی ہے کہ بچپن میں بچے جب اپنے جسمانی اعضا کا تقابل کر رہے ہوتے ہیں تو لڑکی میں اپنے ظاہری عضوئے تناسل کی غیر موجودگی، اسے احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتی ہے۔ بچپن میں لڑکے کے ساتھ امتیازی سلوک ہو تو لڑکی اس کا سبب اس کے عضوئے تناسل کو سمجھتی ہے کیوں کہ تب تک سوائے بیساب کرنے کے عمل اور دیگر افعال و حرکات دونوں جنسوں میں یکساں

پائے جاتے ہیں، لڑکیوں کو بچپن سے سکھایا جاتا ہے کہ وہ چھپ کر پوشیدگی کے ساتھ، بیٹھ کر یہ عمل انجام دے اس کے برعکس لڑکوں کی اس طرح سے تربیت نہیں کی جاتی، وہ کھڑے ہو کر اپنی مرضی سے کھلی جگہ میں بھی استنجا کر سکتے ہیں۔ لڑکیاں جب چھوٹی عمر میں لڑکوں کے ننگوں کے بیچ ایک اضافی چیز لٹکی ہوئی دیکھتی ہیں تو اس کا بہت مذاق اڑاتی ہیں اسے چھیڑتی ہیں۔ کچھ لڑکیاں چاہتی ہیں کہ ان کے جسم میں بھی اس قسم کی کوئی چیز نکل آئے وہ لڑکوں کے برابر ہو جائیں۔ لڑکیوں میں اس احساسِ محرومی کے ازالے کے طور پر نہیں گڑیا دے دی جاتی ہے کہ وہ گڑیا پورے جسم کا استعارہ بن جاتی ہے گڑیے کے ذریعہ ہی اسے اپنے جسم اور سماج میں اس کے کردار کے تئیں آگاہی فراہم کی جاتی ہے گڑیا سے بات کرنا، اسے نہلانا کپڑے پہنانا، اس کی شادی کروانا وغیرہ سکھایا جاتا ہے جس سے اس لڑکی کا مستقبل کے لیے اسی انداز سے متحرک کیا جاتا ہے، جوں جوں اس کی عمر بڑھتی ہے اسے یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ اسے ایک پینٹنگ کی طرح خوبصورت اور شہزادی کی طرح باوقار لگنا چاہیے۔ اس طرح کی تربیت لڑکیوں کو لڑکوں کے بہ نسبت نازک اور جسمانی طور پر کمزور بنا دیتی ہے۔

اس کے برعکس لڑکوں کو مکمل آزادی دی جاتی ہے کہ وہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ لڑائی کر کے، ورزش کر کے، بھاگ دوڑ کر کے، ندیوں میں تیر کر اپنے پٹھے مضبوط کرتے ہیں۔ لڑکیوں کے مقابلے لڑکوں کے کھانے کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر مضبوط بنیں کہ نہیں آگے چل کر اپنی فیملی کے لیے ذریعۂ معاش بننا ہے، اور اپنی اور اُن کی حفاظت کرنی ہے۔ اس لیے اس کو بچپن ہی میں چوٹ کھانے، درد برداشت کرنے اور نہ رونے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ لیکن لڑکیوں کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں دی جاتی نہیں گھر میں ہی رکھا جاتا ہے اور اسے دوسروں کے لیے ایک مشین کی طرح کام کرنے، کھانا پکانے گھر سنبھالنے، بچے پیدا کرنے اور نہیں سنبھالنے، اپنے مرد کو قابو میں رکھنے کے گر سکھائے جاتے ہیں۔ بولکھتی ہے کہ اگر لڑکیوں کو بھی بچپن سے لڑکوں کی طرح آزادی دی جائے اور وہ بھی لڑکوں کی طرح اسی طرح کے حرکات واعمال میں ملوث رہیں تو وہ بھی ہمت ور اور حوصلہ مند بن سکتی ہیں اور تجربات سے یہ ثابت بھی ہوا ہے۔ ہم اگر مثال دینی چاہیں تو ہریانا میں جنمی پھوگھاٹ بہنیں گیتا اور ببیتا پھوگھاٹ، جن کے والد مہابیر سنگھ پھوگھاٹ نے ان کی تربیت اسی طرح سے کی جس طرح لڑکوں کی کی جاتی ہے۔ آج وہ کشتی میں دنیاوی سطح پر اپنا نام پیدا کر چکی ہیں، اس طرح پوری دنیا میں کئی ایک مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ چند ایک مخصوص افراد جنہوں نے معاشرے کے برعکس جا کر وہ کر دکھایا جس کے نہ ہونے کی سند معاشرہ لیے گھومتا ہے۔ مگر معاشرے کی پکڑ اتنی پختہ ہے کہ اس سے پیچھا چھڑا پانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیے آج بھی غالب رجحان یہی نظر آتا ہے کہ لڑکی سیدھی ہو کر نہ چلے کہ اس کے سینے کا اُبھار صاف دکھنے لگتا ہے، لڑکا جھک کر نہ چلے کہ یہ مردوں کی شان کے خلاف ہے، یہاں تک کہ کھیلوں میں بھی امتیاز برتا جاتا ہے کہ لڑکی، لڑکوں کی طرح ہاکی، کرکٹ، فٹ بال یا کشتی وغیرہ نہیں کھیل سکتی، یہ سارے لڑکوں کے کھیل ہیں لڑکی صرف گڑیوں کے ساتھ ہی "گھر گھر" کھیل سکتی ہے کہ یہ کھیل اسے ایک عورت کی زندگی گزارنے کے طریقے سکھاتا ہے، وہ اس کھیل میں اپنی ماں کی پیروی کرتی ہے، اس کی ماں جس طرح اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہے وہ بھی اسی طرح اس گڑیا کو اپنی اولاد مان کر اس کے ساتھ پیش آتی ہے۔ بوا کے مطابق اس کھیل کے علاوہ ادب، ڈرامہ، ناول، فلمیں یا جو تقاریر اسے سنائی جاتی ہیں اس سے وہ یہی بات اخذ کرتی ہے کہ وہ بھی ابھی اس گڑیا کی طرح ایک گڑیا ہے جو بڑی ہو کر شادی کر کے ماں بن کر بچے پالے گی۔ کبھی کبھی ایسا بھی دیکھا جاتا ہے کہ بچی اپنی حاملہ ماں کی نقل اتارتے ہوئے اپنے پیٹ میں کپڑے باندھ کر اسی طرح سے چلنے کی کوشش کرتی ہے جیسی اس کی ماں چلتی ہے، اور کبھی کبھی اپنی ماں کو اپنے بچے کو دودھ پلاتے دیکھ کر وہ بھی اپنے گڑیا کو اپنے سینے سے لگا کر دودھ پلانے کا ڈھونگ کرتی ہے، لڑکے ماں کو حاملہ دیکھ کر حیرت میں پڑتے ہیں مگر وہ لڑکیوں کی طرح اس عمل کی نقل نہیں اُتارتے کیوں کہ نہیں یہ لگنے لگتا ہے کہ وہ مرد ہیں اور مرد یعنی ابّا کے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہوا ہے جو امّاں جھیل رہی ہیں۔

سنِ بلوغت کی بات کریں تو لڑکا پندرہ یا سولہ سال کی عمر میں مردانہ عادات وخواہشات کا محسوس کرتا ہے جبکہ لڑکی تیرہ یا چودہ سال کی عمر میں ہی ماہواری کے حوالے سے جسمانی بلوغت کے لیے تیار ہوتی ہے۔ پہلے زمانے میں اور آج بھی کہیں کہیں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ماہواری آتے ہی اس کی شادی کر دی جاتی ہے۔ بلقیس لکھتی ہے کہ لڑکا اپنے جوان ہونے کی کیفیت کو حیرانی اور خوشگوار لذت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنے جسم پر نئے نئے پیدا ہونے والے بالوں، اپنی داڑھی اور مونچھ کو فخریہ انداز میں دکھاتا اور بتاتا ہے۔ گویا حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ:

"نسائیت، شرم اور اپنے آپ کو دست بستہ پیش کرنے کی علامت بن کر اور مردانگی احساسِ تفخر اور اپنے آپ کو سر بلند رکھنے کی خواہش کا پرچم بن کر ظاہر ہوتی ہے۔"18

اگر عورت میں بھی ماہواری کو اگر احساسِ فخر پیدا کیا جائے اور اس اخراج کے نتیجے میں تولیدی صلاحیت کا احساس کرایا جائے تو اس کے اندر سے بھی کمتری اور بے چارگی کا احساس ختم ہو جائے گا۔ وہ کہتی ہے کہ آج کی عورت کو چاہیے کہ اپنی ماہواری کو صلاحیت کے طور پر قبول کرے۔ آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لڑکیاں اپنے گھر اور معاشرے میں بڑی عمر یا اپنے ہم عمر مخالف جنس سے جنسی احساس کو اُبھارنے کے معاملے میں عجیب عجیب نازیبا حرکات کا تجربہ کرتی ہیں۔ ماہرینِ نفسیات کی رائے میں کئی لڑکیوں کے نزدیک اندامِ نہانی کا مطلب صرف پیشاب کرنے کی جگہ ہے اور کچھ نہیں مگر لڑکے میں اپنے عضوِ تناسل کے کرنے سے جنسی جذبات کے ابھار کا اظہار ہو جاتا ہے اور یہ اس کی گرفت میں ہوتا ہے کہ وہ اس ابھار کو اخراج سے تکمیل تک پہنچائے مگر لڑکی میں یہ سارا عمل اندر ہوتا ہے، اس کا جی چاہتا ہے تو جنسی خواہش بیدار ہوتی ہے مگر اس کے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہے، اس معاملے میں وہ خود کو دوسرے پر منحصر متصور کرتی ہے اس کو احساس ہوتا ہے کہ اس کا بدن دوسروں کے لیے ہے۔ مگر مرد کے سامنے برہنہ ہونے کے خیال سے ہی اس میں ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے، سب سے بڑا خوف اس میں اس عمل سے آگاہ ہونے کے بعد پیدا ہوتا ہے کہ مرد کا عضوئے تناسل اس کے اندر داخل ہوتا ہے۔ اپنے جسم کے ساتھ اس طرح کا خوف نہ صرف ڈراؤنے خواب میں منتقل ہو جاتی ہے یہاں تک کہ کئی لڑکیاں اپنے باپ سے بھی نفرت کرنے لگتی ہیں۔ بلقیس لکھتی ہے کہ ماہرینِ نفسیات یہ بھی بتاتے ہیں کہ کئی لڑکیوں کو یہ خواب آتا ہے کہ ان کے ساتھ مرد ان کی بڑی اماؤں کے سامنے مباشرت کر رہے ہیں اور وہ کچھ نہیں کہہ رہی ہیں، ظاہر ہی بات ہے کہ ایک لڑکی بھی چاہتی ہے کہ لڑکے کی طرح اسے بھی اپنی جنسی کیفیات کے اظہار کی آزادی ملے۔ عام طور پر گھروں میں ہم دیکھتے ہیں کہ لڑکے گرز کرانی کے ساتھ غلط حرکت کرتے ہیں تو وہاں نوکرانی کو ہی لعنت وملامت کیا جاتا ہے مگر لڑکی اگر اپنے ڈرائیور یا مالی کے ساتھ ایسی کوئی حرکت کرے تو لڑکی کو سزا کا مستحق ٹھہرایا جاتا ہے، لڑکی سے ہر وہ چیز پوشیدہ رکھی جاتی ہے جو اس میں جنسی احساس کے اُبھارنے میں مددثابت ہو، اس سے لڑکی کو اپنی ماہواری سے لے کر جنسی احساس کے پیدا ہونے کے سارے مراحل کچھ اس طرح سے محسوس ہوتے ہیں کہ یہ اس کی ذلت کا باعث ہیں نہ کہ فخر کی علامت جو آگے چل کر اسے ایک نئی زندگی تخلیق کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ مگر بڑے اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو پاتے ہیں کیونکہ لڑکیاں چھپ چھپ کر کسی بھی ذریعے سے اپنے جنسی تجسس کا حل نکال لیتی ہیں۔ اس معاملے میں بوا نے تفصیل سے بتایا ہے اور آخر میں لکھتی ہیں کہ:

"علم کو جس قدر بھی محدود کرنے کی کوشش کی جائے مگر لڑکی کو اس کے جسم کے قدرتی عوامل، اُبھار اور تبدیلیوں سے ما محسوس اور محسوس واقفیت سے گریزاں نہیں رکھا جا سکتا۔ بلکہ اسے سکھایا جائے تو اس میں اپنی ذات کے بارے میں قناعت، تفاخر اور احساسِ عزت اور زیادہ ہوگا۔"19

آگے بوا لکھتی ہیں کہ سنِ بلوغ میں قدم رکھنے کے بعد لڑکا ایک لڑکی کے انتظار میں اور لڑکی ایک لڑکے کے انتظار میں اپنی اپنی سمت میں اپنا سفر شروع کرتے ہیں مگر دونوں کی منزل میں نمایاں فرق ہوتا ہے کہ لڑکی، لڑکے کے لیے زندگی کے صرف ایک حصے کی وقعت رکھتی ہے، وہ اس کی منزل نہیں بنتی ہے۔ مگر لڑکی چاہے آزاد خیال ہو یا رجعت پسند اس کو اپنی منزل اپنے

شریک حیات کے حصول میں ہی نظر آتی ہے۔یہ اس لیے ہوتا ہے کہ بچپن سے لے کر جوانی کی خواہشات پیدا ہونے تک مرکو ہی زندگی کے سارے وسائل کا ذریعہ مانتی ہیں جو اس کو شادی کے ذریعہ معاشی اور سماجی تحفظ فراہم کرتا ہے،شادی عورت کے لئے کم خطرہ اور کم چیلینج یافتہ پیشہ محسوس ہوتی ہے جہاں اسے اپنوں کے قریب رہ کر ہی اپنی ذمہ داریاں نبھانی ہوتی ہیں،مردوں کی طرح باہر انجانے شہروں یا انجانے لوگوں کے درمیان جدوجہد کرنی نہیں پڑتی۔یہ اس کے لیے ایک ایسا پیشہ ہے جو اسے سماج میں عزت بخشتا ہے محبوبہ اور ماں بننے کی معراج حاصل ہوتی ہے۔اس کے لیے وہ اپنے آپ کو مردوں کے سامنے خود حفاظتی اور خود کفالت کے لیے پیش کرتی ہے تو گویا وہ اپنے آپ کو مادّی اور اخلاقی طور پر مرد سے کمتر تسلیم کر لیتی ہے،یہ اس کی شعوری کاوش نہیں ہوتی بلکہ بچپن سے اسی انداز میں کی گئی اس کی تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے کہ اس کا ذہن ایسے ہی سانچے میں ڈھال دیا جاتا ہے۔شادی کو وہ اپنے لیے ایک باعزت مستقبل کی راہ تسلیم کرتی ہے کہ ایک پرانے گھر اور حکم سے نئے گھر اور نئے حکم کی غلامی میں آ کر کچھ وقفے کے لیے اپنے آپ کو نازہ دم محسوس کرتی ہے۔کیوں کہ ایسے ماحول کی تربیت یافتہ لڑکیاں یہ سمجھنے پر مجبور ہوتی ہیں کہ معرکتہ الآرا کام صرف مرد ہی انجام دے سکتے ہیں اور وہ خود کو مرد کے خوابوں کے پیکر میں ڈھالنے کو اپنی معراج سمجھ لگتی ہیں۔اس لیے وہ اپنے آپ کو صنف نازک کے دائرے میں ہی رکھنا پسند کرتی ہے اور یہ اسے باور بھی کرایا جاتا ہے کہ جہاں اس نے اپنے آپ کو آگے لانے اور مردوں سے برتر سمجھنے کی کاوشش کی وہیں وہ صنف نازک کے دائرے سے باہر ہو جائے گی۔اس لیے شادی کے بعد اسے چاہیے کہ وہ اپنی ذات کو مرد کا پرتو سمجھے،اس کی انا کے آگے اپنی انا کو باطل جانے،اس کے سکون کی خاطر خود کو خوبصورت بنائے،نتیجتاً جوان ہونے کے بعد وہ اپنے جسم خصوصاً اپنے پستانوں کی مالش کر کے نہیں جاذب نظر بنانے کی کاوشش کرتی ہے اور من ہی من ایک مرد کے احساس سے شرما کر اپنی مسکراہٹ سے خود محظوظ ہوتی ہے۔

بوا اس حقیقت کو بھی سامنے لاتی ہے کہ ہماری تہذیب ہمارا معاشرہ عورت کے لیے یہ فرمان جاری کرتا ہے کہ وہ عصمت رکھتی ہے جوانی کے بعد جس کے لُٹنے کا ہر پل اندیشہ رہتا ہے مگر مرد جنسی آزادی رکھتا ہے،بوا کی یہ بات سو فیصدی صحیح ہے اگر کوئی دوشیزہ مرد کے ہاتھوں عصمت فروشی کا شکار ہوتی ہے تو عزّت اس دوشیزہ کی لُٹتی ہے مرد کا کچھ نہیں جاتا،ہماری تہذیب ہمارا معاشرہ اس عجیب سی حقیقت کے ساتھ مستقبل کی راہ پر گامزن ہے عورت کی عزّت اس کے جسم کے دائرے میں بند ہے مگر مرد کی عزّت کا محور اس کا جسم نہیں ہوتا بلکہ اس سے منسلک بیرونی دنیا کے رشتے ہوتے ہیں جن میں خصوصاً بیوی اور بیٹی کی عزّت شامل ہوتی ہے کہ ان سے سرزد ہونے والے کچھ نازیبا (معاشرے کی نظر میں) حرکات کی وجہ سے اس کی پگڑی اُچھل جاتی ہے۔عورت کی عزّت کو اتنی وسعت کیوں نہیں ملی؟ کیوں اسے عنوانِ مرد کے ہی ذیلی باب میں شامل کر دیا گیا ہے؟ جہاں مرد کو ایک جنسی آزادی ملتی ہے کہ اوپر درج مثال کی طرح وہ گر اپنے گھر کی نوکرانی کی عزّت لُٹتا ہے تو وہ لعنتی نہیں بنتا بلکہ اس نوکرانی کو ہی بُری اور بدچلن شمار کر دیا جاتا ہے۔اس کے برعکس عورت کی جنسیت شادی اور اس کے شوہر کی ذات میں ہی محدود کر دی جاتی ہے۔زمانہ قدیم سے لے کر آج تک جنسیت کے قانونی عمل میں عورت کو اپنے جسم کی سپردگی اور تاحیات خدمت گزاری کے صلہ میں جہیز،ماہانہ الاؤنس اور منہ دکھائی بھی ملتی ہے،تو کہاں سے اس رشتے میں برابری اور باہمی عزّت کا تصوّر پہنچے گا،شادی اور طوائفیت دونوں طریقوں سے پتہ چلتا ہے کہ عورت خود کو ایک مرد کے حوالے کرتی ہے،جس کے عوض میں طوائف کو ایک مشت شبینہ اور بیوی کو ماہانہ گزارا الاؤنس اور عزّت کے تحفظ کے لیے چھت کا آسرا ملتا ہے۔بس اتنا ہے کہ گھر کی چہار دیواری میں قید عورت اس خوش فہمی میں زندہ رہتی ہے کہ اس کی عزّت خطرے سے باہر ہے اور ایک طوائف کی طرح اسے ہر رات ہر دوسرے مرد کے ساتھ اپنا بستر نہیں بدلنا پڑتا۔اس طوائف کے پاس کوٹھا ہے جس کا دروازہ ہر قسم کے انسان کے لیے ہر وقت کھلا رہتا ہے مگر گھر کی عورت کٹھی میں اپنے شوہر کے ساتھ ایک محفوظ قیدی کی زندگی گزار رہی

ہوتی ہے۔ جہاں گھر کے معاملات تو دور کی بات رات میں اپنے شوہر کی جنسی بھوک کی تسکین کے معاملے میں بھی وہ اپنی مرضی یا اپنے پسندیدہ طریقے کا اظہار نہیں کر سکتی اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ شوہر خود کو سکون ملنے کے بعد اپنی بیوی سے یہ تک نہیں پوچھتا کہ اس نے بھی اس جنسی عمل سے اتنی ہی لذّت اُٹھائی یا نہیں۔ بہت دفع ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہی عزّت دار گھریلو عورتیں اپنے بھوکے بے حس شوہر کے ذریعہ Marital Rape کا شکار ہوتی ہیں مگر چونکہ یہ عصمت دری مذہب یا قانون کے اعتبار سے جُرم کے زُمرے میں شامل نہیں ہے اس لیے عورتیں اسے اپنا فرض جان کر برداشت کیے جاتی ہیں۔

مرد کے ساتھ منسلک ایک اور فخر اس کی ذات کو اور برتر بنائے ہوئے ہے کہ جنس میں پہل کرنا مرد کی ہی میراث سمجھی جاتی ہے اور اس پر طرّہ یہ کہ ایک دوشیزہ کو عورت بنانے کا حق اسے ہی حاصل ہے کہ جب تک دوشیزہ کا اندامِ نہانی مرد کے عضوئے تناسل سے تعلق میں نہیں آئے گا تب تک اسے عورت بننے کا شرف حاصل نہیں ہو سکتا۔ جس طرح عورت اپنی مکمل نسائیت کے حصول میں مرد کی مرہونِ منت ہے اس طرح ایک لڑکے کے مرد بننے کے لیے ایسی کوئی شرط موجود نہیں ہے، لڑکا جوان ہوتے ہی مرد کے زُمرے شامل ہو جاتا ہے، تو کیوں عورت سے متعلق اس طرح کا تصور سماج میں رائج ہے۔ بلکہ اس طرح کی سوچ رائج ہونی چاہیے کہ لڑکے کی طرح لڑکی بھی جوان ہوتے ہی عورت بن جاتی ہے۔ اور رہا سیکس کا معاملہ تو شادی کے بعد جنسی تعلق کے قائم ہونے میں نسلِ انسانی کو آگے بڑھانا مقصود ہے اور ساتھ ساتھ اپنے بدن کی جنسی ضرورت کو پورا کرنا بھی ہے جس ضرورت کے تقاضے کے دائرے میں مرد اور عورت دونوں برابر کے شریک ہیں۔

عورتوں میں لزبینزم کے تصور پر بوا نے تفصیلی معلومات فراہم کی ہے کہ کس کس طرح کی عورتیں اس غیر فطری عمل میں خود کو شریک کر کے جنسی لذت سے ہمکنار ہوتی ہیں، اس بحث میں بوا نے بہت ساری ایسی عورتوں کی مثالیں بھی پیش کی ہیں کہ اُن کی زندگی میں پیش آنے والا کون سا واقعہ ان میں اس جبلّت کے پیدا ہونے کا محرک بنتا ہے۔ ایسی عورتیں جن میں مردانہ ہارمونز بڑھ گئے ہوں ممکن ہے ان کے اندر ایسے خواہشات پیدا ہوں، ایسی عورتیں جن کے ساتھ بچپن یا جوانی میں جنسی جبر یا زیادتی کی گئی ہو وہ اپنی اس نفسیاتی خامی کو دور کرنے کے لیے یا مردوں سے نفرت کے اظہار میں عورت کے ہی ساتھ جنسی عمل میں مبتلا ہو کر خود کو سکون فراہم کرنا چاہتی ہو۔ بوا آگے لکھتی ہے کہ اگر فطرت کی بات کی جائے تو پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تمام عورتیں لزبین ہوتی ہیں۔ ہر نوجوان لڑکی مرد کے دخول اور اس پر حاوی آنے کے عمل سے خوفزدہ ہوتی ہے جبکہ عورت کا بدن اس کی طرح کا ہوتا ہے جو کوئی خوفزدہ کرنے والی چیز نہیں ہے. مگر بوا کا یہ نظریہ ہر ایک کے معاملے میں برابر نہیں مانا جا سکتا، کیوں کہ مشرقی معاشرے میں ہم جنس کا تصور ناپید تو نہیں ہے مگر (چاہے وہ مذہب کا اثر ہو یا شریف و باعزت خاندان کا یا معاشرے کا کہ جہاں ایسی غیر فطری حرکتوں کو ترجیح نہیں دی جاتی یا اخلاقی قدروں کا) بہت ساری عورتیں ایسی نفسیات کی حامل بھی موجود ہیں جنہیں ہم جنس کے تصور سے ہی گھن آتی ہے کراہیت محسوس ہوتی ہے، اس لیے ہر عورت کے ساتھ لزبین فطرت کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔

پھر بوا لزبین کے دو اقسام کا ذکر کرتی ہے جن میں ایک وہ جو مرد کے وجود سے خوفزدہ ہو کر ایک دوسرے میں ضم ہونا پسند کرتی ہیں اور دوسرے وہ جو مرد کی نقل کرنا پسند کرتی ہیں۔ خوف والی بات کی وضاحت تو اوپر ہو چکی ہے، یہ نقل والی نفسیات کا معاملہ بہت ساری وجوہات کی بنا پر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مرد حاوی معاشرے میں مرد کے زیر دست زندگی گزارنے کا تصور اسے مرد بننے پر اُکساتا ہے کہ اختیار و اقتدار کسے پسند نہیں ہیں۔ بوا کے مطابق اگر دونوں جنسوں میں برابری اور مساوات کو عمل میں لانے کی کوشش کی بھی جائے تو بھی مرد اپنی برتری کے حصار سے نکل نہیں پائے گا اور ایک ذہین عورت، مردوں کے ایسے رویے کو اپنی تضحیک کے مترادف مانتی ہے، وہ ایک عورت کے طور پر مرد کے زیر دست رہ کر اپنی آزادی کی قربانی دینا پسند نہیں کرتی بلکہ جنسی جذبہ حاصل کرنے میں بطور مرد شریک ہونا پسند کرتی ہے۔ ایسی عورتیں حاوی ہونا

پسند کرتی ہیں کیوں کہ عورت کو جس حقارت سے مخاطب کیا جاتا ہے وہ حقارت ان کی زندگی میں زہر بن کر سرایت کرجاتی ہے، اس لیے وہ ہم جنسیت کا شکار ہوجاتی ہیں۔ حسین، نیم بالغ دوشیزائیں عورت نہ ہونے کے احساسِ کمتری کا بے سبب شکار ہو کر ہم جنسیت اختیار کرلیتی ہیں۔ بدصورت عورتیں بھی اپنے مخالف جنس کی توجہ حاصل نہ کرنے کے سبب اس غیر فطری عمل میں شامل ہو کر اپنی جنسی جبلّت کو راہِ فرار مہیا کرتی ہیں۔ گرلس ہاسٹل یا ایسے ادارے جہاں صرف عورتیں کام کرتی ہیں، وہاں لڑکیاں اور عورتیں ہم جنسیت کی شکار ہوجاتی ہیں۔ اس کا سبب بتاتے ہوئے بووا کہتی ہیں کہ ہوسکتا ہے عورت، عورت کی جانب اس لیے مائل ہوئی ہو کہ کسی مرد نے اسے جنسی لذت کے حصول میں بہت مایوس کیا ہو مگر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ عورت مرد میں بھی ایک عورت کی متلاشی ہو اور اسی تلاش نے اُسے مرد سے دور اور عورت کے قریب کیا ہو کہ وہ ہم جنسیت میں مبتلا ہوگئی ہو۔ بووا اس لزبینزم پر اپنی سوچ اس طرح بیان کرتی ہیں کہ:

> "In truth, homosexuality is no more a deliberate perversion then a fatal curse. It is an attitude that is choosen in situation; it is both motivated and freely adopted. None of the factors the subject accepts in this choice- physiological facts, psychological history or social circumstances- is determining, although all cotribute to explaining it. It is one way among others for woman to solve the problems posed by her condition in general and by her erotic situation in particular."[20]

یہ تو تھے جنس کی بنیاد پر چار بڑے ماہرین کے نفسیاتی نظریات۔ بہ نسبت محض نظریات پر انحصار کرنے کے آیئے چند ایک تجرباتی تحقیق پر نظر ڈالتے ہیں کہ معاشرے میں مرد اور عورت کی رائج حیثیت سے انسانی نفس کا اصل متفق ہے بھی یا نہیں۔ انسانی نفس، ذات یا سائیکی میں جنس سے جڑے اختلافات پر بہتر تحقیقی تجربے کیے گئے ہیں۔ نہیں بنیاد بنا کر یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ مرد اور عورت کی ذات سے منسلک مختلف مفروضات کہاں تک دُرست ہیں۔

تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ تعداد کے اعتبار سے 100 لڑکیوں کے مقابلے 130 سے 150 نرینہ بچوں کے حمل موجود ہوتے ہیں۔ مادہ حمل کے مقابلے نرینہ حمل کے لیے اسقاط کی شرح زیادہ ہے۔ زندہ بچ جانے کا تناسب تقریباً 106 نرینہ بچوں کے مقابلے میں 100 مادہ بچے ہیں۔ یعنی 100 لڑکیوں کے مقابلے 106 لڑکے پیدا ہوتے ہیں۔ قبل از پیدائش مادہ جنین نرینہ جنین کے مقابلے زیادہ مضبوط اور سخت جان ہوتا ہے۔ تحقیق، حیاتِ انسانی پر بھی روشنی ڈالتی ہے کہ نیچرل موت کی شرح عورت کی نسبت مردوں میں زیادہ ہے اس وجہ سے کہ عورت کی متوقع عمر مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اب اگر انسانی دماغ کی بات کریں تو قبل از پیدائش اور بعد از پیدائش دماغی نشوونما میں بھی دونوں جنسوں میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ لڑکیوں میں دماغ کا بایاں نصف کرہ تیز رفتاری کے ساتھ نشوونما پاتا ہے۔ جبکہ لڑکوں میں دماغ کے دائیں نصف کرے کی نشوونما کی رفتار تیز ہوتی ہے۔ نتیجتاً لڑکوں میں ریاضی اور میکانکی مہارت لڑکیوں کی بہ نسبت تیز تر ہوتی ہے اور لڑکیوں میں لفظی مہارت لڑکوں کے بہ نسبت تیز ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دماغ کے دائیں اور بائیں نصف کرے کو آپس میں ملانے والے اعصبی ریشے مردوں کی بہ نسبت عورتوں میں زیادہ کثیف ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے دونوں نصف کروں میں بہتر رابطہ پایا جاتا ہے، اس لیے اور دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ عورت میں لفظی مہارت کا اظہار بہتر طریقے سے ہوتا ہے۔

لڑکے اور لڑکیوں کی ذہنی نشوونما میں ایسے معمولی قسم کے اختلافات پائے جاتے ہیں جن کا ظہور اور زوال عنفوانِ شباب تک ہی محدود رہتا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر کوئی قابلِ غور اختلاف مرد اور عورت کی ذہانت (I.Q.) میں نہیں پایا گیا۔ پھر بھی عورت، مرد کے مقابلے کند ذہن مانی جاتی رہی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ عقلی صلاحیت کی زوال پذیری عمر رسیدہ عورتوں کی بہ نسبت عمر رسیدہ مردوں میں

زیادہ پائی جاتی ہے۔یعنی مرد اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ اپنی ذہانت، حفظان قوت اور عقلی صلاحیت زیادہ تیزی سے کھو دیتے ہیں۔انسانی جنسیت کے بارے میں کی گئی تحقیق سے کئی حقیقت واضح ہوئی ہیں کہ مرد اور عورت دونوں اپنے جنسی ردِّ عمل کے سلسلے میں چار مراحل سے گزرتے ہیں، یعنی ہیجان، ہمواریت، انتہا اور تحویل قوت۔پہلے مرحلے میں جنسی بیداری کا آغاز ہوتا ہے، دوسرے میں ہیجان بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے، انتہا کے مرحلے میں اخراج کے عمل سے گزرنے کے بعد شدید سکون کا احساس پیدا ہوتا ہے، آخری مرحلے میں پھر سے نارمل حالت لوٹ آتی ہے، اس حالت میں عموماً بلڈ پریشر کم ہوتا ہے اور دل کی دھڑکن نسبتاً سست ہو جاتی ہے۔(Masters and Johnson, 1970)ان مراحل کو طے کرنے میں دونوں اصناف میں یک نمایاں فرق پایا جاتا ہے کہ عورتیں یکے بعد دیگر یک سے زیادہ بار انتہا کی حد تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتی ہیں جبکہ مرد میں یہ صلاحیت نہیں پائی جاتی۔اس سلسلے میں پائے جانے والے حقائق کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کم سے کم اس معاملے میں تو عورت مرد کے مقابلے صنف قوی کا درجہ رکھتی ہے۔(Hall, 1969)21

مشاہدے سے پتہ چلا ہے کہ عورتوں کے مقابلے مردوں میں (Minimal Brain Dysfunction) MBD زیادہ تعداد میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔یعنی ذہنی معذور لڑکیوں کی بہ نسبت ذہنی معذور لڑکے زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ Mental Retardation کی شرح فیصد بھی لڑکوں کی نسبت کم پائی جاتی ہے۔نفسیاتی تحقیق کے نتیجے میں ذہنی امراض کے زُمرے میں سیکڑوں ذہنی علامات کی درجہ بندی کی گئی ہے، ان میں سے صرف 44 ایسی ہیں جن میں مردوں اور عورتوں کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔ان کے علاوہ جتنی علامات پائی جاتی ہیں ان میں مرد اور عورت دونوں برابر کی شدت سے شکار ہوتے ہیں۔ان چوالیس علامات میں سے 23 ایسی ہیں جو مردوں میں اور 21 عورتوں میں نسبتاً زیادہ تواتر میں پائی جاتی ہیں۔(Diagnostic & Statistical Manual of Mental Disorders, or DSM, 1987)۔بمطابق NHANES III (Third NATIONAL HEALTH AND NUITRIRION EXAMINATION SURVEY 1981-1991) کے رپورٹ کے عورتوں کے مقابلے مرد زیادہ Normotensive اور Hypertensive کا شکار رہتے ہیں۔ Community Hypertension Evaluation Clinical Programme کی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ عمر کے ہر درجے میں عورتوں کے مقابلے مردوں میں خون کے دباؤ(High Blood Pressure) کا تناسب زیادہ پایا جاتا ہے۔اور یہ امر بھی تحقیق سے ثابت ہے کہ لڑکیاں لڑکوں سے تقریباً دو سال پہلے عالمِ شباب میں داخل ہو جاتی ہیں جبکہ لڑکے اُس وقت تک بھی نابالغ شمار کیے جاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ عورتوں میں تخلیقیت (Creativity) اور تحریک اصول (Achievement Motivation) جیسی شخصی خصوصیات کی غیر موجودگی یا فقدان مردوں کے مقابلے عورتوں کی کمتر حیثیت کو ثابت کرنے کے پیمانوں میں سے یک پیمانہ ہے۔معاشرتی نظریے سے دیکھا جائے تو عورت کے مقابلے مرد زیادہ تخلیقی ہوتے ہیں۔ مگر تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ تخلیقیت میں کمی بیشی جنسی افتراق سے نہیں بلکہ شخصی دلچسپی، رجحانات اور میلانات کی کمی و زیادتی پر منحصر ہے کسی غیر معمولی اور مناسب ردِّ عمل کے ظہور پذیر ہونے میں فرد کی دلچسپی، حصول کی لگن، یکسوئی، مضبوط ارادے کا ہی دخل ہے نہ کہ فرد کے مرد ہے تو تخلیق زیادہ مناسب اور بہتر طریقے سے سامنے آسکتی ہے(Dallas & Gaier, 1970)، دنیا میں ایسی مثالیں بہتر امل سکتی ہیں کہ جہاں مردوں کے شانہ بشانہ عورتیں بھی تخلیقی میدانوں میں اپنا جھنڈا نصب کر چکی ہیں۔دونوں اصناف کے تعداد کی کمی بیشی میں کہیں کوئی ثابت کردہ ذہنی برتری اور کمتری کا عمل دخل نہیں ہے بلکہ مردوں کے بہ نسبت عورتوں کو کم مواقع ملنا اور یک لمبے وقت تک کے لیے گھر کی چہار دیواری میں قید رکھ کر تعلیم اور باہری دنیا کے تجربے سے محروم رہنا، اس کے وجوہات میں شامل ہیں، کیوں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بہت زیادہ ذہین اگر تخلیقی نہیں ہوتے۔(Terman & Oden, 1959) تخلیقیت کا تعلق خاص طور سے اینڈروجائن (Androgyny) سے ہے، جس سے مراد یک انسان کے اندر پائی جانے والی اپنی ذات کے مردانہ

اور زنانہ پن دونوں کو قبول کرنے والی استعداد ہے۔(Helson, 1962; Spence & Helmreich 1968) کامیابی کے حصول (Achievement of Success) کو ماہرین نفسیات عام طور پر تحریک اصول (Achivement of Motivation) کا نام دیتے ہیں۔ان کے مطابق کامیاب لوگوں میں اونچے درجے کی تحریک حصول پائی جاتی ہے۔ جنس سے متعلق تحریک حصول کے معاملے میں ماہرین نفسیات نے یہ نظریہ پیش کیا کہ عورتیں بہ نسبت مردوں کے بہت زیادہ تحریک حصول اس لیے نہیں رکھتیں کہ وہ عموماً گھر کی چہار دیواری میں محدود رہتی ہیں، اور اگر وہ کام کرنے باہر نکلی بھی ہیں تو بااثر اور نفع بخش ملازمتیں حاصل نہیں کر پاتیں۔اس طرح کی تحقیق کے نتیجے میں کچھ ماہرین نفسیات نے یہ محسوس کیا کہ عورتیں تحریک حصول کے معاملے میں مردوں سے کم درجہ رکھتی ہیں۔عورتوں میں پائے جانے والے اس فقدان کو انہوں نے ''کامیابی کا خوف'' کا نام دیا۔لیکن اس تحقیق کو بنیاد بنا کر کئی ایک تحقیقات وجود میں آئیں جن کے تحت یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ اب تک جس چیز کو کامیابی کا خوف کہا جارہا تھا وہ دراصل ایک اجتنابی یا پرہیزی ''ردِ عمل'' ہے، جو معاشرتی، معاشی اور روایتی حالات کے نتیجے میں ظاہر ہوتا ہے۔اس ردِ عمل کا ظہور جنس کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ یہ مرد اور عورت دونوں میں پایا جاتا ہے۔(Tresemer, 1976) معاشرتی اور معاشی اعتبار سے پچھڑا ہوا ہر فرد اس اجتنابی ردِ عمل سے دوچار ہوتا ہے۔ عورتوں میں اس کی مقدار اس بنا پر زیادہ پائی جاتی ہے کہ اسے صدیوں تک Main Stream سے دور رکھا گیا ہے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ ملنے پر باہری دُنیا سے اس کا رشتہ منقطع ہو چکا تھا گھر کی اندرونی چہار دیواری میں بھی اس کی محکومیت کی صدائیں گونجتی رہتی تھیں (کئی علاقوں میں آج بھی یہ دیکھنے کو ملتا ہے)، ایسے ماحول کی پروردہ عورت کس طرح سے بیرونی چیلنج تک دُنیا سے پرہیز نہ کرتی۔اس میں کسی حیاتیاتی نظام کا کوئی عمل دخل نہیں پایا جاتا اور نہ ہی نفسیاتی اعتبار سے عورت کی ذات سے جُڑی ہوئی کوئی ذہنی کمزوری اس ردِ عمل کی وجہ ہے۔ اگر اسے آج مرد کی طرح سارے مواقع سے فیض اٹھانے کا موقع ملے اور اس کی ذات سے منسلک ساری روایتی تفریقات ختم کردی جائیں تو اس اجتنابی ردِ عمل کی فقدان کی بھرپائی میں دیر نہیں لگے گی۔اس بنا پر عورت کو مردوں سے کمتر سمجھا جانا، اپنے میں کوئی منطقی دائرہ نہیں رکھتا۔

اس طرح کی تحقیقی وضاحت کے بعد حمیرہ ہاشمی کا درج ذیل سوال سوچ کی نئی سمتوں کو عیاں کرتا ہے کہ:

''اگر عورت اتنی ہی مضبوط ہے، اور کئی لحاظ سے مردوں سے بھی زیادہ مضبوط ہے، اور اگر مرد اور عورت دونوں کے نفسیاتی افعال میں کسی نمایاں تفاوت کو ثابت کرنے کے لیے کوئی تجرباتی شہادت بھی موجود نہیں ہے،۔۔۔تو پھر کیوں اور کس طرح سے عورتوں کو کمزور، کمتر جنس گردانا جاتا ہے؟''[22]

دونوں جنسوں کے تئیں برتے جانے والے امتیازی سلوک ان معاشرتی رویوں کی پیداوار ہیں جو عام طور پر دونوں جنسوں کی ذات کے ساتھ منسلک کردیے گیے ہیں۔ان امتیازات کے پیچھے نہ کوئی حیاتیاتی اور نہ ہی نفسیاتی منطق موجود ہے۔جس برتر اور کمتر نفسیات کا ذکر عموماً زبان زدعام ہے وہ اسی معاشرے کے ذریعہ پیدا کردہ ہیں نہ کہ خداداد۔معاشرہ دونوں کے تئیں مخصوص انداز سے سوچتا ہے۔انسان تو پیدا ہوتا ہے انسان بن کر مگر معاشرتی رویے کی کاریگری جس طرح اسے مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی بناتی ہے اسی طرح اسے مرد اور عورت کی حیثیت سے پہچان بخش دیتی ہے، نہیں جنس کے اعتبار سے زندگی جینے کے طور طریقے سکھائے جاتے ہیں کہ نہیں مرد کی طرح جینا ہے یا عورت کی طرح۔یہ جو طریقے سکھائے جاتے ہیں جس میں سیکھنے والے کی مرضی جاننے کا کوئی تصور ہی نہیں پایا جاتا، انہی طریقوں پر انسان مرتے دم تک چلتا رہتا ہے۔یہی طریقے مرد کو مردانہ اور عورت کو زنانہ اوصاف سے مزین کرتے ہیں۔بچپن سے ہی ایسی تربیت کا آغاز ہو جاتا ہے۔براہِ راست سبق پڑھانے والوں میں ہمارے والدین، بہن، بھائی گھر کے دیگر رشتہ دار پھر گھر سے باہر دوست آشنا، اساتذہ اہم رول ادا کرتے ہیں، پھر سوشل میڈیا، ٹیلیوژن، اخبار، ریڈیو کتابوں، رسالوں میں تحریر کیے جانے یا نشر

ہونے والے مواد کے ذریعہ انسان کی نفسیات کی تعمیر کی جاتی ہے۔ایسے انسان سیکھتا ہے کہ اسے مرد بنے رہنے اور عورت بنے رہنے کے لیے کس کس طرح کے اوصاف کا حامل ہونا چاہیے۔مرد مردانہ رویئوں سے ہمکنار ہوتا ہے،مثلاً بہادر، ہمت ور محنتی،فولادی طبیعت رکھنے والا،مضبوط ارادوں کا حامل،حکومت کا جذبہ رکھنے والا،اپنے گھر کی کفالت کرنے والا،اپنے بیوی بچوں،ماں باپ،بھائی بہنوں کا محافظ،خوداعتماد وغیرہ اور عورت میں زنانہ شعور بیدار کیے جاتے ہیں مثلاً جذباتی،حساس، محبت کرنے والی،قربانیاں دینے والی،دوسروں کی خدمت کا جذبہ رکھنے والی،حالات کے ساتھ مطابقت کرنے والی،جاں نثاری کے جذبے سے منور، دکھ جھیلنے والی محکومیت کی فطرت سے معمور سگھڑ کفایت شعار،شوہر کی فرمابردار محنتی،جفاکش وغیرہ۔سیمون دی بوا عورت کے متعلق کہتی ہے کہ وہ پیدا نہیں ہوتی بنادی جاتی ہے۔صرف عورت نہیں بلکہ انسان اپنی منفرد پہچان لے کر پیدا نہیں ہوتا بلکہ معاشرہ اسے اپنے رائج طریقوں کی بنیاد پر بنادیتا ہے۔

انسان دو طریقے سے سیکھتا ہے۔پہلے طریقے میں فرد کو جنسی امتیازات کی روشنی میں اس کے کردار کے طور طریقے باضابطہ سکھائے جاتے ہیں۔اور دوسرا طریقہ نقل کا ہوتا ہے کہ انسان کی ایک فطرت یہ ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ طرز کی نقل اُتارتا ہے،یا اپنے مشاہدے سے سیکھتا ہے،چاہے وہ بچہ ہو یا بڑا اپنے سامنے کسی کو کرتے ہوئے دیکھ کر اس کی طرح نقل کرنے لگتا ہے۔جیسے گھر میں چھوٹی بچیاں اپنی والدہ اور بڑی بہنوں کی طرح ساڑھی پہننا سینہ اور سر پہ دوپٹہ ڈالنا،اپنی والدہ جس طرح اپنے بچوں سے پیار کرتی ہیں اسی طرح اپنے گڈے گڑیوں کے ساتھ ممتا کا اظہار کرنا،اپنی امّی کی طرح کھیل کھیل میں کھانا پکانا،اپنے شوہر کی فرمابرداری کرنا،بچوں کو گود میں لے کر جھولے جھلانا وغیرہ افعال میں بغیر کسی کی نصیحت کے ملوث رہتی ہیں۔اسی طرح لڑکے بھی اپنے ابّا کی طرح حکم بنے رہنا کھانے کی فرمائش کرنا،ان کی طرح بیٹھنا،ان کے ہر طرز کی تقلید کرتے رہتے ہیں۔صرف یہیں بس نہیں ہوتا گھر سے باہر کی دُنیا بھی اس تقلیدی عمل میں ان کی معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کتابی کردار اور فلمی کرداروں کے طرز اعمال بھی لڑکے لڑکیوں میں تقلیدی عمل کو جلا بخشتے ہیں۔جب بچے گڈے گڑیوں کا کھیل کھیلتے ہیں تو ان کے ان کھیلوں کو دیکھ کر ہم صاف اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے اس مشرقی مرد حاوی معاشرے میں لڑکے اور لڑکیوں کی نفسیاتی تعمیر کن تقاضوں پر ہوئی ہے وہ چاہے کسی کے ذریعہ مشق کرنے سے ہو یا نقل اُتارنے سے یا کسی ایک تجربے کی بنا پر۔انسان کی ایک فطرت مشاہداتی بھی ہوتی ہے کئی افراد ایسے ہوتے ہیں جو اپنے طرز فعل یا طور طریق میں کسی کی دخل اندازی برداشت نہیں کرسکتے۔وہ اپنے تجربے یا مشاہدے کی بنا پر زندگی گزارنے کے طریقے پیدا کرتے ہیں۔ایسے افراد بھی معاشرتی غلبے سے بچ نہیں پاتے کیوں کہ تجربات اس معاشرے میں سانس لیتے والی زندگیوں سے اخذ کرتے ہیں۔مرد،مرد بنے رہنا ہی پسند کرتا ہے اور عورت اپنے آپ کو عورت بنائے رکھنے میں فخر محسوس کرتی ہے۔وہ چاہتی ہے کہ اس کی بیٹی بھی اس کی طرح بے زبان گائے بن کر سسرال میں اپنی طرح نام پیدا کرے،اس کی ڈولی میکے سے جائے اور سسرال سے اس کا جنازہ نکلے۔اس طرح وہ اسی طرز عمل کی پیروی کرے جس نے اس کی ماں کو روایتی معاشرے میں نیک نامی حاصل کرنے میں مدد کی ہے۔

ہمارے قدمانے اپنی کتابوں،رسالوں،فلموں وغیرہ میں بھی مرد اور عورت کی اسی روایتی طرز کی عکاسی کی ہے۔عورت وہ ہے جو مردوں کی محبوبہ بن پائے،ان کے ذریعہ سراہی جائے،اس کے ایک ایک کی تعریف میں مرد زمین وآسمان کے قلابے ملادیں۔عورت نے اپنے آپ کو سجانے سنوارنے میں اپنی اصلی خوبصورتی کو طاق پر رکھ دیا کہ شاید اس سے مردوں کی محبوبہ اور زیادہ دیدہ زیب لگے،اور تعریف کے کلمات میں اضافے ہوتے رہیں۔عورت ایسی ہونی چاہیے جو گھر کو جنت نما بنادے،اور مردوں کو سکون واطمینان کی زندگی عطا کرے۔عورتیں لگ گئیں اپنے آپ کو جنت کی معمار بننے اور مردوں کو سکون و عافیت کی زندگی بخشنے میں،چاہے اس کے لیے انہیں اپنے وجودی ضروریات کو فراموش کیوں نہ کرنا پڑے،اپنی خواہشات سے

منہ کیوں نہ موڑنا پڑے، اپنی صحت وتندرستی کو نظر انداز کیوں نہ کرنا پڑے۔ عورت یک ماں ہوتی ہے جو صرف انسان ہی تخلیق نہیں کرتی بلکہ انسانیت کی بھی معمار ہوتی ہے، اب عورتیں لگ گئیں لاتعداد بچے پید کرنے اور ان کی دیکھ بھال وتربیت میں اپنی زندگی فنا کرنے میں۔ عورتوں کی پہچان اوروں کی خدمت واطاعت کرنے، اور زندگی کے ہر موڑ پہ ہزاروں قربانیاں دینے میں مضمر ہے۔ بس عورتوں نے حسن سوا کرلیا کہ چاہے جان ہی کیوں نہ گنوانی پڑے شوہر کی اطاعت وفرمابرداری میں کوئی کسر باقی نہیں رہنے دیں گی، چاہے شوہر ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیوں نہ کرتے ہوں، ان کا کام ہے کہ اس کی فرمابردار واطاعت شعار بنی رہیں۔ عورت کی ذات تشدد کرنے والی نہیں ہوتی اور نہ ہی اپنے ساتھ ہو رہے ناروا سلوک کے خلاف آواز اٹھانا اس کا وطیرہ ہونا ہے کیوں کہ وہ انفرادی حقوق نہیں رکھتی بلکہ اس کے حقوق اجتماعی ہوتے ہیں جن میں اس کے ساتھ جُڑے ہوئے رشتوں کا فائدہ ہونا ہے۔ یہ زہر عورت کے خون میں سرایت کر گیا کہ وہ اپنا کوئی ذاتی حق نہیں رکھتی، اس کا فرض تو دوسروں کی زندگی کو آسان بنانا ہے چاہے وہ کتنی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ چونکہ اس کے کوئی حقوق نہیں ہیں اس لیے اپنا حق جو اس کے لیے معدوم ہے اس کے لیے لڑنے کا تصور اس کے اندر کیوں کر پیدا ہو سکتا تھا۔ وہ تو معاشرے کے بنے بنائے راستے پر خوش خوش چل رہی ہے، اپنے لیے راہیں چُننے کا شعور اس میں کیسے پیدا ہو سکتا ہے جس کی چاہ میں وہ معاشرے کے روایتی رویوں کے برخلاف بغاوت چھیڑ دے۔ ایسے اور بھی بہت سارے روایتی رُجحانات نے ہماری مشرقی عورتوں کو شعوری طور پر مفلوج بنا دیا ہے، جس سے پرے وہ سوچنے پر قاصر ہیں۔ آج بھی ایسی سوچ رکھنے والی خواتین اپنی بیٹیوں کو یہی سمجھاتی نظر آتی ہیں کہ اسے جو ملے اللہ کا شکر ادا کر کے کھا لینا چاہیے کیوں کہ اسے دوسرے کے گھر جانا ہے۔ اسے اپنے بھائی کے کھانے پر آنکھ نہیں دینی چاہیے کہ وہ مرد ہے اور مرد باہر جاتے ہیں محنت ومشقت کرتے ہیں پیسے لاتے ہیں ان کا پیٹ بھرتے ہیں تو نہیں ان کی جی حضوری کرنی چاہیے اور اپنا پیٹ کاٹ کر ان کی بھوک مٹانی چاہیے۔ شوہر چاہے جس طرح کا سلوک کیوں نہ کرے نہیں ہمیشہ شوہر کی خوشی کا خیال رکھنا چاہیے۔ آج بھی ہمارے معاشرے میں ایسی عورتیں موجود ہیں جو بیٹی پیدا ہونے پر ماں کو ہی ذمہ دار ٹھہراتی ہیں۔ اپنا لڑکا چاہے طوائف کے کوٹھے کی خاک چھانتا پھرے اس کی عزت میں حرف تک نہیں آ سکتا کیوں کہ وہ لڑکا ہے اس کے کرتوت ڈھل جاتے ہیں مگر عورت اپنے گھر کی کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھ لے تو وہ اپنے عاشق کو اشارہ کر رہی ہوتی ہے، زندگی بھر کے لیے بدنامی کی ڈگری اس کے سر پر لاد دی جاتی ہے اور طعنے کسے جاتے ہیں۔

اسی طرح مردوں کے کردار بھی ایسے پیش کیے گئے کہ وہ اپنے گھر اور اپنے ماتحتوں کے حاکم ہیں، نہیں یک حاکم کی طرح اپنی زندگی کو رعب دار بنانا چاہیے، گر وہ نرمی سے پیش آئیں تو ان کی ہنسی اُڑائی جاتی ہے کہ کیا عورت کی طرح بات کرتے ہو، ارے کیوں عورت کی طرح منہ لٹکائے بیٹھے ہو، اپنی بیوی کی حمایت میں لب کشائی کریں تو فوراً نہیں کہا جاتا ہے کہ کیا جورو کے غلام بنے ہوئے ہو، ارے کیوں عورت سے مشورہ طلب کرتے ہو اوہ تو ناقص العقل ہے وہ کیا فیصلہ کرے گی۔ بچہ گر اپنی بہنوں کی تقلید میں ماتھے پہ بندی لگا لیتا ہے تو اسے فوراً ٹوک دیا جاتا ہے کہ تم لڑکی نہیں ہو یہ سب لڑکیوں کو زیب دیتا ہے تمہیں نہیں تم تو بہادر ہو تمہیں بندوق سے کھیلنا چاہیے گڑیوں سے نہیں۔ لڑکا روتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ کیوں لڑکیوں کی طرح روتے ہو تم مرد ہو مرد رویا نہیں کرتے۔ اس طرح سے لڑکوں میں لڑکی کے برعکس جذبات پروان چڑھتے رہتے ہیں کہ وہ طاقت ور ہے، اس کی پیدائش صرف کمزوروں پر حکومت کرنے کے لیے ہوئی ہے، اسے رونا نہیں چاہیے کہ رونا کمزوری کی علامت ہوتی ہے کہ لڑکیاں نازک کمزور ہوتی ہیں۔ بچپن سے ہی نہیں اپنی بہنوں سے خدمت لینا سکھایا جاتا ہے۔

بچپن میں پروان چڑھنے والے ان اوصاف کو جوانی میں اور کھل کھیلنے کا موقع ملتا ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں جہاں بالغ ہو

جاتے ہیں پھر سے زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ اس درجے میں پہنچ کر جہاں لڑکے کو معاشرہ آزادی اختیار کرنے کی تربیت دیتا ہے وہیں لڑکیوں کی زندگی قید بن جاتی ہے کہ اس کے اٹھائے گئے ہر ہر قدم پر اسے ٹوکا جاتا ہے کہ تم لڑکی ہو اور یہ نہیں کر سکتی۔ مگر لڑکا باہر گھومتا ہے اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلتا ہے مار کٹائی کرتا ہے، پیڑوں پر چڑھتا ہے ندیوں میں تیرتا ہے، لڑائی جھگڑے فساد میں ملوث رہتا ہے، چوٹ کھاتا ہے، ورزش کرتا ہے اس طرح سے اسے بچپن سے ہی جسمانی اور ذہنی طور پر مضبوط بننے کے لیے ساز گار ماحول مل جاتا ہے مگر لڑکیاں اس طرح سے ورزش نہیں کر سکتیں، نہ ہی ایسے کھیل کھیل سکتی ہیں جس میں ان کے بھی پٹھے لڑکوں کی طرح مضبوط ہوں، نہ نہیں پیڑوں پر چڑھنے کی اجازت ہے اور نہ ہی وہ لڑکوں کی طرح اپنی سہیلیوں سے مار پیٹ کرنے کے گر سیکھتی ہیں جو ان کے اندر خود اعتمادی کو بڑھاوا دے۔ یہی وجہ ہے کہ لڑکیاں لڑکوں کے معاملے میں جسمانی اور ذہنی طور پر پچھڑ جاتی ہیں۔ یہاں یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ بچپن سے جس کو جیسا ماحول ملا اس کی نشو ونما اس طرح سے ہوئی۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ لڑکیاں پیدا ہی کمزور ہوتی ہیں۔ گر ہم شریف گھرانوں کی عورتوں کے مقابل مزدور عورتوں کا ٹکرائیں تو دونوں کی جسمانی مضبوطی میں بے انتہا فرق نمایاں نظر آئے گا۔ مزدور عورتیں مردوں کی طرح جیسے کام کرتی ہیں اور بوجھ ڈھوتی ہیں وہ شرفا عورتوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ چونکہ مزدور عورتوں کی پرورش و پرداخت ایسے ماحول میں ہوئی ہے کہ نہیں خود کفیل بنے رہنے کے لیے مضبوط پٹھوں کی ضرورت ہے۔ آج کے زمانے میں ایسی لڑکیاں بھی موجود ہیں جنہوں نے مسلسل ورزش سے اپنے جسم کو مردوں کی طرح قوی ہیکل بنا لیا ہے، جن کی طاقت کے سامنے عام مرد چوہوں کی طرح کانپنے لگتے ہیں۔

انسانی زندگیاں اتنے اشارے دینے پر بھی مردحاوی معاشرے کو تو اپنی ہی کرنی ہے، چیزوں کی حقائق کو توڑ مروڑ کر اپنے مفاد کے لائق بنانے میں اس کی مثال کوئی نہیں رکھتا۔ مذہب، جس نے جنس کے اعتبار سے مرد اور عورت میں کوئی بھی تفریق نہیں کی مگر یہاں بھی مذہبی قوانین کو تصرف میں لا کر اپنی طرح کی شکل دے دی گئی ہے کہ جہاں کسی نے معاشرتی رویوں کو اپنانے میں آنا کانی کی وہاں تصرفی مذہبی ہتھیار کا سہارا لے کر ان کے جذبات کو چوٹ پہنچائی جائے۔ چونکہ انسان مذہب کے معاملے میں نہایت جذباتی ہوتا ہے تو وہ پھر بلا چوں و چرا اپنی شکست قبول کر کے اسی روایتی ڈگر کا انتخاب کرے گا جو معاشرے کی قائم کردہ ہے۔ یہاں تک کے سائنسی شہادت کی بھی اپنی چرب زبانی سے غلط تعبیر پیش کی جاتی ہے کہ اپنی حکومت برقرار رہے۔ مگر اس حقیقت سے منہ نہیں موڑا جا سکتا کہ عصرِ حاضر میں اتنی بندشوں کے باوجود عورتیں اپنی نسائیت کو برقرار رکھے ہوئے اپنی وجودی شناخت حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہیں، اور ماحول کو اپنے حق کے حصول کے لیے ساز گار بنایا ہے۔ مگر ان میں سے چند عورتیں کٹر پسندی اختیار کرتے ہوئے اپنے آپ کو مرد بنانے کی ہوڑ میں اپنی نسائیت کو کھو دینے کی کگار پر ہیں۔ نسائیت احساسِ کمتری قبول کر لینے کا نام نہیں ہے اور نہ ہی احساسِ برتری کے نشے میں دھُت ہو کر اسے چولہے میں جھونک دینے کا نام ہے، بلکہ عورت بنے رہنے میں ہی نسائیت کی بقا مضمر ہے۔ عورت کو اپنے وجود سے یہ نہیں رکھنا چاہیے، بلکہ اپنے وجود میں رہ کر ہی نسائیت کو اس کے بلند درجے تک پہنچانا اور سارے جائز حقوق کے حصول کی جدو جہد میں لگے رہنا اس کے وجود کی انفرادی شناخت کا ضامن بن سکتا ہے۔

☆☆☆

معاشرت

سماج جو یک معاشرتی اور اجتماعی زندگی کا مفہوم فراہم کرنا ہے، انسانی افراد پر مشتمل یک ایسی جماعت ہے جو زندگی جینے کے مختلف رسوم و رواج، طور طریقے اور قاعدے و قوانین کے روبرو تسلیمات بجالاتے ہوئے، یک دوسرے کی ضرورت کے تحت یک دوسرے سے منسلک رہتے ہوئے، بدلتے وقت کے تقاضوں کے ساتھ خود میں تغیر و تبدل کا مادّہ لیے ہوئے، ماضی کے کئی تاریک اور روشن یادگاروں کے کھٹے میٹھے لمس، حال کے جیتے جاگتے مشاہدات اور تجربوں کے ہمراہ مستقبل کی اور راہی سفر ہے۔ آیئے چند یک لغت کے ذریعے معاشرے کو اور واضح طریقے سے سمجھتے ہیں:

American Dictioanary: Society- Noun (People), People considered as a group, or a group of people who live together in a particular social system.

Society- Noun (Organization), An oganization for people who have specially interests or who want to support particular activities.

According to Business English: People in general living together in an organized way, making decisions about how to do things, and sharing the work that needs to be done.

According Marriam Webster: Noun (a), An enduring and cooperating social group whose members have developed organized patterns or relationship through interaction with one another.

(b) A community, nation, or broad grouping of people having comm on traditions, institutions and collective activities and interests.

فیروز اللغات: جماعتی زندگی جس میں ہر فرد کو رہنے سہنے اپنی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے دوسروں سے واسطہ پڑتا ہے۔

یہی معاشرہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ چند یک غالب عنصر کے قبضے میں رہ کر کسی یک صنفی وجود کو ترجیح دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی ترجیحات کبھی کبھی مخالف صنف کے وجود کو نکارتے ہوئے اس کی حیثیت و اہمیت کو فراموش کر جاتے ہیں۔ صدیوں سے چلا آ رہا مرد غالب معاشرہ اس کی بہترین مثال ہے۔ گر ہم انسانی تاریخ اور اس کے ارتقاء پر غور کریں گے تو اس حقیقت سے روشناس ہوں گے کہ اس ترقی یافتہ انسانی سماج کے بین السطور میں مرد اور عورت دونوں کے وجود کی بقا انسانی وجود کی بقا کے لیے اشد ضروری ہے۔ کیوں کہ دونوں کا وجود بقائے بنی نوع انسان کے لیے ناگزیر ہے۔ یک کے بغیر دوسرے کی تکمیل ناممکن ہے۔ دونوں میں سے ہم کسی یک کی اہمیت کے معترف دوسرے کی اہمیت کے منکر نہیں ہو سکتے۔ مگر جب ہم انسانی تاریخ پر پڑے دبیز پردے کو ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں تو اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ عورت کے تئیں ناانصافی صدیوں سے ہوتی رہی ہے اور مرد نے ہمیشہ اس کو اس کے بنیادی حقوق سے نابلد رکھا ہے اور زیادہ تر اس کا استعمال اپنے مفاد کی خاطر کیا ہے۔

پدرسری نظامِ میں ہر طبقے، علاقے اور مذہب میں مردوں کے مقابلے عورتوں کی حیثیت ہمیشہ حاشیائی رہی ہے۔ بظاہر خانگی معاملات میں ہمیشہ مرد نے اس کی اہمیت کو قبولا ہے لیکن دیگر معاملات چاہے وہ معاشی ہوں کہ سیاسی، سماجی ہوں یا تہذیبی، عورتیں ہمیشہ دوسرے درجے پر رہی ہیں۔ سیمون دی بوا کا نظریہ یہ ہے کہ دورِ قدیم کے مردوں کو وحشی جانوروں سے

اپنے گروہ کو بچانے کے لیے کافی جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔مختلف خطرات کا سامنا کرنا پڑتا تھا،اس کام میں عورت کا کوئی دخل نہیں تھا۔اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کے اسی عمل نے مرد کو حیوانی سطح سے بلند کردیا۔پیدا کرنے والی جنس یعنی عورت ایک جانور کی مانند اپنے جسم ہی میں بند رہی۔انسانی زندگی کو لاحق مختلف خطرات سے تحفظ کے باعث مرد نے عورت پر اختیار حاصل کرلیا۔لیکن ایسا لگتا ہے کہ زمانہ قدیم میں جب تہذیب یافتہ سماج کا کوئی تصور ہی نہیں تھا انسان جنگلی جانوروں سے بچنے کے لیے جُھنڈ بنا کر رہنا پسند کرتے تھے تب چند فطری تقاضوں نے اُسے مجبور کیا ہوگا کہ کام کی تقسیم اسی نہج پر کی جائے۔عورت چونکہ ہر مہینے سات سے دس دن حیض میں مبتلا رہتی ہے جو اُسے جسمانی اور ذہنی طور پر دیگر ایام کی بہ نسبت تھوڑا کمزور کردیتا ہے، اس کے علاوہ ہر دوسرے تیسرے سال نو مہینے تک شدید تکلیف برداشت کرکے بچہ پیدا کرنے کے جان لیوا درد سے گزرنا اس کو کہیں نہ کہیں اتنے دنوں تک روز کے معمولات سے الگ ضرور کردیتا ہے۔ایسے حالات میں گروہ گروہ یا جُھنڈ کی حفاظت کا ذمّہ لیتی تو شاید سب لقمۂ اجل بن جاتے۔انہی فطری تقاضوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے دونوں جنسوں میں کام کی تقسیم ہوئی ہوگی نہ کہ احساسِ کمتری یا برتری کا عمل دخل رہا ہوگا۔جُھنڈ کے محافظ کو اپنی بہادری اور چالاکی کی بنا پر مخالف صنف کا حاکم بننے میں عرصہ لگا ہوگا۔

اگر ہم زمانہ قدیم کے عمرانی اور تہذیبی حوالوں پر نظر ڈالیں تو عورت کے مرتبے کے بارے میں چند بنیادی باتوں کا پتہ چلتا ہے۔آج سے تقریباً چار ہزار سال قبل مسیح جب میسوپوٹامیا(جدید عراق)میں آباد قوم اپنے جسمانی اعضا اور تصاویر کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنائے ہوئے تھی،ایک ترقی یافتہ قوم نے اسے مغلوب کرکے سومیری قوم کی بنیاد ڈالی،جہاں سے انسانی تہذیب کو فروغ حاصل ہوا۔اس قوم نے رسم الخط ایجاد کیا اور اس دور کے حالات و واقعات اور رسم و رواج کی تفاصیل کو مٹی کی تختیوں پر تحریر کرکے جہاں تاریخ رقم کرنے کی ابتدا کی وہیں یہ تختیاں اس قدیم قوم کی تہذیب اور سماجی نظام کو دورِ جدید میں متعارف کروانے کا سبب بھی بنیں،جس کی بدولت دنیا کو ایک بڑے سماجی نظام یعنی مادری نظام سے واقف ہونے کا موقع ملا،جہاں عورت ایک مکمل اور اعلیٰ حیثیت پر کھڑی نظر آتی ہے۔مذکورہ دور کی عورت کے اقدار کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لیے ہمیں اس دور پر بھی سرسری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے جب انسانی زندگی پتھر کے دور سے آگے نہ بڑھی تھی۔روایتی خاندان کا وجود ہی نہیں تھا۔مختلف وحشی جانوروں کے حملے سے محفوظ رہنے کے لیے گروہ کی شکل میں رہنا ہی ایک واحد طریقہ تھا۔نہ کوئی کمتر تھا نہ برتر۔ہر شخص اپنے حصّے کا کام کرتا تھا۔عورتیں بھی مردوں کے ساتھ مل کر جڑی بوٹیوں کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہتی تھیں۔پھر جب انسان نے شکار کو اپنی خوراک میں شامل کیا تو جسمانی طور پر مضبوط ہونے کی وجہ سے مرد شکار کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔اور گھر سنبھالنے کے ساتھ ساتھ بچے اور بوڑھے بزرگوں کی دیکھ بھال کی ذمّے داری عورت کے حصے میں آئی۔ضروریاتِ خانہ داری فراہم کرنے میں عورت نے اپنے آپ کو وقف کردیا۔

زمانہ قدیم کی عورت نے ہر اس میدان میں اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں جو امورِ خانہ داری سے منسلک تھیں۔جمادات سے کام لے کر چاقو،برتن،پکیاں وغیرہ تیار کرنا،پارچہ بافی کے مختلف اصول و ذرائع کی دریافت،اون اور دودھ کے لیے جانوروں کو پالنا،شکار کے گوشت کو کھانے لائق بنانا،کھال کو صاف کرکے مختلف چیزیں تیار کرنا،مختلف کاموں میں آگ اور پانی کا استعمال کرنا،اس کے ساتھ ساتھ نمک اور پہیے کی ایجاد کا فخر بھی عورت کو حاصل ہے۔نمک سازی،نقّاشی،بنائی،یہ تمام فنون اس قدر تکمیل کے ساتھ پائے جاتے ہیں کہ عورت کے صناعتِ حسن اور شعورِ ریاضی کی داد دینی پڑتی ہے۔زبان کی ایجاد اور اشاعت کے میدان میں اس نے قابلِ تحسین کام انجام دیے۔معاشرتی نظام کے قیام میں بھی اہم رول ادا کرتی ہے۔مذہبی میدان میں اس کے کارنامے اس لحاظ سے وقیع ہیں کہ اس نے مذہب کی بنیاد ڈالنے میں بڑا حصہ لیا۔شکار کی عدم دستیابی کے امکان نے مرد کی غیر موجودگی میں عورت کو خوراک حاصل کرنے کے پرانے طریقے سے جوڑے رکھا۔یہ

بہوٹیوں کی تلاش میں ادھر ادھر گھوم کر ان کے جڑ، بیج اور پھل جمع کرنا، ان کے خرمن بنانا، چھال او گھاس جمع کر کے مل دینا، نگلنا، ان سے ٹوکریاں، جال او کپڑے تیار کرنا، نہیں بیر بہوٹیوں سے دوائیں تیار کرنا۔ اسی تلاش کے ذریعے اس پر بیج سے پودے نکلنے کے عمل کا انکشاف ہوا۔ اس لیے زراعت کے فن کی دریافت بھی عورت سے منسوب کی جاتی ہے۔ اسی دریافت کے سبب مرد نے ایک بار پھر نباتات کی دنیا میں قدم رکھا۔ عورت کے ساتھ مل کر کھیتی باڑی کرنے لگا۔

اُس وقت عورت کے متعلق دو حقائق مرد کے سامنے موجود تھے۔ ایک بچے کو جنم دینے کا عمل اور دوسرا زراعت کی ایجاد۔ جب زمین کی کوکھ سے فصل اور عورت کی کوکھ سے انسانی نسل کی پیدائش کے مشترک پہلو سامنے آئے تو مادرِ کائنات کا تصور انسانی دماغ میں گھر کر گیا کہ اسی مادرِ کائنات سے تمام کائنات کا ظہور ہوا ہے۔ عورت سے منسلک زرخیزی کے تصور نے اسے دیوی کا درجہ دے دیا۔

اب انسان مادری نظام کی دنیا میں قدم رکھ چکا تھا جہاں عورت نے گھر اور باہر دونوں جگہوں کے کام بخوبی انجام دے کر اپنی اہمیت کو تاریخ میں ثبت کر دیا۔ یہ وہ دور تھا جہاں خاندان کا حسب ونسب عورت ہی سے چلتا تھا۔ وہ خاندان کی سربراہ ہوتی تھی۔ حاصل شدہ خوراک سے لے کر دوسرے تمام اشیاء اس کی ہی ملکیت تسلیم کیے جاتے تھے۔ اس مادری نظام کا سماجی ڈھانچہ عورت ہی کے بل بوتے پر قائم تھا۔ مگر جب انسانی زندگی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے تو مختلف انقلابات رونما ہوتے ہیں۔ زراعت کے میدان میں ہل کی ایجاد نے کھیتی میں عورت کی شرکت کو غیر ضروری قرار دے دیا۔ اور یہیں سے ایسی انقلابی تبدیلی رونما ہوئی جس نے پدری نظام کے لیے راہیں ہموار کر دیں۔ آہستہ آہستہ مرد نے زراعت کو اپنی ملکیت بنا لیا۔ پھر اپنی قوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مویشیوں اور زمینی پیداوار پر بھی قابض ہو گیا۔ جب وہ زمین کا مالک بنا تو اس نے عورت پر بھی اپنی ملکیت ثبت کر دی کیونکہ اب اسے مادری نظام اور اس کی سربراہ سے آزادی مل گئی تھی۔ صرف بچے پیدا کرنے کے لیے اس نے عورت چاہی جنہیں وہ مکمل طور پر اپنے کھیتوں کو بہتر بنانے کے لیے استعمال میں لائے اور ان وارثوں کے ذریعے اپنی زمینی زندگی کو مستحکم بنائے۔

اب سلسلۂ نسب مادری نہیں پدری ہو گیا۔ ماں کی حیثیت کمتر ہو کر صرف ایک دائی اور خادمہ جتنی رہ گئی۔ حاکمیت اور حقوق باپ کے ہو گئے۔ معاشرے میں اس کا عہدہ پیدا کرنے والی سے پالنے والی میں منتقل ہو گیا۔ اب چونکہ مرد کی حکومت کا دور تھا، اس نے سماجی نظام کو اپنے طریقے سے ڈھالنا شروع کر دیا۔ مذہبی پیشواؤں اور دانشوروں نے مختلف قاعدے و قوانین کی بنیاد ڈالی۔ ان کے پیشِ نظر عورت کی نسوانیت تھی اس کی انسانیت کو نظر انداز کر دیا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عورت کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ مختلف مذاہب میں اسے شیطان کی انتہائی خوفناک تحریص بنا دیا گیا۔ لاطینی مذہب میں اسے شیطان کی محل کہا گیا۔ اور یہ رائے دی گئی کہ جس پر شیطان براہِ راست حملہ کرنے کی ہمت نہیں کرتا عورت اسے بھی تباہ کر دیتی ہے۔ عیسائی مذہب کے پیشوا نے آدم کو گناہ میں ملوث کرنے کی ذمّہ دار حوّا کو ہی ٹھہرایا۔ فرانس میں عورت کے بارے میں یہ تصوّر تھا کہ یہ آدھا انسان ہے اور معاشرے کی تمام خرابیوں کی بنیاد ہے۔ چین میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس میں شیطانی روح ہوتی ہے، اس لیے یہ انسان کو برائی کی طرف لے جاتی ہے۔ جاپان میں اسے ناپاک سمجھا جاتا تھا، اس لیے مختلف عبادت گاہوں سے اسے دور رکھا جاتا تھا۔ ہندوستان میں جس عورت کا شوہر مر جاتا اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں تھا، اسے اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ جل کر ستی ہونا پڑتا تھا۔ عرب میں دورِ جہالت میں بیٹی کا پیدا ہونا عار سمجھا جاتا تھا، ماں باپ خود اپنے ہاتھوں سے بیٹی کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ اس کے بارے میں یہاں تک رائے قائم کی گئی کہ تمام وحشی درندوں میں سے کوئی بھی عورت جتنا نقصان دہ نہیں۔ وہ جہنم کا دروازہ ہے اور سبھی برائیوں کی ماں ہے۔ جس طرح شیر کو پنجے اور دانت، ہاتھی کو سونڈ، بیل کو سینگ سے نوازا گیا ہے اسی طرح اسے اپنی حفاظت کے لیے مکروفریب سے مسلح کیا گیا ہے۔ اس طرح سے مرد